ترتیب

1- عبارت مختصر	8
2- علی شریعتی کون	17
3- علی شریعتی فکر و خیال کے آئینے میں	53
4- علی شریعتی و علامہ اقبال (موزانہ)	150
5- ترجمہ ماہ و اقبال	
i- دفتر اول	207
ii- دفتر دوم	253

انتساب

فانان پالو فریری اور سارتر کے نام

اور

بانئ انقلاب ایران امام خمینی کے نام
جسکی روشن فکر نے کتنے قلوب کو منور کر
دیا

علی شریعتی ایک نظر میں

1933ء (23 نومبر)	پیدائش مزینان (ایران)
1940ء	سکول اور گھر میں تعلیم
1950ء- 1956ء	تحریک خدا پرست سوشلسٹ میں شمولیت
	مرکز اشاعت السلام میں شمولیت
	مشہد میں اسلامک سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کا قیام
	طالب علم پرائمری ٹیچرز ٹریننگ کالج
	پیشہ مدرسی
	سیاسی سرگرمیوں کا آغاز' ایرانی تیل
	انڈسٹری کو قومیانے کو تحریک میں
	عملی حصہ اور پہلی مرتبہ جیل جانا
	اشاعت مکتب وسطہ نامی کتاب
	خدا پرست سوشلسٹ۔ ابوذر غفاریؓ
	نامی کتاب کا ترجمہ
	مشہد یونیورسٹی میں تعلیم کا آغاز
1957ء	پوران شریعتی سے محبت اور شادی
1958ء	بی اے میں کامیابی (مضامین عربی اور فرانسیسی)
1958ء	عربی سکالر ڈاکٹر مندر کی کتاب
	در نقد ادب کا فارسی ترجمہ
1958ء	فرانس میں تعلیمی سکالر شپ کی منظوری
1959ء	پیرس کی سوبورن یونیورسٹی میں تعلیم کا آغاز

1960ء	الیکس کیرل کی کتاب لا پرپری کا ترجمہ نیایش کے نام سے
1961ء	بہ کجا تکیہ کنم نامی کتاب کی تصنیف
1961ء	مصطفیٰ کامران' ابراہیم یزدی کے تعاون سے تحریک آزادی ایران نامی تنظیم کا قیام (نزمت آزادی ایران خارج ازکشور)
1962ء	سیکنڈ نیشنل فرنٹ کی تشکیل
1962ء	الجیرین تحریک آزادی میں عملی حصہ اور کانگو کے طلباء کو اکسانے پر فرانس میں جیل کی سزا
1962ء	شی گویرا کی کتاب "گوریلا حکمت عملی" سارتر کی کتاب شاعری کیا ہے) اور فانان کی کتاب "افتادگان خاک" کا ترجمہ کیا
1963ء	پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ بعنوان "فضائل بلخ" فرانسیسی ترجمے کی صورت میں پیش کیا (Les Merites de Balakh)
1964ء	ایران کو واپسی۔ باڈر پر ہی گرفتاری اور چھ ماہ قید
1965ء	لوئی ماسیونن کی کتاب "سلمان پاک" کا ترجمہ کیا ہائی سکول میں ملازمت کالج آف اگری کلچر میں ملازمت راہنمائے خراسان کی تصنیف
1966ء	تہران جاکر حسینیہ ارشاد کے قیام میں مدد
1966ء- 1968ء	حسینیہ ارشاد میں لیکچروں کا سلسلہ

1970ء	پہلا حج
1970ء	دوسرا حج
1972ء	سیاسی انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں حسینیہ ارشاد کی بندش اور علی شریعتی کی گرفتاری
1972ء	18 ماہ تک جیل میں بندش اور تشدد
1975ء- 1977ء	حکم زبان بندی گھر میں نظر بندی۔ چھپ چھپ کر لیکچر دینا
1977ء (May)	جلا وطنی۔ لندن میں قیام
1977ء	(19 جون) پر اسرار حالات میں اپنے اپارٹمنٹ کے اندر ساواک کے کارندوں کے ہاتھوں شہادت
1977ء	دمشق میں بی بی زینبؑ کے مزار کے قریب سپرد خاک ہونا
1979ء	کلیات کی اشاعت

عبارت مختصر

علی شریعتی کو جس وقت شہید کیا جا رہا تھا اس وقت میں ایک آرام دہ گھر میں اپنے بال بچوں میں بیٹھا زندگی کے خوشحال دن گزار رہا تھا۔ مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ علی شریعتی کون ہے۔ اور یہ کوئی اتنی پرانی بات بھی نہیں یہ 1977ء کا زمانہ تھا۔ میں اس وقت پاڑہ چنار کالج میں ہوتا تھا۔ وہاں بھی کسی سے بھی علی شریعتی کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ایک دن ایک اخباری مضمون نظروں سے گزرا۔ اسمیں ایک دانشور کا قول نقل تھا۔ "قرآن مردوں کو سنانے کی جگہ زندوں کو سنانے کے لئے قبرستان سے اٹھا کر شہروں، گھروں اور دفتروں بازاروں میں لے جاؤ۔" اس جملے نے مجھے چونکا دیا۔ اس شخص کی کھوج شروع کردی۔

پتہ چلا کہ اسے ایرانی شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کرنے کی پاداش میں لندن کے ایک سنسان اپارٹمنٹ میں شہید کر دیا گیا ہے۔ شہادت کے وقت عمر 44 سال تھی۔ پیشے کے لحاظ پر پروفیسر تھا۔ فرانس کی سوبورن یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ علی تقی شریعتی نامی عالم دین کا بیٹا تھا۔ علم کو عمل سمجھتا تھا اور عمل کا پیوند جرات اور جیداری سے جوڑ دیا تھا۔ 1933ء میں ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ مشرقی تعلیم گھر سے ملی۔ مغربی تعلیم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ عربی اور فرانسیسی زبان پر عبور حاصل کیا۔ اسکو راہ راست پر لانے کے لئے فرانس بھیجا گیا۔ مگر وہ مغربی سامراج کا غلام و گرویدہ ہونے کی جگہ سچے اسلام کا زبردست پرچارک بن کر لوٹا۔ سارے مغربی علم کو اس نے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا اور اسلام کو دنیا کا سب سے بڑا انقلاب قرار دے کر اپنی زندگی اسکے لئے وقف کر دی۔ اس نے تاریخ اسلام کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام کو سوشلزم، کمیونزم، کیپٹلزم، نو آبادیاتی نظام، سائنس و ٹیکنالوجی، شہنشاہیت و آمریت سے بڑھ کر خطرہ اس جھوٹے اسلام سے ہے جسے سچے اسلام کی جگہ لا کر بٹھلا دیا گیا ہے۔ اسکی نگاہ میں مشرقی معاشروں میں جہالت، غربت، آمریت، تعصب، تنگ نظری سب شاخسانے ہیں اسی سوڈو اسلام کی کامیابی کے جسے ان خطوں پر مسلط شاہوں نے پیشواؤں کے ساتھ مل کر

نافذ کر رکھا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا جہاد ان لات و منات کے خلاف ہونا چاہیے جو خدا کے نام پر مسلم کعبے میں لاکر رکھ دے گئے ہیں۔

میں جوں جوں علی شریعتی کے خیالات سے آگہی حاصل کرتا جاتا میرا اشتیاق بڑھتا جاتا۔ چنانچہ ایران جانے والے ہر واقف کار سے یہی مطالبہ کرتا کہ علی شریعتی کی کتابیں لے کر آئے۔ اس طرح علی شریعتی کی بہت سی تصانیف اور اسکے ترجمے مجھے پڑھنے کو ملتے گئے۔ اردو میں ان پر معلومات تو بہت کم تھیں۔ تاہم انگریزی ترجموں نے کافی مدد کی۔ جدید فارسی زبان کو سمجھنے میں دشواری تھی۔ اس سلسلے میں اپنے دوست اور فارسی زبان کے سکالر پروفیسر محمد اقبال سے کافی مدد لی۔ دوران مطالعہ پتہ چلا کہ علی شریعتی نے علامہ اقبال پر ایک کتاب ماؤ اقبال کے نام سے تصنیف کی ہے۔ اس وقت یہ کتاب صرف فارسی زبان میں تھی۔ اسکے ایک حصے کا ترجمہ ڈاکٹر ریاض نے کیا تھا۔ مگر مجھے اسکا علم نہ تھا۔ میں نے پروفیسر اقبال سے استدعا کی کہ وہ ماؤ اقبال کا اردو ترجمہ کر دیں۔ شب و روز ان کو کچوکے دے دے کر ترجمہ کروایا مگر جب ترجمہ دیکھا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

پروفیسر اقبال زبردست خطیب و ادیب آدمی ہیں۔ مگر ترجمہ انہوں نے لفظ بہ لفظ کیا تھا۔ علی شریعتی کی اکثر تصانیف تحریری کی جگہ تقریری ہیں۔ یعنی انہوں نے اپنی پرخطر زندگی میں جگہ جگہ جو لیکچر دیئے تھے ان کو بعد میں ان کے شاگردوں یا سننے والوں نے کتابی صورت میں چھپوا دیا تھا۔ عام طور پر ان کے لیکچر کافی مربوط ہوتے تھے مگر پھر بھی لیکچر میں خطابت کے ساتھ تکرار اور حشو زاوید کی بھی کثرت ہوتی ہے ایسی حالت میں کتابی روپ اور پھر اس کا ترجمہ ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔ علی شریعتی کے خطیبانہ جملے ملٹن کی نثری تصنیف "اردو پے جی ٹیکا" کی طرح طویل اور گنجلک ہوجاتے ہیں۔ جملہ ایک صفحے سے شروع ہوا تو فل سٹاپ دوسرے صفحے پر آیا۔ بیچ میں معانی ومفاہیم کا ایک زبردست تانا بانا ہوتا ہے پروفیسر اقبال بھی بڑے الجھے۔ انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ جہاں ہے اور جیسے ہے کی بنیاد پر ترجمہ کردیا جائے اس صورت حال میں اکثر مطلب خبط ہوجاتا میں نے جب یہ صورت حال

دیکھی تو اقبالی ترجمے کو چوم کر رکھ دیا۔ دو تین سال تک یہ ترجمہ اسی طرح پڑا رہا جونہی ادھر کا رخ کرتا خوف دامن گیر ہو جاتا۔ اس کے بعد اقبال صاحب سے دوبارہ استدعا کی کہ اسے مزید آسان بنائیں۔ انہوں نے میری درخواست پر دوبارہ اپنے ہی ترجمے کو ڈی کوڈ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جو نسخہ بنا اس سے مطلب و مفہوم کا تھوڑا بہت سرا تو ہاتھ آیا مگر ربط و ترتیب کی صورت معدوم نظر آتی تھی۔ چنانچہ ایک دن میں نے اللہ کا نام لے کر خود لنگوٹ کسا اور دونوں لفظی ترجموں کو سامنے رکھ کر اپنے طور پر جو سمجھ آیا اسے آزاد ترجمے کی صورت میں تیسری بار از سرنو تحریر کرڈالا۔ اس کتاب میں جو ترجمہ چھپا ہے وہ اس قسم کا اٹکل پچو آزاد ترجمہ ہے۔

اس کتاب میں ماؤ اقبال نامی لیکچر کا ترجمہ شامل کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اول تو اس کتاب کا پورا اردو ترجمہ میری معلومات کے مطابق پاکستان میں دستیاب نہ تھا۔ ڈاکٹر ریاض نے دفتر اول کا ترجمہ ۱۹۸۲ء میں کیا تھا۔ دفتر دوم کا ترجمہ بھی ایک اطلاع کے مطابق انہوں نے حال ہی میں کیا ہے۔ مگر آخری اطلاعات تک چھپ کر مارکیٹ میں نہیں آیا۔ چنانچہ ہم نے اس کتاب کے دونوں حصوں کا آزاد اور ترجمہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ہمارا بنیادی مقصد تو صرف ماؤ اقبال کا اردو ترجمہ ہی پیش کرنا تھا۔ مگر اسی کتاب میں جب علی شریعتی اور اقبال کی ذہنی ہم آہنگی اور خیالات کی حدورجہ مماثلت کے نمونے دیکھے تو خیال آیا کہ کیوں نہ دونوں دانشوروں کا تقابلی مطالعہ پیش کردیا جائے۔ یہ بات بھی ہمارے پیش نظر تھی کہ علی شریعتی کا نثری سرمایہ ابھی پوری طرح اردو یا انگریزی زبان میں منتقل نہیں ہوا۔ ادھر اقبال خود ایک جہاں دگر ہے۔ چنانچہ یہ بہت بڑا کام نظر آیا۔ ابھی اقبال کو ہی اس ملک میں نہیں سمجھا گیا تو علی شریعتی کی فکر کو آگے بڑھانے سے کیا حاصل ہوگا۔ یہ خیال آتا تو اس منصوبے کو چھوڑ دیتا مگر پھر علی شریعتی شہید کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا۔ اس نے جوانی کے عالم میں شہادت کا جام نوش کیا۔ وہ ایک فکر کو عام کرنا چاہتا تھا۔ اقبال کو اس نے اپنی کتاب میں علی نما کہہ کر پکارا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو

علی شریعتی کے مسلک سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص کسی انسان کو دینے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچے گا۔ علی شریعتی نے اقبال کو نہ صرف علی نما کہا بلکہ اسے اپنا ذہنی اور فکری استاد بھی مانا۔

علی شریعتی کی تحریروں کا مطالعہ کرتے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اقبال کے اشعار کو فارسی نثر میں پیش کررہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال کی روح علی شریعتی میں حلول کرگئی ہے۔ علی شریعتی جب پیدا ہوا تو اس وقت اقبال کو فوت ہوئے ۵ سال گزر چکے تھے۔ علی شریعتی کے ایران میں اقبال کوئی زیادہ مقبول و معروف شاعر دانشور بھی نہیں تھا۔ اس کی شاعرانہ حیثیت کو تو کسی کم تر درجے پر شاید کچھ حلقوں میں پہچان لیا گیا تھا مگر اس کی انقلابی فکر اور تشکیل الہیات جدید کو سمجھنے یا عام کرنے کی گنجائش اس وقت دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ اس عالم میں داد دینی چاہئے علی شریعتی کی بصیرت اور بالغ نظری کی کہ اس نے سچے اسلام کی طرح سچے اقبال کو بھی پہچان لیا۔

اسلام اور قرآن کی طرح مسلم برصغیر کا یہ المیہ بھی ہے کہ یہاں اقبال جیسے دانشور انقلابی ترقی پسند اور روشن فکر مسلمان کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ اور ہر طالع آزما نے اقبال کے کلام سے اپنے لئے فال نکالی۔ حتیٰ کہ ہماری قوم پر گیارہ سال تک مسلط رہنے والا ایک آمر بھی اقبال کے کلام سے اپنے حق حکمرانی کے لئے سند حاصل کرتا اور کرائے کے اقبال فروشوں سے قوالیاں کروا کر سنتا رہا۔ اس تناظر میں جب علی شریعتی کی فکر کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت کی ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے۔ علی شریعتی نے نہ صرف اقبال کو خود صحیح طور پر سمجھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی تمام فکری بصیرت کو کام میں لاکر فکر اقبال کو ایرانی عوام سے بھی روشناس کروایا۔ علی شریعتی کی فکر کے اس پہلو نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ چنانچہ میں نے اس پہلو کو اجاگر کرنے کے لئے ماؤ اقبال کے آزاد ترجمے کے ساتھ اقبال و علی شریعتی کا ایک ابتدائی موازنہ بھی اس کتاب میں شامل کردیا ہے۔

علی شریعتی کی کچھ کتابیں مجھے میسر آگئی تھیں۔ کچھ تک ابھی تک میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ جو مواد مجھے مل گیا تھا۔ اس کے مطالعے کے بعد میں نے فکر شریعتی کا ایک خلاصہ پیش کرنے کی بھی کوشش کی جسے تصانیف شریعتی کے عنوان سے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

علی شریعتی کے کلام و فکر کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اقبال و شریعتی فاؤنڈیشن کے نام سے ایک ادارہ گزشت چند سالوں سے لاہور میں کام کررہا ہے جو سال بہ سال ایک اقبال شریعتی سیمینار منعقد کرواتا ہے۔ ان سیمیناروں کی روداد کو بعد میں پمفلٹوں کی صورت میں شائع کردیا جاتا ہے۔ اس ادارے سے متعلق ایک سہ ماہی رسالہ ویژن بھی گزشتہ چار پانچ سال سے نکل رہا ہے۔ اس میں بھی اقبال شریعتی سے متعلق تحریریں چھپتی رہتی ہیں۔ میں نے اس دارے سے بھی رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے اپنے فاؤنڈیشن کی طرف سے ہونے والے سیمیناروں کی مطبوعہ رپورٹیں ارسال کیں۔ اس کے علاوہ کوئی ٹھوس علمی کام علی شریعتی کے حوالے میرے سامنے نہیں آیا۔

میں نے ایران کے اشاعتی اداروں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے بھی فارسی میں چھپی علی شریعتی کی چند تصانیف کی فہرست کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر امداد نہیں مل سکی۔ ایران جانے والے اپنے چند دانشور دوستوں سے بھی درخواست کرتا رہا کہ وہ وہاں کی لائبریریوں اوراشاعتی مراکز میں جاکر کچھ ایسی چیزوں کی نشاندہی کریں جو اس تحقیق کے سلسلے میں معاون ثابت ہوسکتی ہوں۔ میرے ان پروفیسر دوستوں کی رپورٹ یہی ہے کہ ایران کی لائبریریوں میں علی شریعتی پر زیادہ مواد موجود نہیں ہے۔ جو کتابیں وہ میرے لئے لے کر بھی آئے وہ میرے پاس پہلے سے موجود تھیں۔ ان دوستوں کے اسمائے گرامی پروفیسر دلدار حسین بنگش، پروفیسر عابس حسین، پروفیسر صابر حسین اور پروفیسر اصغر حسین ہیں۔

میں نے خود بھی ایران جانے کا پروگرام بنارکھا تھا۔ اس سلسلے میں ایرانی کونصلیٹ سے علمی امداد وتعاون کی استدعا کی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ایران جاکر ڈاکٹر

شریعتی شہید کی بیوہ محترمہ پوران شریعت اور ان کے بچوں کے انٹرویو ریکارڈ کروں۔ اس کے علاوہ علی شریعتی کے دوستوں' مداحوں اور دوسرے واقفان حال سے گفتگو کروں اور پھر ان کے ماحصل کو اس کتاب میں ایک باب کے طور پر شامل کروں۔ ابھی تک ایران جانے کا پروگرام حتمی طور پر طے نہیں ہوا۔ اس دوران میری کتاب کا مسودہ تیار ہوگیا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس کتاب کو علی شریعتی اقبال کے موازنے کے طور پر شائع کردیا جائے۔ اور اس کے بعد ایران سے حاصل ہونے والے دوسرے مواد کو ایک کتابی صورت میں شائع کردیا جائے۔

جو کتاب اس وقت آپ کے ہاتھوں کیں ہے وہ علی شریعتی واقبال کا ایک ادھورا سا تعارف ہے۔ میری یہ شدید خواہش ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان علی شریعتی کی تحریروں سے آگاہی حاصل کریں۔

علی شریعتی نے آج کی زبان میں اسلام کی فکر کو آج کے انسانوں کے سامنے پیش کیا۔ وہ شاعر یا فلسفی نہ تھا۔ کوئی فنکار اور پیشہ اور شعبدہ کار نہ تھا۔ وہ جدید دور کا پڑھا لکھا ایک نوجوان سکالر تھا۔ جو اسلام کی روح کو خود سمجھنے کے بعد اسے دنیا میں عام کرنا چاہتا تھا۔ قدرت نے اس کو بے پناہ خطیبانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ چنانچہ اس نے زبان اور قلم کے ذریعے عملی جہاد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس وقت کے ایران میں شاہ کی آمریت اپنے جوبن پہ تھی۔ شاہی محل اور خاندان کی طرف اٹھنے والی آنکھ نکال اور انگلی کاٹ دی جاتی تھی۔ بڑے بڑے جغادری علماء فضلا اپنے جبہ ودستار سے شہنشاہ کے قدموں کی دھول صاف کرتے تھے۔ اس عالم میں فرانس کا پڑھا ایک پی ایچ ڈی سکالر میدان میں اترتا ہے۔ وہ چاہتا تو اپنے علم وقلم کو بیچ کر مخلاتی آسائش سے مزین زندگی گزار سکتا تھا۔ مگر وہ تو برق تپاں تھا اسے کوئی شاہ پیشواء نیام میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ علی شریعتی نے اپنی گردن کو لائن پر رکھ دیا۔ سب سے پہلی صف میں کھڑے ہوکر پہلی گولی کھانے کے لئے آمادگی کا اظہار کرنا سب سے مشکل ہوتا ہے۔ پہلی گولی کھانے والے لوگ پیدا ہوتے رہیں تو باقی کا کام آسان ہوجاتا

ہے۔

ایران کی سرزمین میں جہاں آمریت کی بلائیں لینے والے دانشور موجود رہے وہاں اس کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے والے لوگوں کی کمی بھی ہرگز نہیں رہی۔ ایران میں علمائے مذہب کا ایک گروہ یقیناً" ہر دور میں موجود رہا ہے جو مشکل سے مشکل وقت میں اسلام کی خدمت وعظمت کا پرچم بلند کئے رہا۔ شاہ کو بھی یقیناً" ایسے علماء کا سامنا تھا جن کو کچلنے کے لئے اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خود علی شریعتی نے جس وقت شعور سنبھالا اس وقت ایران میں علماء حق آمریت کے خلاف علمی و عملی جہاد میں مصروف تھے۔ خود علی شریعتی کے والد محترم تقی شریعتی اس ہراول دستے میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ علما کے بڑے بڑے گروہ سرگرم عمل تھے۔ آیت اللہ روح اللہ خومنی بابائے انقلاب جدید ایران نے ہر قدم پر مزاحمت کی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں۔ انہوں نے ایران کے عوام کی مذہبی' فکری اور انقلابی قیادت کا فریضہ ملک کے اندر اور باہر سنبھال رکھا تھا۔ ان کی آواز پر پورا ایران لبیک کہنے کو تیار تھا۔

علی شریعتی نے بھی اس فضا میں آنکھ کھولی۔ وہ اس تحریک کا حصہ بن گیا۔ اس نے اپنے انداز میں اپنا قلم اور علم سنبھالا اور جدید علوم کی روشنی میں اسلام کی توجیہ وتعبیر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے لگا۔ جدید تعلیم یافتہ ایرانیوں نے علی شریعتی کی آواز پر لبیک کہا۔ اس کا پیغام گھر گھر کیسٹوں پمفلٹوں اور سینہ بہ سینہ پہنچنے لگا۔ اس کا یہ رول سب سے اہم تھا اس نے اس جدید نسل کو متاثر کیا۔ اسے میدان عمل میں اتار جس نے جدید ایران کی منزل کو قریب کرنے کے لئے وہی کردار ادا کیا جو انقلاب فرانس کے لئے والٹیر نے ادا کیا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ والٹیر کو ہاف دی ریولوشن کہا جاتا ہے۔ اس وقت کے ایران میں انقلاب کی بات کرنا رضا شاہ پہلوی کی ایرانی آمریت کو ہی ناراض کرنا نہ تھا۔ بلکہ اس کے سرپرست امریکہ بہادر کے مفادات کو بھی زک پہنچانا تھا۔ امریکی سرزمین کے بعد اس وقت امریکی ماہرین ومفادات کا سب سے بڑا مرکز تہران تھا۔

تہران کو بچانا گویا امریکہ کو بچانا تھا۔ اس وقت کے باغیوں کی ٹکر شاہ وساوک سے زیادہ پنٹا گون اور سی آئی اے سے تھی۔ جن کے لئے ایک آدمی یا چند آدمیوں کو مار دینا مکھی مچھر کے مار دینے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں سینکڑوں ہزاروں ایرانی تشدد کا نشانہ بنے۔ علی شریعتی نے ان سب مصائب کو برداشت کیا۔ اس نے اپنے قول و عمل سے نوجوان تعلیم یافتہ نسل کو انقلاب کی راہ دکھانے کی کوشش کی۔

علی شریعتی کسی بھی انقلاب کے لئے روشن فکر اور دانشور طبقے پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اوپر والا ظالم طبقہ تو ظلم کرے گا اور نیچے والا مظلوم طبقہ ظلم سہے گا۔ یہ درمیان والا طبقہ دانشور طبقہ ہی دراصل قوم کی شعور مند آنکھ اوراس کا قلم علم پرچم ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اگر بک اور جھک جائے تو قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتی۔ چنانچہ اس طبقے کو بیدار کرکے میدان عمل میں اتارنا سب سے پہلا اور بڑا کام ہے۔ علی شریعتی نے اسی مشن کا بیڑا اٹھایا۔

علی شریعتی پر ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے اس ادنیٰ کی کوشش کے ذریعے میں نے اس کے کلام کی کچھ جھلکیاں دکھانے کی سعی کی ہے۔ میری کوشش ہے کہ اس کی تمام تصانیف کا سلیس اردو ترجمہ کرکے یا ان کا خلاصہ بنا کر کلیات شریعتی کے نام سے شائع کروایا جائے۔ پاکستان کے حالات ایران سے زیادہ مختلف نہیں۔ اوپر کا ایک خورد بینی طبقہ یکجا ہوکر پاکستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے۔ اس نے اپنی ایک مستقل آمریت قائم کررکھی ہے۔ووٹ' الیکشن' حکومتوں کی تبدیلی اسی طبقے کے چند سو یا ہزار نفوس کے درمیان میوزیکل چیئرز کا کھیل ہے۔ نیچے کا اکثریتی طبقہ لٹ رہا ہے۔ پٹ رہاہے کٹ رہا ہے مگراس کی صحیح قیادت کرنے والا کوئی نہیں۔ دانشور حکومتوں کے کاسہ لیس ہیں یا خوفزدہ اور سہمے ہوئے۔ ایسے عالم میں قوم کی فلاح اور حقیقی انقلاب کی راہ کھوٹی جاچکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علی شریعتی کے کلام وپیام کی روشنی میں اس ملک کے متوسط دانشور طبقے کو بیدار کرکے مظلوم اکثریت کی بے لوث قیادت کے لئے سامنے لایا جائے۔ علی

شریعتی کا یہی پیام تھا۔ اسی پیام کو عام کرنے کے لئے یہ تحریر سامنے لائی گئی ہے۔

یہ تحریر علی شریعتی کے حضور ادنیٰ اظہار عقیدت ہے۔ اس کی ساری خوبصورتیاں علی شریعتی کی ہیں اور ساری کوتاہیاں میری کوتاہ دستی کی پیداوار ہیں۔ اسے پسند کریں نہ کریں ایک مرتبہ اسکو پڑھ ضرور لیں

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

علی شریعتی کون

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں پیرس کے ایک کیفے میں بیٹھا لی موندے کا مطالعہ کررہا تھا۔ بولیویا میں ہونے والے واقعات پر ایک تجزیاتی مضمون میرے زیر مطالعہ تھا۔ وہاں تازہ تازہ فوجی انقلاب آیا تھا۔ میرے ساتھ ہی ایک آدمی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا کھاتے اس کی نظریں میرے اخبار پر بھی پڑ رہی تھیں اور وہ پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ جب اس کی دلچسپی حد سے زیادہ بڑھتی نظر آئی تو میں نے پوچھا کہ آپ کس صفحے کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا میں صرف اقتصادیات کے صفحے سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے بولیویا کے صفحے میں غرق دیکھ کر اس نے پوچھا تم بولیوین ہو۔ میں نے کہا نہ میں بولیوین ہوں اور نہ سیاستدان بلکہ مین تو ایک ایرانی طالب علم ہوں۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا وہ اسرائیلی طالب علم ہے اسے صرف 600 فرانک وظیفہ ملتا ہے۔ میں نے پوچھا تمہارا زرمبادلہ کے نرخوں سے کیا تعلق ہے۔ اس نے کہا تم ایرانی طالب علم ہو کر بولیویا کی جدوجہد آزادی میں دلچسپی لے سکتے ہو تو میں ان فرانکس کے بارے میں کیوں نہ سوچوں جو میری جیب میں پڑے ہیں اور جن کی کمی بیشی پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھ رہا تھا اور میں دل میں اسے بے وقوف سمجھ رہا تھا۔"(ادب کا نجات دہندہ) یہ اس ایرانی طالب علم کے خیالات تھے جو پیرس کی سوبورن یونیورسٹی میں سماجیات کا فلسفہ پڑھ رہا تھا۔

قوموں کے آفاق پہ کبھی کبھی ایسے ستارے بھی طلوع ہوتے ہیں جو منور راہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے خود تو موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں مگر قوموں کے مقدر کو سویروں سے ہم کنار کرجاتے ہیں۔ ایران کا نصیبہ جب ان گنت صدیوں کی تاریک آغوش میں جاگا تو فطرت نے

اس کے چمن میں ایک پھول کھلا دیا۔ جس کی مہک نے شعر و نغمہ میں بسی اس خواب آگیں سرزمین کو آتش زیر پا کردیا۔ ایران کا ایک شہزادوں جیسا حسین فرزند ایک غریب معلم کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی شخص تاریخ کے صفحات پر علی شریعتی کے طور پر ثبت ہے۔

علی شریعتی 23 نومبر 1933ء کو صوبہ خراساں کے ایک گاؤں مازینان میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد اپنے زمانے کے جید علماء تھے۔ اور شہری زندگی کی پراگندگی اور افراتفری سے دور کویر کے صحرا میں پرسکون زندگی گزارتے تھے۔ اس کے دادا آخوند حکیم جو فلسفہ حکمت اور علوم دین کے ماہر تھے۔ اگرچہ مازینان کے ایک چھوٹے گاؤں بیمن آباد میں رہائش پذیر تھے۔ مگر ان کے علم و حکمت کی شہرت تہران' مشہد' اصفہان' بخارا اور نجف تک پھیلی ہوئی تھی۔ تہران میں تو خاص طور پر ان کو نابغہ خیال کیا جاتا تھا۔ ایران کے بادشاہ نصیرالدین شاہ قاچار نے انہیں تہران مدعو کیا اور مدرسہ سپہ سالار میں فلسفہ پڑھانے پر مامور کیا مگر کچھ ہی عرصے بعد شہری زندگی نے ان کو بے زار کردیا اور وہ صحرائی زندگی کی آزاد اور معصوم فضاؤں کو لوٹ گئے۔ان کو دولت واقتدار کی ہرگز لالچ نہ تھی۔ علی شریعتی کو اپنے دادا میں اپنے وجود کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے جو واقعات ان کے متعلق سنائے گئے ہیں ان کو سن کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے مجھ میں ان کی روح داخل ہوگئی ہے یا میں خود پچاس سال قبل ان جیسی زندگی گزار رہا ہوں(کویر صف 9)

ان کے چچا معروف عالم ادیب نیشاپوری کے خاص الخاص شاگرد تھے۔ وہ بھی فلسفہ' ادب اور فقہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شہری زندگی سے کنارہ کرکے واپس مازینان آگئے تھے۔ علی شریعتی کو ان بزرگواروں کا دست شفقت حاصل رہا۔ وہ اپنے بزرگوں کے علم اور ان کے افکار کو ہی اپنی میراث سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا سفر انہی بڑے لوگوں کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر وضع کیا۔ اس کے والد نے اپنے بزرگوں کی روایت سے ہٹ کر شہری زندگی اختیار کی۔ علی شریعتی کی اپنی زندگی پر والد کے اس فیصلے کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اور اس نے بھی شہری زندگی کو مقصد کے حصول کے لئے اپنا لیا۔ علی شریعتی کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی

سب سے بڑی میراث یعنی غربت کا بلا شرکت غیرے وارث بنا۔ ان کے والد علی تقی شریعتی نے مشہد کی مشہور تنظیم "اسلامی صداقت کی تشہیری انجمن" قائم کی۔ یہ ادارہ ایران میں تحریک اسلامی کے احیاء فروغ کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔

علی شریعتی کی زندگی اور افکار پر اس کے والد بزرگوار کے علم و فضل اور دینی مشن کا بہت اثر ہوا۔ اس کے والد کی تصانیف بالخصوص "خلافت و ولایت" "قرآن وسنت" "وحی اور نبوت" "علی اور نبوت کا گواہ" اور "تفسیر نوین" بہت قابل ذکر ہیں۔ اس کے والد میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو آگے چل کر علی شریعتی کی زندگی میں پھلیں پھولیں۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح روشن خیال ' وسیع المشرب' جرات مند' مستغنی اور لذات دنیوی سے آزاد و بے نیاز تھا۔ بہت کم بچوں کو ایسے والد نصیب ہوتے ہیں جیساوالد شریعتی کو ملا تھا۔ علی شریعتی خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میرے والد نے میری روح کی پہلی سمت کی تشکیل کی۔ اس نے مجھے ایک انسان بن کر سوچنا اور زندہ رہنا سکھایا۔ اس نے مجھے آزادی' مستقل مزاجی' حیا وعصمت اور وسعت قلبی کے اوصاف سے متصف کیا۔ وہ اپنے والد کی لائبریری کے اندر ہی پل کر جوان ہوا۔ علی شریعتی کے والد کو کتابوں سے والہانہ عشق تھا اور یہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں ۔ جو چیزیں لوگ بعد میں کٹھن مراحل سے گزر کر سیکھتے ہیں وہ علی کو بڑے شریعتی کی طرف سے بچپن ہی میں بطور وراثت اور انعام کے مل گئی تھیں۔

علی شعریعتی کے والد کے دوست بھی بڑے بڑے عالم فاضل لوگ تھے۔ یہ اس کی خوش بختی تھی کہ اسے بچپن میں ہی ان بڑی اہل علم ہستیوں سے ملنے ملانے' ان میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اس بات کا معترف ہے کہ اس کے اندر ان بزرگ ہستیوں کے فکری عکس ہمہ وقت جھلکتے رہتے ہیں۔ لیکن ہربڑے آدمی کی طرح وہ صرف اپنی میراث پر قناعت کرنے والا نہ تھا۔ وہ اپنے ماحول سے اسی قدر متاثر ہوا اور اس قدر لے سکا جس قدر اس کے اندر گنجائش تھی۔ مگراس کا مقام اس سے بہت آگے تھا۔ اس نے ماحول و وراثت کی حدوں کو پھلانگ کر آگے گزرنا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بچپن اور نوجوانی کے عالم میں علی شریعتی میں بظاہر کوئی نمایاں بات نظر نہیں آتی۔ وہ ایک عام طالب علم تھا۔ اس دور میں اس کا کوئی کارنامہ اور امتیاز دوسروں سے مختلف نظر نہیں آتا۔ دوسرے بچوں کی طرح سکول میں داخل ہوا۔ ہر سال درجہ بدرجہ اپنے امتحان پاس کرنے لگا۔ رسمی تعلیم کے ساتھ وہ عربی اور مذہبی علوم بھی سیکھنے کی طرف متوجہ ہوا۔ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ استاد بننے کے لئے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخل ہوگیا۔ تعلیمی دور میں اپنے والد کے علاوہ جن دانشوروں نے اس کو فکری لحاظ سے متاثر کیا ان میں فرانس کے لوئی ماسینیان' ایران کے محمد علی فرخی' فرانسیسی سوشیالوجسٹ جیکس برق اور گورینچ اہم ہیں۔ فرانس میں دوران تعلیم ان میں سے بعض سے ان نے براہ راست تعلیم بھی حاصل کی۔

اس نے اپنے کیریئر کا آغاز تدریس و تحریر سے ہی کیا۔ اس نے سب سے پہلے فلسفہ تاریخ پر ایک مقالہ "مکتب وسطی" کے نام سے تحریر کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے والد کے ادارے تشہیر اسلامی میں طلباء کو لیکچر دینے کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ یہ مرکز جو تیس سال تک دین کی خدمت کرتا رہا علی شریعتی کے لئے ایک سپرنگ بورڈ ثابت ہوا۔ دراصل یہی مرکز اس کی صحیح تربیت گاہ ثابت ہوا۔ اسے لیکچر دینے سوال وجواب کے اسلوب اپنانے نبھانے اور طلبا اور دانشوروں سے براہ راست علمی ربط ضبط پیدا کرنے کی مشق حاصل ہوئی۔ خاص طور پر اسے اپنے اوپر اعتماد حاصل ہوا جو آگے چل کر اس کا اثاثہ ثابت ہوا اور وہ علمی محفلوں کو خطاب کرنے کی پوزیشن میں آیا۔ وہ شروع سے ہی ابلاغ کے اسی اسلوب کو پسند کرتا تھا وہ دانشوروں کے مجمع میں چلا جاتا لیکچر دیتا' مباحثے کرتا اور سوال جواب کے سیشن کرتا۔ اس طرح وہ خود بھی سیکھتا اور دوسروں تک بھی اپنی سوچ پہنچاتا۔ قدرت نے اس کی زبان میں تاثیر اور قلم میں زور رکھا ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں داخلے سے قبل ہی اس کو عربی اور فرانسیسی زبانوں پر اسقدر قدرت حاصل ہوچکی تھی کہ وہ ان زبانوں سے فارسی زبان میں کتابیں تک ترجمہ کرنے کی استطاعت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے ابوذر غفاریؓ پر ایک کتاب کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔

اس نے فرانسیسی سے دعاؤں کی ایک کتاب کا بھی فارسی ترجمہ کیا۔ ابوذر غفاریؓ سے عقیدت اس بات کا مظہر تھی کہ وہ کن سوچوں میں گم ہے۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے دنیائے اسلام اور مستضعفین کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔

اس کی نگاہ میں اسلام ایک سماجی انصاف اور سوشل کنٹریکٹ پر مبنی سنہری وسطی راستہ ہے جو سب انتہاؤں سے پاک ہے۔ علی شریعتی ایک ایک انچ ضد سامراج تھا۔ وہ لڑکپن سے ہی انقلابی تھا۔ وہ اسی عہد میں تحریک خدا پرست سوشلسٹ کا رکن بن گیا تھا۔ پچاس کی دہائی کے آغاز پر جب تیل کو قومیانے کی تحریک شروع ہوئی تو علی شریعتی اس میں بھی سرگرم تھا۔ بعض روایات کے مطابق جیل کی ہوا بھی کھائی۔

1956 میں بائیس برس کی عمر میں اس نے مشہد میں قائم ہونے والے ادارے فیکلٹی آف لیٹرز میں داخلہ لیا۔ ساتھ ساتھ اس نے بطور ٹیچر اپنا کام بھی جاری رکھا اس ادارے میں اپنے اساتذہ کے ساتھ اس کے بہت سے نظریاتی اختلافات پیدا ہوئے مگر وہ ایک خاص سمت میں اپنے خیالات کو یکجا کرتا رہا۔ اس کی خاص دلچسپی مذاہب کے تقابلی جائزہ فلسفہ تاریخ اور فلسفہ اسلام کے ساتھ تھی۔ وہ ہر کذب کو چیلنج کرتا تھا۔ اس کی اسی حق گوئی اور بے باکی کی وجہ سے خفیہ ایجنسیوں نے اس کو خطرناک جان کر اس کے خلاف فائلیں کھول دیں۔

علی شریعتی اپنے تعلیمی و علمی کیریئر کے آغاز سے ہی دو قوتوں کے خلاف برسرپیکار تھا۔ بروایت پسند علمائے مذہب جنہوں نے اپنے بنائے ہوئے حصار میں پناہ لے کر باہر ہونے والے مظالم سے آنکھیں چار کرنی چھوڑ دیں تھیں اور دوسرے نام نہاد جدید دانشور جو علوم جدیدہ کو اپنا ایمان بنائے بیٹھے تھے۔ ان دونوں گروپوں نے عوام الناس سے اپنا رشتہ توڑ رکھا تھا۔ شریعتی علمی اور عملی دونوں قسم کے جدوجہد میں یقین رکھتا تھا۔ وہ نیشنل مزاحمتی موومنٹ کا رکن بھی تھا۔ چنانچہ 1957ء میں اپنی مزاحمتی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے والد اور گروپ کے دوسرے اراکین بھی ساتھ گرفتار ہوئے۔ ان کو مشہد کی قلزل قلع جیل میں چھ ماہ گزارنے پڑے۔ یہ گویا آغاز تھا عملی زندگی میں۔ ان حالات میں وہ دل برداشتہ ہرگز نہ ہوا بلکہ

طوفان نے اس کی قوت پرواز کو مہمیز دی۔ پڑھنا لکھنا اور اپنے لکھے پڑھے کو دوسروں تک پہنچانا اس کا مشن ٹھہر گیا تھا۔

یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران پوران نامی لڑکی سے ربط بڑھا اور دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا۔ چنانچہ دونوں کی شادی ہوگئی۔ یہ اس کا پہلا اور آخری عشق تھا۔ اس وقت تک اسے فرانسیسی زبان پر اس قدر مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ اس نے الیکس کارل کی دعاؤں (لاپریری) کی کتاب کا آسان فارسی میں ترجمہ کرڈالا۔ 1959ء میں اس نے مشہد یونیورسٹی کی اکیڈمی ادبیات سے بی اے کی ڈگری امتیازی نمبروں کے ساتھ حاصل کرلی۔ وہ اپنی کلاس میں اول آیا تھا۔ روایت کے طور پر اس کو اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس بھیجا جانا تھا۔ مگر اس کی ترقی پسند سوچ اور سامراج دشمن نظریات کی وجہ سے اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کردی گئیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اسے ان چیزوں کی رغبت تھی نہ پروا۔ اس دوران اس نے جان اسولا (John Islolaa) کی "تصنیف امیدوایاس" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ جس کو صوبہ خراسان کے ایک رسالے قدس نے قسطوار چھاپا۔ 1960ء کے اوائل میں علی شریعتی نے انتظامی رکاوٹوں کو بعداز خرابی بسیار عبور کیا اور بالاخر اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے فرانس روانہ کردیا گیا۔

اس زمانے میں الجزائر کی جنگ آزادی زوروں پر تھی اور فرانس اپنی پوری سامراجی ونوآبادیاتی قوت کو صرف کرکے الجزائری عوام کو زیر کرنے میں مصروف تھا۔ ساری دنیا کے ترقی پسند لوگ فرانس کی اسی عوام دشمنی کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ خود فرانس کے اندر روشن خیال طبقے اپنی حکومت کی ان انسان دشمن پالیسیوں کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ علی شریعتی نے فرانس میں قدم رکھتے ہی ان سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا اور الجیرین لبریشن موومنٹ میں شامل ہوگیا۔ اس نے آتے ہی ایک مضمون "ہم تاریخ سے کیا سیکھتے ہیں" کے عنوان سے لکھ کر فرانس کے ایک رسالے میں چھپوادیا۔

فرانس کے قیام کے دوران علی شریعتی کو علمی فکری اور عملی دھاروں سے براہ

راست روشناسی کا موقع ملا۔ یونیورسٹی آف پیرس میں اسے بہت سے ترقی پسند اور انتہا پسند طلباء واساتذہ سے میل ملاپ کاموقع بھی ملا۔ اسے ان مصنفوں اور ان کی تصنیفات سے آگہی ہوئی جن کی شخصیات وکارناموں سے ایران میں رہتے یا تو وہ بے خبر تھا یا اس تک جو کچھ پہنچتا تھا وہ سنسر ہوچکا ہوتا تھا۔ اس نے برگسان 'البرٹ کامس' سارتر' شوارٹز' گورویچ' برق اور لوئی ماسینی ان کا گہرا مطالعہ کیا۔ سوشیالوجی کے تنقیدی اور تجزیاتی سکول سے کافی متاثر ہوا لیکن اس نے صرف اس مکتب فکر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے سماجی تخیل کو دوسرے فکری دھاروں سے بھی سیراب کیا۔ وہ مارکسٹ نکتہ نظر اور علم سماجیات کو خالص سائنس سمجھنے والے نکتہ نظر دونوں سے پوری طرح متفق نہ تھا۔ کیونکہ اس کی نگاہ میں دونوں غیر صنعتی معاشروں (تیسری دنیا) کے مسائل حقائق کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھے۔

علی شریعتی ایک ایسی سوشیالوجی کی تلاش میں مگن تھا جو سامراجی استحصال کے بوجھ تلے دبی تیسری دنیا کا تجزیہ اور توضیح کرسکے۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ یورپ کے نام نہاد سوشلسٹ اور کمیونسٹ جو ساری دنیا کے غریبوں اور مستضعفین کو اپنا بھائی اور اور دست وبازو کہتے نہیں تھکتے اپنی حکومتوں کی طرف سے تیسری دنیا کے اس سامراجی تسلط پر منقار زیر پر کئے بیٹھے تھے۔ بلکہ بعض تو اس کو حق بجانب تک تصور کرتے تھے۔ اس باب میں الجیریا کی مثال سب سے واضح تھی۔ اس وقت فرانسیسی نوآبادیاتی تسلط کے خلاف الجیریا میں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ اس مرحلے پر الجیرین اور فرانسیسی کمیونسٹ پارٹیوں کا کردار انتہائی منافقانہ تھا۔ یہ دونوں پارٹیاں الجزائر پر فرانسیسی قبضے کے حق میں تھیں۔ علی شریعتی کمیونسٹوں کے اس دوغلے پن سے برا فروختہ ہوا اور اس نے اپنے قیام فرانس کے دوران الجزائر کی تحریک وانقلاب کے مقاصد اور جدوجہد سے اپنے آپ کو ذہنی اور عملی طور پر وابستہ کرلیا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو جہاد کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ الجزائر کا انقلاب عصر جدید کے انقلابات میں ایک خصوصی نوعیت کا حامل تھا۔ کسی بھی روشن خیال اور صاحب ضمیر انسان کے لئے اس خونین انقلاب سے صرف نظر کرنا آسان نہ تھا۔ یہ انقلاب ایک کروڑ مزدوروں' کسانوں' بھوکے ننگے اور نہتے غریبوں کا انقلاب تھا۔ ایک طرف

یہ مستضعفین تھے تو دوسری طرف فرانس کی مستبد ومتمول سامراجی قوت کے پانچ لاکھ سے زائد اسلحہ وآہن میں ڈوبے استحصال کار تھے۔ یہ جنگ ایک EPIC کا درجہ رکھتی ہے۔

الجزائری مسلمانوں نے دس لاکھ شہیدوں کے خون سے بھری ایک ایسی خندق کھودی جس کے اندر فرانسیسی سامراج اور اس کی خونخوار قوت اپنی موت وحیات کے لئے بے دست وپا ہوکر تڑپنے لگی۔ موت کو گلے سے لگانے والے انسان پیدا ہوجائیں تو بڑی سے بڑی قوتوں کو بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ الجزائر کے جنگل اور پہاڑ فرانسیسی نوآبادیاتی سامراج کے لئے واٹرلو اور پانی پت کا میدان ثابت ہوئے۔ جہاں غریب اور نہتے کسان گوریلوں نے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ اس زمانے میں یعنی ساٹھ کی دہائی میں مسلم معاشروں کے تقریباً سبھی مسلمان عوام اس تحریک آزادی کو اپنی جنگ آزادی تصور کرنے لگے تھے۔

الجزائری نیشنل لبریشن فرنٹ کی ہدایت پر فرانس ویورپ میں مقیم مسلمان طلباء اپنے تعلیم کے آخری سالوں کو چھوڑ کر جدوجہد کرنے والوں کی صف میں شامل ہوگئے۔ علی شریعتی نے بھی ایسا ہی کیا۔ بلکہ وہ تو اس تحریک کا زبردست اور گرم جوش ترجمان بن کر پیرس کی گلیوں میں نعرہ زن ہوگیا۔ علی شریعتی نے سارتر کے افکار پر مبنی ایک مقالہ شاعری کیا ہے؟ کے عنوان سے لکھا اور اسے پیرس کے رسالے میں چھپوایا۔ وہ عملی جدوجہد میں اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ فرانس جیسے جمہوری ملک میں اسے گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہاں بھی وہ نچلا نہیں بیٹھا اور سیاسی اور انقلابی قیدیوں کے انٹرویو لے لے کر ان کو چھپوانے لگا۔ فرانس کے ہی قیام کے دوران اس نے مصطفیٰ کامران' ابراہیم یزدی جیسے ایرانی طلباء کے ساتھ مل کر ایرانی تحریک آزادی کی غیر ملکی شاخ قائم کی۔ سیکنڈ نیشنل فرنٹ کی تشکیل میں حصہ لیا۔ کانگو کے طلباء کو جاجاکر انقلاب پر ابھارا' شی گویرا کی گوریلا جنگ حکمت عملی اور فانان کی "افتادگان خاک" کا ترجمہ کیا۔

الجزائری انقلاب کے بطن سے مسلح عملی جدوجہد کے علاوہ فکر ونظر کے بے شمار سوتے بھی پھوٹے اور دانشور طبقہ اس تحریک کے بنیادی محرکات کا تجزیہ نفسیاتی فلسفیانہ اور سماجی تناظر

میں کرنے پر مجبور ہوا۔ اس زمانے میں الجزائری تحریک کا ترجمان رسالہ المجاھد اس نئی سوچ کو روشناس کرانے میں پیش پیش تھا۔ بنیادی سوال یہ اٹھایا گیا کہ جو بات انقلاب فرانس کے دور میں سچ تھی وہ آج جھوٹ کیسے ثابت ہوگئی۔ کیا الجزائری باشندے انسان نہیں ہیں؟ کیا ان کو اپنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کا کوئی حق نہیں ہے؟ کیا انقلاب کے لئے صرف سفید فام عوام کی ہی ضرورت ہوتی ہے؟ آخر باستیل کے قلعوں اور فصیلوں کو گرانے والا فرانسیسی انقلابی فلسفہ آج الجزائر کے لاکھوں عوام کے ارد گرد نوآبادیاتی جبر کا ایک نیا باستیل تعمیر و مضبوط کرنے پر کیوں مصر ہے ؟ یہ سوالات روشن فکر فرانسیسی مفکروں کے ذہنوں میں بھی تلاطم پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ محدود جذبہ حب الوطنی کو خیرباد کہہ کر یہ لوگ عالمگیر انسانی نجات کے انقلابی تصور سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ ان کی یہ تحریریں بھی "المجاہد" کی زینت بن رہی تھیں گویا اگر ایک طرف محاذ جنگ میدان میں دست بدست لڑائی ہو رہی تھی تو دوسری طرف فکری محاذ پر بھی دانش مشت و گریبان تھی۔

علی شریعتی کو دوران قیام فرانس جن دانشوروں نے متاثر کیا ان میں فرانسیسی سیاستدان شوارٹز (Schwartz) بھی تھا۔ یہ بنیادی طور پر سوشلسٹ خیالات کا حامل تھا۔ مگر ہنگری اور الجیریا کے معاملات میں کمیونسٹ پارٹی کے بوڑھو اپالیسوں کی حمایت کرنے پر اس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور ایک آزاد ترقی پسند سیاست کار و مفکر کی طرح سامراجی نظام اور اس کے کارندوں کے خلاف کام کرنے لگا۔ اس نے ایک صاف ستھرا عوامی محاذ بنایا اس نے اپنے خیالات پر مبنی ایک کتابچہ بھی شائع کروایا جس کا نام تھا مارکسزم کی تجدید نو۔ اس کا خیال تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق مارکسزم میں تبدیل لائی جائے۔ شوارٹز ہی کی زیر قیادت تھری پارٹی سسٹم کو فروغ ملا اور یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ سرمایہ داری نظام نے اپنے اندر تغیر پیدا کرلیا ہے یعنی انہوں نے اپنے سرمائے کا کچھ حصہ خرچ کرکے عوام الناس کو اپنے رنگ میں رنگ کر اپنا ہمنوا بنالیا ہے۔ عوام الناس اب سرمایہ داروں کی نقل کرکے ان جیسا بننا چاہتے ہیں۔ سرمایہ داروں کا معیار زندگی پرولتاریہ کا مطمع

نظر بنادیا گیا ہے۔ یہ سرمایہ داری نظام کی جیت ہے۔ اس کا توڑ یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے پیروکاروں کو بھی اپنے ہتھکنڈے اور فلسفے میں کچھ تبدیلی کرکے سرمایہ داروں کے اسی طلسم کو توڑنا ہوگا ورنہ معاشرہ سوشلسٹ بننے کی جگہ سرمایہ دار بننے لگے گا۔ سرمایہ داری سے حسد کی جگہ رشک پیدا ہوجائے گا۔ اس طرح سرمایہ داری نظام کا خاتمہ مشکل ہوجائے گا۔ شوارٹز بڑے سائنسی اور فکری انداز میں سرمایہ داری سامراج کی ان چالوں کو بے نقاب کررہا تھا۔ علی شریعتی اس کے خیالات سے کافی حد تک متفق دکھائی دیتا ہے۔ اور اپنی تحریروں میں ان کا پرچار بھی کرتا ہے (سرمایہ داری جاگ اٹھی)

ماسیونان

1960ء میں شریعتی نے مشہور فرانسیسی مستشرق ماسیونان کے ماتحت ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر کام شروع کیا۔ جو 1962ء میں ماسیونان کی موت تک جاری رہا۔ علی شریعتی ماسیونان کو بہت بڑا اسلامی سکالر سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی ایک آخری تحریر میں لکھا ہے کہ نجانے وہ کیا ہوتا اگر وہ لوئی ماسیونان سے نہ ملا ہوتا۔ اس کے بغیر وہ ایک جاہل ' بزدل اور بے وقوف سا انسان ہوتا' لیکن اب اس کا بہادر ' روشن خیال اور ذہین دل اس کے سینے کے اندر دھڑک رہا ہے۔ فاطمہ نامی کتاب کی تصنیف میں اس نے ماسیونان کی تحقیق سے استفادہ کیا اور اسے کتاب لکھنے میں مدد بھی دی

فرانس کے انقلابی فلسفیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد علی شریعتی اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ایران کی آزادی بھی بغیر مسلح جدوجہد کے ممکن نہ ہوگی۔ جب ایران میں مجاہدین خلق اور فدائین خلق نامی تنظیمیں شاہ کے خلاف 1968ء میں اسلحہ بند ہوکر متحرک ہوگئیں تو علی شریعتی کو اپنے سوالوں کا جواب مل گیا۔ یہی مسلح جدوجہد 11 فروری 1979ء کو ایک عوامی انقلاب کی کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ قیام فرانس کے ہی دوران اسے الجزائری انقلاب کے مجاہدین بن بیلا اور بومدین سے تعارف حاصل کرنے کا موقع ملا۔

انٹردی فانان

یہاں فرانز فانان علی شریعتی کی دنیا میں داخل ہوتا ہے وہ علی شریعتی ہی کی طرح کا ایک انقلابی نوجوان تھا۔ رہنے والا الجزائر غرب الہند کے کسی دور افتادہ مقام مارٹی نیق کا تھا مگر الجزائری تحریک آزادی سے اس قدر اپنائیت تھی کہ وہاں کی شہریت تک اختیار کرلی تھی۔ عربی اور فرانسیسی اس کی اپنی زبانیں تھیں۔ علی شریعتی ہی کی طرح اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس آیا تھا۔ طب میں ڈاکٹری کررہا تھا اور طبی سائیکالوجی اس کا خاص فیلڈ تھا۔ 1925ء میں پیدا ہونے والا یہ سیاہ فام علی شریعتی ہی کی طرح اندر سے شعلہ جوالہ تھا۔ فانان کے ساتھ علی شریعتی کا ذاتی تعلق رہا ہے۔ اس نے اس کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ علی شریعتی کا کہنا ہے کہ فانان رسمی مذاہب کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ مگر اس نے (علی شریعتی نے) اس کو قائل کیا کہ ان معاشروں میں جہاں مذہب ہی سب سے بڑی سوشیولاجیکل فورس ہے وہاں روشن فکر لوگ مذہب ہی کی راہ سے انقلاب برپا کرسکتے ہیں۔ جو مقاصد فانان سیکولر طریقوں سے حاصل کرنا چاہتا تھا وہ علی شریعتی مذہب کے ذریعے حاصل کرنے کا یقین رکھتا تھا۔ خاص طور پر مذہب اسلام کے ذریعے سے جو بنیادی طور پر انقلاب بن کر ہی دنیا میں ظاہر ہوا۔

علی شریعتی کا پرچم بھی انقلاب تھا۔ فانان سامراج اور نوآبادیاتی نظام کے لئے شمشیر برہنہ تھا۔ اہل یورپ کے لئے اسے جین پال سارتر نے دریافت کیا تھا۔ اور اس کو ایسے الفاظ میں یورپی دانشوروں سے متعارف کروایا تھا جو بجائے خود اپنی جگہ انقلاب کا ایک پرچم بننے کے قابل ہیں۔ فرانز فانان نے 1952ء میں اپنی تصنیف "سفید نقاب کالی جلد" کے نام سے شائع کی۔ ٹھیک اس زمانے میں الجزائر اور فرانس کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ فرانس کا الجزائر پر قبضہ غاصبانہ تھا۔ فانان کو الجزائر کے ایک ہسپتال میں ملازمت ملی مگر وہ حریت پسندوں کے ساتھ مل گیا۔ اس زمانے میں اسکی دو تصانیف سامنے آئیں "مسکتا نوآبادیاتی نظام" اور "دنیا کے ٹھکرائے ہوئے انسان" (WRETCHED OF THE EARTH)۔

1961ء جب اس کی عمر صرف 35 برس تھی پتہ چلا کہ فانن شدید کینسر کا شکار ہوچکا ہے۔ اسے واشنگٹن بھجوایا گیا مگر مرض لاعلاج ہوچکا تھا اور دسمبر 1961ء میں 36 سال کی عمر میں مرگیا۔ اس کی شہرہ آفاق تصنیف "ورچڈ آف دی ارتھ" نے حریت پسند انقلابیوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ نوآبادیاتی سامراج کے منہ پر زبردست طمانچہ تھا جس کے بارے میں کہا گیا کہ اسے نہ پڑھنے والا خود اپنا اور اپنے تعلیمی کلچر کا مقروض ہے۔ یہ تحریر اس بات کی علامت ہے کہ لکھنے والا اپنے قلم کو کن اعلیٰ ترین مقاصد کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔ سارتر نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھ کر اسے مزید جاوداں بنادیا۔ سارتر نے مغرب کو چیلنج کیا کہ اگر غیرت اور ہمت ہے تو آؤ اسی کتاب کو پڑھو۔ سارتر کے الفاظ آگ میں ڈھلی اور پگھلی ہوئی شاعری ہے۔

"زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب اس دھرتی پر دو ارب لوگ رہتے تھے۔ جن میں پچاس کروڑ انسان تھے اور باقی ڈیڑھ ارب نیم انسان نو آبادیاتی زندانی۔ انسان کے پاس لفظ تھے اور نیم انسان کا کام ان الفاظ کی تابعداری۔ ان انسانوں اور نیم انسانوں کے درمیان چند سو یا چند ہزار کرائے کے شاہزادوں جاگیرداروں سرمایہ داروں کا ایک ٹولہ تھا۔ سر سے پاؤں تک جعلی حیوانوں کا یہ قبیلہ انسانوں او ر نیم انسانوں کے درمیان دلالی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یورپی آباد کاروں نے نوآبادیوں کے اندر ایک مقامی غیر یورپین اشرافیہ کی تعمیر شروع کردی۔ وہ رال ٹپکانے والے لالچی سیاہ و نیم سیاہ فاموں کو اس مقصد کے لئے چنتے۔ ان پر اپنے کلچر و زبان کی دھاک اسی طرح کندہ کرتے جس طرح سرخ جلتے ہوئے لوہے سے جانوروں کی کھال پر اس کے مالک کا نام آگ کی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ پھر ان کے منہ کو وہ بلند بانگ اصطلاحات سے بھرتے۔ موٹے موٹے خونخوار الفاظ سکھاتے جو ان کے دانتوں سے چپک جاتے تھے۔ اپنے پاس بلاکر اور کچھ عرصہ ان کو اندر باہر سے تبدیل کرنے کے بعد اس نیم سیاہ فام اشرافیہ کو پھر کبوتروں کو پکڑنے والی کٹیوں کی طرح نوآبادیاتی کبوتروں کی خیلوں میں چھوڑدیا جاتا۔ چلتے پھرتے ان جھوٹ کے اشتہاروں کے پاس کہنے سے لئے اپنی کوئی بات نہ تھی۔ یہ صرف گونج تھے اپنے آقاؤں کی پڑھائی ہوئی باتوں کی۔ چنانچہ اس طریقے پر آزادی کے نام پر ایک جعل سازی کی گئی اور ان معاشروں

میں نو آبادیاتی نظام کو بطرز نو نافذ کردیا گیا۔ نیم انسانوں کو صرف اس قدر زندگی دی گئی کہ وہ اس اشرافیہ کے لئے مراعات و آسائشوں کے محلات تعمیر کرسکیں۔ دولت پیدا کریں آقا کے بچوں کے لئے۔ خود ان کے اپنے بچے بھوکے رہیں مگر یہ گندم' گوشت' دودھ انڈے اور مرغیاں اگا کر اس اشرافیہ کے قدموں میں بچھاتے رہیں۔"

سارتر کا کہنا ہے کہ ہم نے صرصر کو بویا ہے ہمیں آندھیاں اور طوفان ہی کاٹنے پڑیں گے۔ ہماری مغربی آئیڈیالوجی جھوٹ مکروفریب کی آئیڈیالوجی ہے۔ یہ نقاب ہے لوٹ مار' قتل وغارت گری اور دغا جعل سازی کی۔ ہماری انسان دوستی ہماری خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ ہم میں سے جو یورپی یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اس صورت حال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ جھوٹ کہتے ہیں۔ ہم سب اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم نے ظالموں کا ہاتھ نہیں روکا تو ہم لازماً" ان کے شریک بن گئے۔ ہم نے مل کر غریب اقوام کا استحصال کیا ہے۔ ان کے سونے' ان کی دھاتوں اور اب ان کے تیل پر قبضہ کرلیا ہے۔ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں۔ تو اپنے محلات کی طرف دیکھو 'اپنے گرجاؤں اور صنعتی شہروں کی طرف دیکھو۔ ہم میں سے جو انسان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اس لوٹ مار میں برابر کا شریک ہے۔ اور وہ سپر یورپین امریکہ جو صرف آزادی' مساوات بھائی چارے محبت واحترام کے نعرے لگاتا ہے اس باب میں پیچھے نہیں رہا۔ ہم اہل یورپ وامریکہ صرف اس لئے پورے انسان بنے کہ ہم نے تین چوتھائی دنیا کو نیم انسان' غلام' وحشی اور حیوان بنادیا۔ ہم سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کے ہاتھ' دامن اور منہ پر معصوم اور مظلوم انسانوں کے خون کے دھبے نہ ہوں۔ لفظ' فلسفے' نعرے' اقوام متحدہ ادارے' امداد' تقریریں کتابیں خون کی لالیوں کو چھپا نہیں سکتیں۔ لیکن یاد رکھو

مغرب کے باسیو مشرق بیدار ہورہا ہے۔ مشرق میں وہ بیٹے پیدا ہورہے ہیں جو ٹینک کے سامنے سینہ کھول کر کھڑا ہوجانے کا یارا رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اب ہماری زبانوں پر ہم سے زیادہ قدرت حاصل کررہے ہیں۔ یہ ہمارے خیالات کو ہم سے زیادہ سمجھنے لگے ہیں۔ یہ لوگ اب ہم سے مخاطب نہیں ہوتے۔ ہماری باتیں کرتے ہیں اپنی زبان میں کرتے ہیں۔ انقلاب کا لاوا پک رہا ہے۔ ہم لوگ جنہوں نے تاریخ بنائی اب خود تاریخ بننے والے ہیں۔ اے اہل مغرب اگر ہمت ہے تو فانان کی کتاب کو پڑھو۔ یہ تمہارے لئے نہیں لکھی گئی۔ نہ فانان جیسے لوگوں کو اب تمہاری پرواہ ہے۔ اس کی بلا سے تم اسے پڑھو یا نہ پڑھو مگر پڑھ لو تو شاید اپنے بچنے کی کوئی راہ نکال سکو۔ ورنہ تمہیں تاریخ اور زمانہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ وقت کی کمان سے تغیر کا تیر نکل چکا ہے۔ اس کا ہدف مغرب اور اہل مغرب ہیں۔ جو شخص فانان کو نہیں پڑھے گا وہ خود اپنا مقروض رہے گا۔"

فانان انقلاب کی آواز تھا جو آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح گزر گیا مگر اپنے جیسے انسانوں کے دلوں میں انقلاب کے ایسے بیج کاشت کرگیا جو آنے والے زمانوں میں ظالموں' غاصبوں اور استحصال کرنے والوں کے لئے برچھیاں 'نیزے اور کلاشنکوف کاشت کرتے رہیں گے۔ ہمارا ڈاکٹر شریحتی بھی اس فانان کا پرستار تھا۔ وہ فانان سے مل چکا تھا اور اس کے اپنے بقول دونوں میں فکری اختلافات بھی موجود تھے مگر دونوں سامراج کے دشمن اور انقلاب کے حامی تھے۔

علی شریحتی 1960ء میں پیرس پہنچا۔ فانان اس وقت اپنی تعلیم مکمل کرکے الجزائر کے کسی ہسپتال میں سرکاری فرائض سرانجام دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے لئے عملی اور قلمی جدوجہد بھی کررہا تھا۔ اس کی مشہور کتاب 61-1960ء میں ہی لکھی گئی۔ فانان الجزائری باشندہ ہونے کے ناطے فرانس کا شہری بھی تھا۔ اور ایک انقلابی دانشور کے لئے یہ بعید

نہ تھا کہ وہ اپنے انقلابی ساتھیوں سے رابطہ رکھنے کے لئے اور اپنی علمی وانقلابی تحریروں کو چھپوانے کی غرض سے ان ایام میں فرانس آتا جاتا نہ رہا ہو۔ علی شریعتی کو فانان اور الجزائری تحریک سے جو وابستگی تھی اور جس کی خاطر وہ فرانس پہنچتے ہی جیل بھی چلا گیا تھا وہ فانان سے ملتا رہا تھا۔ فانان کی موت پر علی شریعتی نے اس پر ایک مفصل مقالہ لکھا جو یورپ کے ایک رسالے میں چھپا۔ ڈاکٹر شریعتی فانان کی تصنیف "وریچڈ آف دی ارتھ" کو انقلابی منشور اور انقلابی پیغامات کی بائبل سمجھتا تھا۔ وہ اس کتاب کو ایران کے ان لوگوں کے لئے سب سے بڑا تحفہ قرار دیتا ہے جو ایران میں ایک سماجی سیاسی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سارتر نے فانان کو اہل یورپ سے روشناس کرایا تو علی شریعتی نے اسے ایران اور مشرقی دنیا سے متعارف کروانے کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔ شریعتی نے فانان کے نکتۂ نظر اور افکار کو اپنی جدوجہد کے لئے بھرپور طور پر استعمال کیا۔ علی شریعتی کی تحریر میں ایسا انداز بیان بھی مل جاتا ہے جو فانان کی یاد دلاتا ہے۔

> "آؤ دوستوں کہ یورپ کو خیرباد کہہ دیں۔ بندروں کی طرح اس کرہ خاکی سے جان چھڑالیں۔ آؤ کہ اس یورپ کے پیچھے چھوڑ دیں جو باتیں تو انسانیت کی کرتا ہے مگر جہاں اسے انسانیت ملے سب سے پہلے اس پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔"

علی شریعتی کے متعارف کروانے کے بعد ایران میں فانان کے بے شمار مداحین پیدا ہوگئے اور بہت سے دانشوروں نے بعد میں فانان پر بہت کام کیا اور اس کے خیالات کو ایران کی فکری دنیا میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا۔ فانان کے علاوہ علی شریعتی نے افریقہ کے ہی ایک اور انقلابی دانشور عمرازگان کا بھی کافی مطالعہ کیا اور اسے اہل ایران سے متعارف کرایا۔ اس کی تصنیف "افضل الجہاد" انقلابی سوچ کی مظہر ہے۔ علی شریعتی کو پورا یقین تھا کہ افریقہ کے روشن فکر دانشوروں میں جو نظریات پروان چڑھ رہے ہیں ان کی فعالیت سے ایرانی قوم کو اپنی راہیں متعین کرنے میں آسان ہوگی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اسلامی دنیا میں برپا ہونے والی تحریکوں

سے استفادہ کرکے اپنے ملک سے استعماری راج ختم کریں مگر وہ خالی تقلید کا حامی تھا نہ محض نظریاتی ہٹ دھرمی کا قائل تھا۔ وہ سب کو پڑھتا' سنتا اور سب سے تاثر حاصل کرتا تھا اوران دانشوروں کی سوچ سے متاثر ہوکر خود نئے نئے نظریات پیش کرتا۔ وہ اپنے نظریات کی بنیاد صرف کتابی دانش کو نہیں بناتا تھا بلکہ اس کے ساتھ وہ خود سوسائٹی کے اندر پائے جانے والے معروضی حالات کا حقیت پسندانہ تجزیہ کرکے اوریجنل خیالات پیش کرتا۔ اس کا نکتہ نظر دوسروں کی سوچ کا پرتو نہیں ہوتا بلکہ ایک تنقیدی پہلو بھی لئے ہوئے ہوتا تھا۔

اپنے قیام فرانس کے دوران وہ دوسرے طلباء کی طرح محض کتابی و نصابی علم کو حاصل کر کے امتحانی ضروریات ہی پورا نہیں کرتا رہا بلکہ اس نے آنکھیں ' کان اور ذہن کو کھلا رکھا اور گردوپیش کے حالات سے اپنے ملک وقوم کے لئے دور رس انقلابی تاثر کے لائحہ عمل کوکشید کیا۔ وہ یورپ کی زندگی کا بالا استیعاب مطالعہ کررہا تھا۔ وہ وہاں پر برپا بین الاقوامی تحریکوں سے عملی راہنمائی بھی حاصل کرتارہا' ان میں شریک بھی ہوا' مقالات بھی لکھ کر چھپواتا رہا' مظاہروں مباحثوں میں بھی حصہ لیتا رہا' حتیٰ کہ غیر ملکی جیل میں جانے سے بھی نہیں کترایا۔

اس مرحلے پر وہ تین جہتوں میں مصروف کار نظر آتا ہے۔

۱ حصول علم وفضل اور جدید افکار ونظریات سے کما حقہ آگاہی

۲ عملی جدوجہد میں حتی المقدور شرکت اور بڑی شخصیات کا قرب وشناسائی

۳ ایک فکری وعملی لائحہ عمل کی تشکیل جسے ایران کے معروضی حالات میں نافذ کیا جاسکے۔

اس کی تمامتر جدوجہد کا مقصد اپنی ذات کی تکمیل تزئین سے زیادہ اس چیز سے متعلق رہا ہے کہ کس طرح اس کے ہیروز یعنی عوام الناس کی حالت کوسنوارنے کا سامان کیا جاسکے۔ وہ اپنے لئے پڑھتا لکھتا اور سوچتا نہ تھا۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ عوام الناس ہی رہے۔ اتفاق سے اس زمانے میں ایران کے اندر ترقی پسند حلقوں میں جھرجھری پیدا ہوچکی تھی۔ مذہبی حلقے بھی عوامی محاذ پر متحرک ہوچکے تھے۔ شہنشاہیت کے خلاف جذبات ابھارے جارہے تھے۔ ڈاکٹر مصدق

کا جمہوری رول آمریت کے جوہڑ میں اپنے وجود کا پتھر پھینک کے ارتعاش پیدا کرگیا تھا۔ فکری جمود کے ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں اور ایرانی قوم تبدیلی کے لئے تیار ہورہی تھی۔ دوسری طرف پچاس کی دہائی کے واقعات کے بعد ملوکیت نے نئے ہتھکنڈوں کے ساتھ اپنے پنجے مضبوط کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ جیل خانوں کو بھرا جانے لگا تھا۔ تشدد کے دروازے پھر سے کھل گئے تھے علماء کی پگڑیاں اچھالی جانے لگیں۔ شاہ کے غیض وغضب کا ہدف قوم پرست راہنما تھے۔ خاص طور پر وہ جو "نہضت آزادی" نامی تحریک کے وابستگان تھے۔ ایرانی مزاحمت کے تناظر میں صرف یہی گروہ ایسا تھا جو ایک واضح پروگرام اور آئیڈیالوجی کے ساتھ میدان میں اترا۔ یہ گروہ کسی تجریدی نعروں کے پیچھے نہیں بھاگ رہا تھا یا سوشلزم' ہیومنزم' جمہوریت کی غیر مرئی آئیڈلز کا پرستار نہ تھا۔ یہ اس شاہ کی ملوکیت' اس کے خاندان اس کی پالیسیوں اور اسکی حکومت کا مخالف تھا۔ وہ جڑ سے ان چیزوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔

5 جون 1963ء کو ہونے والی عوامی بغاوت اس سوچ کا واضح اعلان تھا۔ اس عملی جدوجہد نے کھرے اور کھوٹے کی پہچان کروادی۔ علی شریعتی کا تعلق عوام کی اسی تحریک سے تھا۔ وہ اس سے وابستہ تھا اور اس کے لئے علمی اور قلمی محاذ پر ملک کے اندر اور باہر کام کررہا تھا۔ وہ اس مذہبی وہ فکری تحریک کا حامی تھا جو آیت اللہ خمینی کی قیادت میں چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ علی شریعتی کا قلم آگ برسا رہا تھا۔ وہ اس تحریک کی بنیاد کو سمجھ گیا تھا۔وہ ان ایرانی دانشوروں سے مختلف تھا جو ترقی پسندی کے نام پر انقلاب کے داعی تو تھے مگر مذہب کے بارے میں اس کا رویہ معذرت خواہانہ تھا۔ یہ نام نہاد ترقی پسند گروہ آزادی وجمہوریت کا بھی علمبردار تھا مگر مذہبی حقائق سے صرف نظر کررہا تھا۔ یہ گروہ ایرانی عوام کی سائیکی سے بے خبر تھا یا اسے نظر انداز کررہا تھا مگر علی شریعتی اس قسم کا تجریدی دانشور نہ تھا۔ وہ اپنی زمین' عوام اور مذہب سے پوری طرح آگہی رکھتا تھا۔ اس نے اپنے قلم وعلم کو اسی سوچ کو عام کرنے کے لئے وقف کردیا اور ایران سے باہر چھپنے والے سب سے موثر فارسی اخباروں رسالوں کے ذریعے اپنی آواز بلکہ ایرانی عوام تک پہنچانا شروع کردیا۔ علی شریعتی نے اپنے فکر و عمل کے ذریعے ایران کی

عوامی جدوجہد کا ربط عالمی استعمار دشمن فکر سے جوڑ کر ایک بہت بڑا علمی کارنامہ سرانجام دیا۔

فرانس میں تقریباً" چار پانچ سال قیام کرنے اور پی ایچ ڈی کی سند فلسفہ تاریخ اور سوشیالوجی میں حاصل کرنے کے بعد علی شریعتی 1964ء میں اپنے بال بچوں کے ساتھ جوں ہی ترکی اور ایران کی سرحد سے بازرگاں کے علاقے میں داخل ہوا اسے شاہ کے مستعد سپاہیوں نے گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔ اس نے قازل قلع جیل میں کئی ماہ گزارے۔ کافی عرصے تک تو اس کے باپ کو بھی اس سے نہ ملنے دیا گیا۔ بعد ایک مدت کے وہ جیل سے رہا ہوا تو اسے طرح طرح سے ستایا گیا۔ کوئی ادارہ اسے ملازم رکھنے کو تیار نہ تھا۔وہ چھوٹے چھوٹے سکولوں میں تدریس کا کام کرنے لگا۔ کبھی مشہد شہر میں تو کبھی کسی دیہات کے سکول میں۔ اسکی اسناد کیا تھیں مگر اسے کالج آف ایگریکلچر میں پڑھانے کے لئے بھیجا گیا۔ بعد از خرابی بسیار کافی عرصے کے بعد مشہد یونیورسٹی نے اسے بطور اسسٹنٹ پروفیسر قبول کیا۔

ایران کے اس نامور سکالر کی یہ پذیرائی اپنے ملک میں ہوئی۔ اپنا ملک اس کے لئے جیل خانہ بن گیا تھا۔ اس کو ایران سے بھگانے کے لئے سارے ہتھکنڈے آزمائے گئے مگر وہ کسی عہدہ ومنصب کا لالچ نہیں رکھتا تھا۔ اسے پرائمری سکول میں بھی بھیجا گیا تو اس نے وہاں بھی اپنی روشن خیالی کے چراغ جلائے۔ اس کا مشن اس نئی سوچ کی تبلیغ تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ جتنا اس پر ظلم ہوتا تھا اتنا اس کا ارادہ مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے لئے اس نے درخواست نہیں دی تھی بلکہ یونیورسٹی نے خود اسے بلایا تھا۔ علی شریعتی نے اس موقع سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا اور ایران کی نوجوان نسل کے اندر اس جذبے کو کاشت کرنا شروع کیا جو بالآخر ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کے غروب ہونے پر منتج ہوا۔ علی شریعتی نے یونیورسٹی کی ہر کلاس میں لیکچر دینا شروع کردیا۔ اس کی کلاسوں میں کھڑے ہونے کی جگہ نہ رہتی۔ ساری یونیورسٹی کے سارے مضامین کے طلباء جوق در جوق اس کے لیکچر سننے آتے۔ یونیورسٹی والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔ طلباء اس جوان درعنا دانشور پر فدا تھے۔

1967ء سے (جب وہ یونیورسٹی میں آیا) 1973ء تک کا زمانہ علی شریعتی کے لئے

بڑا زرخیز زمانہ تھا جب اس کی فکر ودانش کو جلا مل رہی تھی۔ اس کے سننے والے بڑھ رہے تھے۔ جہاں وہ جاتا ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اس نے مشہد یونیورسٹی سے باہر نکل کر دوسری یونیورسٹیوں میں بھی لیکچر دینے شروع کردیئے۔ اس زمانے کا سب سے اہم علمی وادبی ادارہ حسینیہ ارشاد بھی اس کی زد سے نہ بچا۔ وہاں پر لیکچر دینا ایک قومی اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ایران کے بڑے بڑے دانشور وہاں آکر لیکچر دینا اپنے لئے عزت وافتخار سمجھتے تھے۔ وہاں سننے والے بھی بڑے بڑے ادیب' شاعر' فلسفی' طلباء اور اساتذہ ہوتے تھے۔ علی شریعتی کی وہاں پر زبردست پذیرائی ہوئی۔ اس نے وہاں جاکر بڑے بڑے معرکتہ آلارا لیکچر دیئے جو اب کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں۔ حسینیہ ارشاد کا موازنہ آزادی ہند سے قبل لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے جلسوں سے کیا جا سکتا ہے۔ علی شریعتی کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا راستہ روکنے اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے یونیورسٹی حکام نے 1964ء میں اسے یونیورسٹی کی ملازمت سے برطرف کردیا۔ علی شریعتی نے اس وار کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

اس نے حسینیہ ارشاد پر اپنی توجہ مرکوز کی۔تواس فلاحی اور علمی ادارے کو بھی بند کردیا گیا۔ پھر بھی وہ علی شریعتی کی آواز کو خاموش کروانے میں ناکام ہوئے تو انہوں نے شریعتی کے ضعیف والد کو گرفتار کرلیا۔ علی شریعتی اس وقت انڈر گراؤنڈ ہوکر پورے ایران میں شعلہ فشاں ہورہا تھا۔ اس نے جب باپ کی گرفتار کی خبر سنی تو فوراً" اپنے آپ کو ساوک کے سامنے پیش کردیا۔ اسے رسوائے زمانہ جیل کوہتاہ میں ڈال دیا گیا جو ہٹلر کی طرز پر خاص طور پر سیاسی قیدیوں پر تشدد کے لئے بنوائی گئی تھی۔ یہاں وہ اٹھارہ ماہ تک قید رہا مگر ہار مانی نہ نظریات بدلے۔

کتنا عظیم تھا وہ انسان جو اپنی زندگی صحت جوانی اعلیٰ ڈگریاں گھربار بال بچے دوست رشتہ دار سبھی کو چھوڑ کر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ٹھنڈی پتھریلی زمین پر لیٹ گیا۔ کوئی گلہ کیا نہ شکوہ' معافی مانگی نہ مقدمہ دائر کیا۔ جو اس کا منصف تھا وہی اس کا رقیب تھا۔ رقیبوں کے سامنے کون مقدمے دائر کرتا ہے۔ اس کا مقصد اپنی قوم اور عوام الناس کو جگانا تھا۔ اس کام کے لئے قربانیوں کے چراغ جلانے پڑتے ہیں۔ یہی علی شریعتی نے کیا۔ تو ظلم آزماتا جا میں صبر آزماتا

جاؤں گا۔ آخر بین الاقوامی دباؤ کے تحت شاہ ایران کو علی شریعتی کی رہائی کا حکم دینا پڑا مگر اس کے لئے زندگی کو تلخ بنادیا گیا۔

1971ء میں جیل سے رہائی کے بعد سے 19 جون 1977ء تک کے اپنی زندگی کے آخری دن تک ایران کی زمین اور خدا کی خدائی اس پر تنگ کردی گئی۔ روزگار کا سلسلہ منقطع' لکھنے بولنے پر پابندی' جان و جسم کو الگ خطرہ۔ مگر آفرین ہے انسانیت کے اس نامور سپوت پر کہ وہ جوانی کے اس خوبصورت زمانے میں جب پھولوں کی سیجیں سجائی جاتی ہیں وہ کانٹوں کے بستر میں کانٹوں سے پنجہ آزما ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ راتوں کو خفیہ طور پر لوگوں کے گھروں کے اندر ان کے تہہ خانوں میں روشن خیال نوجوانوں کو جمع کرتا اور اپنی سوچ و نظریات کا پرچار کرتا۔ شاہ کے کاسہ لیس اور اس کے مسلح سپاہی اس کے تعاقب میں ہوتے۔ وہ جگہیں بدلتا رہتا مگر اپنے کام کو جاری رکھتا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ جس عوام الناس کے لئے وہ سر پر کفن باندھ چکا ہے اس محبوب سے ملنے کی راہ میں دیواریں کھڑی کردی گئی ہیں۔

دو سال آنکھ مچولی کی یہ زندگی گزارنے کے بعد اس نے جلاوطن ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ شاہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اسی کام پر اسے مجبور کیا جارہا تھا۔ آخر کار 16 مئی 1977ء کو وہ لندن کے لئے روانہ ہوا۔ ساوک کے خونخوار درندے اس کے تعاقب میں تھے۔ اس کا خاتمہ شاہ کی کتاب میں درج ہوچکا تھا مگر وہ اسے ایران کی سرزمین پر نہیں مارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لندن پہنچنے کے ٹھیک ۳۰ دن بعد ساوک کے کارندوں نے اسے لندن میں اپنے ہی اپارٹمنٹ کے اندر پراسرار حالات میں موت کی نیند سلا دیا اور وہ 19 جون 1977ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ اس کی وصیت کے مطابق اسے دمشق میں حضرت علیؑ کی بیٹی حضرت زینبؑ کے قریب سپرد خاک کردیا گیا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کی پنہاں ہوگئیں۔ ہمارا مقدور ہرگز نہیں کہ خاک سے پوچھیں کہ یہ کون تیرے اندر آکر محو خواب ہوا ہے۔ علی شریعتی کو جس شہنشاہ آریہ مہر نے ماردیا تھا وہ درحقیقت اپنی قبر خود کھود چکا تھا۔ علی شریعتی جیسے لوگ قبروں میں کہاں چھپتے ہیں

ان کو چھپانے والے خود قعرِ ذلت میں اتنے غروب ہوتے ہیں کہ ان کا نام لیوا کوئی باقی نہیں رہتا۔ ان کی قبر بنانے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ شہید کا فکر و عمل ان کی ڈھائی ہزار سالہ ملوکیت، اس کے سینکڑوں کاسہ لیسوں اور اس کے قلعوں کا دفاع کرنے والوں کا قبرستان بنا کر دنیا کو نظارۂ عبرت پیش کر دے گا۔ علی شریعتی زندہ ہے آریہ مہر مر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایران کے اندر تاریک رجعت پسند سوچیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو چکی ہیں۔ علی شریعتی نے اپنی آنکھوں سے اس انقلاب کا مرئی چہرہ نہیں دیکھا جو اس کے دارِ فانی سے رخصت ہونے کے سال دو سال بعد امام خمینی کی صورت میں تہران کے ہوائی اڈے پر اترا تھا۔ علی شریعتی کی قربانیوں کی گواہی دینے کے لئے اس ایک دن پچاس لاکھ ایرانیوں کا مجمع موجود تھا۔ امام خمینی جب اترا تو اس کے ساتھ علی شریعتی کی پاک روح بھی اتر کر اپنے ان ہم نصیبوں سے بغل گیر ہوئی تھی جن کی خاطر اس نے اپنے آپ کو خاک و خون میں تڑپا دیا تھا۔

آج علی شریعتی اپنے پیغام کی صورت میں لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے اس کا پیغام انقلاب بن کر نئے ایرانی سماج کی رگ و پے سرایت کر چکا ہے اس نے کسی تنظیم کا رسمی سہارا نہیں لیا۔ اور نہ کسی تعصب اور نظریے کو اپنی بیساکھی بنایا۔ وہ انسانوں کے حقیقی ہجوم سے مخاطب تھا۔ یہ لوگ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کے دل شریعتی کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ شریعتی نے کسی موقع پر ان سے دغا نہیں کی۔ وہ صوفوں پر بیٹھ کر فلسفیانہ موشگافیاں کرنے والا دانشور نہ تھا۔ وہ جدوجہد کرنے والوں کی پہلی صف میں موجود رہتا تھا۔ وہ سینے پر گولی کھانے والا بہادر دانشور تھا۔ اس کے لئے فکر اور عمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ جو کچھ کہتا ہے اسے کر کے دکھاتا ہے۔ اگر کر کے نہیں دکھاتا تو پھر منہ سے نہیں نکالتا۔ اس نے زندگی کا ایک مقصد اور مشن متعین کر لیا تھا۔ اور ناک کی سیدھ میں اسی منزل کی طرف گامزن تھا۔ یہ راہ کوئے یار سے نکل کر سیدھا سوئے دار لے جاتی تھی۔ علی شریعتی کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ اسی لئے کوئی بھی مقام اسے راستے میں جچا ہی نہیں۔ شہادت کے لئے آیا تھا اور شہادت دے کر شہادت ہی کے راستے پر چلا گیا۔

علی شریعتی افکار و نظریات لیکچروں' کیسٹوں' نوٹس کتابوں اور پمفلٹوں کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں ۔ انکی ساری زندگی ہی عملی جدوجہد کا نمونہ بنی رہی۔ اسے کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے اور کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ اگر ظالموں اور غاصبوں کے تعاقب میں تھا تو قاہروں کے کارندے اس کے تعاقب میں رہے ۔ چوالیس سال کی زندگی اتنی لمبی تو نہیں ہوتی ۔ وہ اتنی ہی عمر میں ولادت سے شہادت کے درجے تک پہنچا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا ۔ فکر معاش اس کا بہت بڑا مسئلہ تھا اور اس کے لئے اسے دردر کی ٹھوکریں بھی کھانی پڑی تھیں ۔ مگر اس نے نان جویں کو صرف سانس کا رشتہ جسم سے قائم کرنے کے لئے ہی تلاش کیا۔ پیٹ بھرا یا نہیں دل ودماغ اس کا ضرور بھرا ہوا تھا ۔ پیٹ پر اس نے پتھر بھی باندھے کہ یہی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس نے دل ودماغ کا سودا نہیں کیا' انیس سو ساٹھ کے ایران میں جہاں شاہ کی طاقت اور دولت کا بینار بازار سجا تھا۔ ہر چیز بک رہی تھی ۔ شاہ نے ہر دانشور کو اپنے تاج میں سجانے کے لئے قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ علی شریعتی کے لئے فرانس سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد کسی بڑے منصب پر فائز ہوجانا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ اسے یہ لالچ دی بھی گئی مگر وہ تو اپنے آپ کو کسی اور کے ہاتھ میں بیچ چکا تھا ۔ وہ قوم وطن' عوام ' علم ودانش اور سب سے بڑھ کر اللہ کا ہوچکا تھا اور جو اللہ کے قریب ہوتے ہیں وہ آدمی بے نظیر ہوتے ہیں۔

علی شریعتی بھی بے نظیر آدمی تھا ۔ بیش بہا تھا ۔ شاہ کے خزانوں میں اس کی قیمت موجود ہی نہ تھی اسے غریبوں' ناداروں 'برہنہ پا انسانوں کی محبت' ان کے آنسو' ان کے چہرے کی گرد ان کے ماتھے کی شکنیں ضرور خرید سکتی تھیں مگر شاہوں کے خزانوں میں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ وہاں سانپ' بچھو اور انگارے ہوتے ہیں ۔ علی شریعتی نے اس محبوب بیوی کو بھی دکھ دئے جسے بڑی چاہت کے ساتھ اس نے اپنا جیون ساتھی بنایا تھا۔ اس نے ان بچوں کو بھی آتش نمرود میں اتار دیا تھا جو بڑی تمناؤں کے ساتھ خانم کے آنگن میں کھلے تھے ۔ اس نے اس باپ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بودئے تھے جو اسے وہی کچھ بنانا چاہتا تھا جو وہ بن گیا تھا۔

اس نے دوستوں عزیزوں رشتہ داروں کو رونے کا ہی سامان مہیا کیا ۔ دنیاوی خوشیاں

اور لذتیں نہ اس نے حاصل کیں نہ اس کا کبھی موضوع بنیں۔ اسے شاید اپنی جوان مرگی کا پہلے سے ادراک تھا۔ وہ صبح وشام کام میں مگن رہتا۔ وہ گلی گلی کوچہ کوچہ گھومتا رہا۔ عجز وانکسار کا لبادہ اوڑھے دور جدید کا یہ درویش مست قلندر سب خطرات ولذات سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ وہ سوٹ اور ٹائی لگائے ہوئے تھا مگر اندر سے اپنے آپ کو مٹا چکا تھا۔ اسے جلدی تھی۔ اس کے کام بہت تھے۔ ہزاروں سال کی منجمد برف کو اس نے پگھلانا تھا۔ قوم کی بے حسی اور بے عملی میں دراڑیں ڈالنی تھیں' آمریت مطلق کے در ودیوار پر سنگ باری کرنی تھی' اپنی صفیں درست کرنی تھیں۔ حریفوں کی صفوں میں بارود بھرنا تھا۔ اس نے سارے کام یک وتنہا کرنے تھے۔ اس کام میں اس کا کوئی ساتھی وشریک نہ تھا۔

اسکی زندگی قلم وعلم کی عبادت سے عبارت تھی۔ وہ علم وہنر سے ذاتی خواہشات کے محلات تعمیر کرنے کا متمنی نہ تھا۔ وہ غریب کی کٹیا میں دیا جلانا چاہتا تھا۔ بے ہنر بے دست وپا عوام الناس کے قلوب میں روشن فکری کے چراغ اگانا چاہتا تھا۔ وہ زندگی کو ایک مقصد کا تابع سمجھتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بڑا مشن تھا۔ اس کا ہر ہر قدم اسی مشن کی راہ میں اٹھ رہا تھا۔ ہر قدم نپا تلا' ہر چال سوچی سمجھی' ہر گام پر تیروں کا سامنا' ہر موڑ پر خونخوار بھیڑیوں سے مڈھ بھیڑ' وہ جوان تھا خوبصورت تھا اور سب سے بڑھ کر اندر سے زندہ تھا۔ حرارت اس کے پور پور سے پھوٹتی تھی۔

اس کے دیکھنے سننے والے بوڑھے جوان خواتین سرکاری ملازم سپاہی سبھی لوگ تھے۔ مگر وہ نواجوانوں اور طلباء کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔ وہ اس کے کلام کو لکھ لکھ کر ایک دوسرے تک پہنچاتے۔ اس طرح اس کے کیسٹ گھر گھر پہنچنا شروع ہوگئے۔ اس نے دلوں میں جو آگ لگائی تھی وہ بھڑکنا شروع ہوگئی تھی۔ فعال و متحرک لوگ ایک دوسرے سے علی شریعتی کے اگلے خطاب کی جگہ پوچھتے' پچھلے خطاب کی باتیں سنتے۔ اس کی باتوں پر مشتمل پمفلٹ اس وقت کے ایران میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے اور صبح چھپ کر شام تک لوگوں کے گھروں اور دلوں تک پہنچ جاتے۔ اس نے جو لکھا اور کہا دل سے کہا اور دل کے ٹکڑے کاغذ اور

زبان پر سجادئے۔ وہ بے بہا خطیب تھا۔ اس کی خطابت رگ وپے میں سرائیت کرجاتی تھی۔ سننے والے کے منہ سے بے اختیار یہی بات نکلتی کہ یہ بھی گویا میرے دل میں تھی۔ اس کے قلم سے نکلے ہوئے فقرے ہم خیال لوگوں کے لئے چابکیں تھیں جن کی چمکوں سے وہ ان کو خواب غفلت سے جگاتا تو حریفان دین وجان کے لئے وہ آگ میں تپی ہوئی سلاخیں تھیں جن سے ان کے بدن داغ جارہے تھے۔

وہ تشبیہہ استعارے کنائے ،تمثیل کہانی اور دوسرے سب ذرائع کو استعمال میں لاکر اپنے کلام میں تاثیر کا سحر بھرتا تھا۔ وہ مشکل ترین فلسفیانہ افکار ونظریات کو سادہ ترین الفاظ میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی جانتا تھا۔ اس کا کلام سادگی پر کاری کی دھوپ چھاؤں ہوتا۔ وہ پہلو اور زاویے بدل بدل کر دشمن کی صفوں پر حملہ آور ہوتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے مخاطبین میں علماء وفضلا کے ساتھ ساتھ سیدے سادے عوام الناس بھی ہیں ۔ وہ سبھوں کو سمجھانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کے پیرایہ اظہار میں طرح طرح کی بوقلمونی کے پھول کھلے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خود پسند نہ تھا اور نہ اپنی علمی دھاک کسی پر بٹھانا چاہتا تھا۔ فلسفہ تاریخ کا پروفیسر ہونے کے باوجود وہ اپنے لیکچر کو عوامی سطح پر رکھنے کی سعی کرتا رہتا ۔ تاکہ اس کے چشمہ فیض سے کوئی پیاسا نہ اٹھے۔ یہ بات اس کے مشن کی تکمیل کی راہ کی رکاوٹ ہوگی اگر اسکا پیغام گھر گھر اور دل دل تک نہ پہنچے۔ مشکل پسندی سے اس نے حتی الوسع گریز کیا۔ قران' اسلام' حیات نبویؐ' اہل بیت کرامؑ اور بزرگان دین کی زندگیوں کی روشن مثالوں سے اپنی اس تحریر وتقریر کو مزین کرتا جو سارتر' ماسیونان' فانان ' ڈیکارٹ' روسو ' شوارٹز اور دوسرے مغربی دانشوروں کے افکار سے گندھی ہوتی تھی۔

اس کے لیکچر جدید انداز فکر وعمل کا نمونہ ہوتے تھے۔ جس میں سامعین کو پوری طرح شریک کیا جاتا۔ تنقیدی سوالات کی بوچھاڑ ہوتی ۔ وہ ہر قسم کے اعتراض اور سوال کے لئے تیار رہتا اور اسکے اکثر لیکچر سوالات کے جوابات کے طور پر ہی ڈلیور ہوئے ۔ اس کے فکری مخالفین اس کو زچ کرنے کے لئے اس کے اجتماعات میں در آتے اور طرح طرح کے سوالوں سے اسے

رگیدنے کی کوشش کرتے مگر وہ تحمل بردباری کی تصویر بنا سب کی سنتا ' سب کی تشفی کراتا ۔ اس کے چہرے کی سدا بہار مسکراہٹ اور اس کے قلب کا ٹھنڈا میٹھا اطمینان کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ اسے معلوم تھا وہ سب کچھ اپنے لئے نہیں کررہا۔وہ تو بیداری عوام کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ تو فکری محاذ کا لیڈر ہے ۔ اسے تنقید سے بالا تر نہیں ہونا چاہئے۔

اسے وہی بڑا مسئلہ درپیش تھا جو دور جدید کے تمام روشن خیال مفکرین کے سامنے آتا ہے یعنی دو دنیاؤں کو ملانا۔ نئے زمانے کے لوگوں کے سامنے مذہب کی بات کرنا اپنے آپ کو رجعت پسند کہلوانا ہے اور پرانے زمانے کے لوگوں کے سامنے جدید فکر ونظر کی باتیں کرنا آپ کو ملحد ومرتد بنانا ہے ان دو انتہاؤں کے درمیان راستہ بنانا بہت مشکل ہے ۔ فکر ونظر کے ان دو دھاروں کا ملاپ مشکل سے ہی ہوتا ہے۔ علی شریعتی نے ایران میں وہی کام سرانجام دینے کی کوشش کی جس کا بیڑا برصغیر میں سرسید احمد خان 'علامہ اقبال اور علامہ مشرقی نے اٹھایا تھا۔ اس راہ میں بڑے مشکل مقام آتے ہیں۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے اگر سرمو ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی تو سبھی طبقوں کے لئے راندہ بن جانا بعید نہیں ہوتا۔

ٹھوس تجزیاتی علم کو بنیاد بنانا اور روایات وافسانویت کو ساتھ لے کر چلنا آسان نہیں ہوتا۔ علی شریعتی نے اس راہ کو اپنایا کیونکہ وہ ان معدودے چند انسانوں میں سے تھا جنہیں تیزرفتار سائنسی صنعتی ترقی نے قدیم معاشروں سے ابھارا تھا۔ قدامت کابوجھ سر سے اتارے بغیر جدیدیت کو اپنانا انہی لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ لوگ تشکیل جدید کے سرخیل ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ معذرت خواہ نہیں ہوتے اور نہ ہی برخود غلط ہٹ دھرم۔ طرز کہن اور طرز نو کے درمیان جو روایت ودرایت کا فطری توازن تاریخی کی جدلیت کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے یہ لوگ اس سے آگہی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ وقت کو دائرہ تصور کرتے ہیں نہ بے سمت نکتوں کا انبار بلکہ اسے وہ ادھ کھینچی لکیر سمجھتے ہیں جو کسی مابعد الطبعیاتی ڈیزائن کے ساتھ معینہ سمت میں آگے بڑھ رہی ہے وقت کے دریا میں انسانی توانائیوں کی ندیاں آ آکرملتی رہتی ہیں ۔ قطروں کے قافلے ایک ناپیدا کنار سمندر کی طرف رواں ہوتے ہیں جو خود خدا ہے۔

علی شریعتی جیسے لوگ اس میکرو سسٹم سے آگاہ ہوتے ہیں جو روز مرہ کے مائکرو سسٹم کے ساتھ ساتھ اوپر اوپر اندر اندر کارفرما ہوتا ہے۔ یہ لوگ دونوں کا ربط تلاش کرتے ہیں۔ دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اس وقت سے بھی آگاہ ہیں جو محکوم ہے اور اس سے بھی شناسائی رکھتے ہیں جو حاکم ہے۔ یہ محکوم اور جغرافیائی وقت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے۔ مگر تاریخی وقت کی ربوبیت سے وہ ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ علی شریعتی جیسے لوگ مذہب کو اسی تاریخی وقت کی ربانیت کا مظہر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب چند لگی بندھی رسومات' چند معین ظاہری عبادات اور چند لکھے ہوئے لفظوں کے گھوٹے کا نام نہیں۔ یہ انسان کو اندر سے تبدیل کرنے کا بہت بڑا سماجی انقلاب ہوتا ہے جو پیغمبروں کی راہ سے اس لئے آتا ہے کہ عام لوگ اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ یہ لوگ سسٹم کے بنے ہوئے سسٹم کے اندر کے آدمی ہوتے ہیں۔

علی شریعتی نے مذہب سے وہ کچھ اخذ کیا جو مذہب دنیا کو دینے کے لئے آیا تھا۔ وہ اسے ایک سڑک قرار دیتا ہے جو کسی منزل کی طرف جارہی ہے۔ وہ سڑک کی اینٹوں اور پتھروں اور تارکول کی تعریف میں سڑک پر بیٹھ کر قوالیاں کرنے کا روادار تھا نہ اسے مذہب قرار دیتا تھا۔ وہ ان لوگون کو دین کا دشمن سمجھتا تھا جنہوں نے بھولے بھالے انسانوں کو منزل چھوڑ کر صرف سڑک کی پوجا پر لگا دیا ہے۔ ایسے لوگوں نے دین اسلام کے ازلی ابدی اور لافانی پیغام انقلاب کو محض گھسے پٹے جملوں اور بے مغز خیطبانہ الفاظ کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ دراصل اس کا پہلا جہاد ان داخلی قوتوں کے خلاف ہے جو ہمارے اندر گھس بیٹھی ہیں اور جنہوں نے ہماری اصلی چیز کو نقلی بنادیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ لوگ دنیا میں اس جعلی نسخے کو اصلی بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

علی شریعتی کا حقیقت اسلام و قران تک پہنچے ہوئے ایک خوبصورت انسان کی طرح یہ عقیدہ تھا۔ کہ اسلام بہت بڑا سماجی انقلاب ہے اس کو دنیا کے انسانوں کے پاس بھیج کر اور نبوت کا باب بند کرکے اللہ یہ ثابت کردیا ہے کہ اس پیغام کی تشریح وتوضیح کے لئے اب کسی اور پیغمبر

کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ جو ہم نے کہنا تھا کہہ دیا۔ صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے اب اس پر عمل کرنا عوام الناس کا کام ہے۔ عوام الناس اس پیغام کو سمجھتے ہیں مگر ان کی راہ کھوٹی کرنے کے لئے ابلیس کی سیادت میں ایک طبقہ مستکبرین موجود رہتا ہے۔ یہ اقلیتی گروہ خدا در اس کی زمین اور اس کے اندر پائی جانے والی نعمتوں پر بلا شرکت غیر قابض ہوگیا ہے وہ کروڑوں اربوں مستضعفین کے حصے کی ہوا پانی خوراک دھوپ چاندنی پر قبضہ غاصبانہ جمائے بیٹھا ہے۔ اسلام جو انصاف صداقت اور مساوات کا درس دینے کے لئے آیا ہے۔ اس طبقے نے اپنی اجارہ داری میں لے لیا ہے۔ اور غریبوں کو اپنے حقوق' مراعات کی بازیابی سے روکنے کے لئے اسلام کو ہی اسلام اور غریب کے خلاف استعمال کرنے کے ہتھکنڈے دریافت کئے ہیں۔

یہ طبقہ دعویٰ تو مذہبی پیشوائی کا کرتا ہے مگر دراصل شاہوں کے ساتھ ساجھے داری کے بدلے اس کو اصلی اور سچے اسلام کو مقید وزندانی کرنے کا فریضہ سونپ دیا گیا ہے۔ اس طبقے کا کام یہ ہے کہ سچے اسلام کے چہرے پر نقاب ڈالتا رہے اور لوگوں کو اسلام کا ایک دوسرا نسخہ گھڑ کے دے دیا جائے اور باور کرادیا جائے کہ یہی اسلام ہے' اور اس اسلام میں غریبوں کے لئے کوئی انصاف نہیں۔ اس میں کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے جسے چاہے جتنا بخش دے۔ غریبوں کو کہا جاتا ہے کہ تم غربت کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ بادشاہ لوگ ظل الٰہی ہوتے ہیں خدا کی برگزیدہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے سروں کو جھکائے رکھو۔ ان کی اطاعت دین کے عین مطابق ہے۔ اپنے لئے اس دنیا کی ساری نعمتوں کو اپنے سامنے ڈھیر کرنے کے بعد شاہوں کی سازشوں کا شریک کار یہ پیشواء طبقہ غرباءِ زمین کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔ اسے اگلے جہان کی نعمتوں کی تصویریں دکھاتا ہے۔ اس دنیا کو ہیچ قرار دے کر اس دنیا کی ساری مسرتیں اپنے خاندان کے گھروں میں چراغاں سجائے رکھتا ہے۔ یہ طبقہ غرباءِ وطن کو ذکر وفکر میں لگا اور ان کی آنکھیں بند کروا کر ان کا ہی گھر لوٹ رہا ہے۔ علی شریعتی اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ گھر کے اندر پائے جانے والے اس چور کو قرار دیتا ہے اسکا یہ سوچا سمجھا نظریہ ہے کہ جب تک گھر کو اس خس وخاشاک سے پاک نہیں کیا جائے گا۔ گھر میں امن وسکون اور کامیابی کا داخلہ بند

رہے گا۔

علی شریعتی اسی مشن کی تکمیل میں سرگرم عمل رہا۔ اس کا کہنا ہے کہ صحیح عقیدے کے لئے صحیح علم کی ضرورت ہوتی ہے اور صحیح علم کے لئے صحیح سوچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسانیت کی تکمیل کی طرف قدم اس صورت میں بڑھ سکتے ہیں جب ہم صحیح راہ پر گامزن ہوں۔ صحیح راہ پر ہم اس صورت میں گامزن ہوں گے جب ہم کو اس راہ کا پتہ ہو۔ تاریخ کے مطالعے سے اس نے جو اسباق اخذ کئے اس میں سب سے اہم یہ تھا کہ قوم کو پہلے صحیح راہ پر لاکر ڈالا جائے۔ اس کے بعد وقت کا دھارا خود انسان اور انسانیت کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔

ہمارا المیہ یہ رہا ہے کہ انقلاب اسلام کے چند ابتدائی سالوں کے بعد وقت کے مستبد اور جاہ پرست طبقے نے اسلام کو راہ سے ہٹانے کے لئے اسلام پر ہی قبضہ کرکے اپنے گھر میں ڈال لیا۔ ہمارا سب سے بڑا کام یہ ہونا چاہئے کہ اس طبقے کی اجارہ داری کو ختم کیا جائے۔ اس طبقے نے اسلام کو فریز کر رکھا ہے۔ وقت سے اسکا ناطہ توڑ دیا ہے۔ وہ آگے جارہا ہے نہ پیچھے بس فضا میں معلق ہے۔ اسلام تو ہم پرستی' انتہا پسندی اور نظریاتی جمود کا شکار ہونے کے بعد انسانوں کی فکری روحانی اور نوعی ارتقاء میں رکاوٹ بن گیا ہے۔

دور جدید میں انسان نے سائنس وحکمت کے میدانوں میں جو برق پا ترقی کی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانوں کے اندر اسی تناسب سے فکری وروحانی ارتقا بھی ظہور پذیر ہو مگر ایسا نہیں ہورہا ہے۔ فکری اور روحانی طور پر انسان گھٹتا جارہا ہے اس کے بازو تو مضبوط ہوتے جارہے ہیں مگر قلب وروح پر مردنی چھائی جارہی ہے۔ اس غیر حقیقی موت سے رستگاری کے لئے ہمیں فکری صحت وسلامتی کی فکر کرنی ہوگی۔ انسانی شعور کے اندر بھی وہ انقلاب برپا ہونا چاہئے جو اسکی باہر کی دنیا میں برپا ہوچکا ہے ظاہری تمدن تو قبائلی پتھریلے سماج سے نکل کر الیکٹرانک و نکلیائی ایج میں داخل ہوگیا ہے مگر داخلی ثقافت از منہ جاہلیت کی بھول بھلیوں کی طرف رجعت پذیر ہورہی ہے۔ انسان ہیومن ازم اور انسانی اخوت کی جگہ محدود نیشنلزم 'وطنیت پرستی' رنگ ونسل کی پوجا اور لسانی 'علاقائی تعصبات کا شکار ہورہا ہے۔

انسان بظاہر اتنا زیادہ ترقی یافتہ ہونے کے باوصف تنگ نظر ہوتا جارہا ہے اس نے انسان کے طور پر اپنی شناخت کھو کر ایک مشین یا ایک قدامت پرست قبائلی کے خول میں گھس کر سوچنا شروع کردیا ہے۔ علی شریعتی انسانی شعور کو ایک منجمد یا راجع بہ عقب حقیقت نہیں مانتا بلکہ اسے ایک زندہ فعال آرگنازم قرار دیتا ہے جو آگے ہی بڑھتی ہے۔ مصنوعی طریقوں سے اس کو الجھاووں میں گرفتار کرکے اس کی رفتار کو پابند سکوت کیا جاسکتا ہے اور ایسا ہی ہورہا ہے۔ امریکہ ویورپ میں سکن ہیڈ اور کوکلس کلین کے لوگ انسانی ذہن کی اس بیمار کی علامت بنے ہوئے ہیں تو مسلمان دنیا میں رجعت پسند مذہبی پیشواء اس عارضے کی بیماری علامتیں ہیں۔ دونوں قابل نفرت ہیں دونوں کو انسانی فکر و قلب کی صحت کے لئے خطرناک سمجھا گیا ہے۔ انسانی شعور کے راہ کی ان رکاوٹوں کو ہٹا کر اسے پھر سے ارتقاء اور ارتفاع کی منزل کی طرف روانہ کرنا ہی ہمارا کام ہونا چاہئے۔

علی شریعتی کے نزدیک اسلام کی حرکیاتی قوت واستعداد کا ادراک و نفاذ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب تاریخ اسلام کو صحیح تناظر میں پڑھا اور سمجھا جائے۔ مارکس نے تاریخ کے تسلسل میں معاشیات کے اصولوں کو کار فرما دیکھا۔ کارلائل نے اسے عہد ساز شخصیتوں کے کارناموں کا منطقی ربط قرار دیا۔ روسو نے اسے مختلف ادوار میں ہونے والی عمرانی معاہدات کا شاخسانہ بتایا۔ ڈارون نے اسے انواع حیوانی کی ارتقاء آفرینی سے تعبیر کیا فرائڈ نے اسے جنسیاتی اور جنسی جبلتوں کے زیر دبم کے نام سے پکارا۔ علی شریعتی کے نزدیک تاریخ عالم سوشیالوجی آف شرک کے مقابلے میں سوشیالوجی آف توحید کا برملا مظہر ہے یہ ایک آویزش ہے جو ہابیل اور قابیل کے درمیان روز آفرینش سے رواں دواں ہے۔

کائنات کا نکتہ پرکار توحید ہے اور اس کے گرد تاریخ اور اس کے نظام گھومتے رہتے ہیں۔ اس حوالے سے علی شریعتی اسلام کو محض انسانی آئیڈیالوجی کی روشنی میں نہیں دیکھتا۔ جو کسی خاص زمانے اور وقت میں خاص لوگوں کے لئے آیا اور چلا گیا۔ وہ اسلام کے پیغام انقلاب کو اس پانی سے تشبیہ دیتا ہے جو پہاڑوں پر سے برف کی صورت میں پگھلتا، چٹانوں، صحراؤں، جنگلوں میدانوں

میں راستہ بناتا ازل سے ابد تک رواں دواں ہے ۔ انسان اس سرچشمہ فیض سے جانی انجانی دونوں صورتوں میں فیض یاب ہوتے رہتے ہیں ۔ پانی کی حقیت واہمیت کو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے پانی موجود ہے ۔ اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اسے حیات کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

جس طرح خدا کو نہ ماننے سے خدا کی خدائی پہ کچھ فرق پڑتا ہے نہ اس کا رول کسی طرح کم ہوتا ہے۔اسی طرح پانی کی افادیت واہمیت سے انکار کے باوجود اس کی ضرورت ہر دور کے انسان کو زندہ رہنے کے لئے رہی ہے توحید "اسلام یا پیغام ربانی کی ندی ازل سے رواں دواں ہے ۔ پیغمبر اور نیک لوگ وقتاً" فوقتاً" آکر اس کی روانی میں جولانی پیدا کرتے رہے ۔ پانی میں پڑے جھاڑ جھنکار پتھروں ریت (SILT) کو ہٹاتے مٹاتے رہے ۔ یہ پانی بہتا اور انسان تاریخ کے سفر میں آگے بڑھتا چلا آرہا ہے ۔ یہ جہاں سے آیا ہے اس نے وہیں پہ جانا ہے ۔ پانی نے پانی سے ملنا ہے۔ ندیاں دریا' جوئے بار سب بحر ناپید کنار سے وصال پاتی ہیں کہ یہی ان کا مقدر ہے۔

پانی کے سفر کے دوران کروڑوں اربوں انسان اس قافلہ ء آب میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ جو اس پانی سے اپنے آپ کو یکجان (IDENTIFY) نہیں کرتے وہ خس وخاشاک بن کر کناروں سے الجھ جاتے ہیں یا ریت کے ذرے بن کر دریا کے بستر میں موت کی نیند سوجاتے ہیں۔ جو پانی کے ساتھ پانی مل گیا وہ آگے بڑھا اور سمندر سے بغل گیر ہوکر وسعت مقام ہوگیا۔ اسے جاودانی مل گئی۔ یہی پانی ہے جسے آسمان کی دھوپ پھر وہاں سے موتی بنا کر اٹھاتی اور پانی بنا کر پھر اس کائنات پر برساتی ہے۔ کہیں برف کہیں بارش کہیں قطرہ ء شبنم۔

یہ ایک تسلسل حیات کا کھیل ہے جو روز ازل سے جاری ہے ۔علی شریعتی کے نزدیک تاریخ مثبت پانی کی روانی ہے۔ پتھر پہاڑ چٹانیں اس کی راہ کی منفی رکاوٹیں ہیں ۔ جس کو اس نے عبور کرنا ہے یہ حسینؓ کی راہ کے یزید ہیں ۔ یہ مستضعفین اور مستکبرین کا تصادم ہے۔ موسیٰ اور فرعون کی جنگ ہے۔ جو لوگ تاریخ کا شعور رکھتے ہیں اور سماجی انقلاب کو روبہ عمل دیکھنے کے متمنی ہیں ان کو اس حقیقت کو حرز جاں بنانا ہوگا۔ وہ یہیں سے اپنی راہ کا تعین کریں

گے کہ وہ پانی کا ساتھ دیں گے یا پتھروں کا

ہم کہ ایک شمشیر جو ھردار تھے لیکن ہمیں
دست نانجار کی تلوار ہونا تھا ہوئے

یہ کچلے مسلے انسانوں کے ساتھ ہوں گے یا کچلنے مسلنے والے ہاتھوں اور ہتھیاروں کے دست وبازو بنیں گے ۔ جو لوگ زمانے کے آموں جابروں قاہروں کاساتھ دیتے ہیں ان کاعلم ان کی دانش ان کی تمام صلاحیتیں خیر کی جگہ شر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ خیر وشر کی اس آویزش میں پیغمبران کرام کا کردار بڑا واضح رہا ہے یہ نیک لوگ عوام الناس کو اپنے ساتھ ملا کر شر کی قوتوں کو ختم کرنے کی سعی کرتے رہے انہیں اس لحاظ سے اسلام شر کے خلاف مزاحمت کی ایک جاری تحریک ہے۔

جو فرد' مسلک' نظریہ' شر' شرک' آمریت' ملوکیت' ظلم' استحصال جاہ پرستی اور ارتکاز زر کا پرستار ہے وہ خود اسلام قران اور خود خدا سے متصادم وبرسرپیکار ہے ۔ چاہے اس کا تعلق بظاہر اسلام ہی کیوں نہ ہو۔ تاریخ اسلام میں بارہا ایسا ہوا ہے اور مسلسل ہورہا ہے۔ اسلام کے نام پر کچھ خود پسند بندگان حرص وطمع نے دولت واقتدار کے چرنوں میں اپنے کلہ وجبہ دستار بچھا کر مراعات کی فصلیں کاٹی ہیں ۔ ان افراد کا علی شریعتی کی نگاہ میں اسلام سے کوئی تعلق نہیں ۔ بلکہ سچے مسلمانوں کے لئے سب سے پہلا جہاد ان کے خلاف ہی کرنا لازم ہے۔

علی شریعتی علم اور عالم کی غیر جانبداری کے تصور سے اتفاق نہیں کرتا ۔ خیر اور شر کی جنگ میں غیر جانبدار رہنا درحقیقت شر کی قوتوں کو مضبوط بنانا ہے ۔ شر کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ تاریخ کی ان خاموش اور غیر جانبدار قوتوں کے رویوں کو اپنے حق میں استعمال کرتا چلا آرہا ہے۔ گویا یہ اس کا خاموش ووٹ بینک ہے ۔ نیوٹرل زندگی جانوروں اور حیوانوں کی تو ہوسکتی ہے انسانوں کی نہ ہوتی ہے نہ ہونی چاہئے۔ زندگی ایک جنگ اور جہاد ہے ۔ اس میں انسان شعور وآگہی' علم ودانش' افکار ونظریات کے اسلحہ وآھن سے لیس ہوکر اترتا ہے ۔ یہاں جنگ لڑنی پڑتی ہے ۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جنگ نہیں لڑیں گے وہ کوئی نظریہ نہیں رکھتے یا وہ کسی نظریے کے

حامی نہیں ہیں۔ وہ بھی دراصل ایک نظریہ رکھتے ہیں ۔ یعنی نظریہ بے حسی' بے عملی یہ ودیعت خداوندی جو شعور کی صورت میں انسان کو حیوان سے ممیز کرتے ہوئے ملی ہے اس کا بطلان کرنا ہے ۔ علی شریعتی ایسے انسانوں اور دانشوروں سے پناہ مانگتا ہے جو علمی غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں اور تاریخ کے قاہروں کو مجبور انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے دیکھتے رہتے ہیں۔

علی شریعتی عوام الناس اور مذہبی فضلا سے زیادہ سے زیادہ روشن فکر دانشور کو اس صورت حال کا ذمہ دار قرار دیتا ہیں ۔ اس کا کہنا ہے کہ عوام الناس قوت تو رکھتے ہیں ۔ شعور بھی رکھتے ہیں مگر وہ علوم سے پوری طرح بہرہ مند نہیں ہوتے ۔ مذہبی علما کا جو گروہ اسلامی دنیا میں اُگ آیا ہے انہوں نے مذہبی علوم کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے ۔ وہ ایک خاص قسم کی سوچ رکھتے ہیں اور اس سے آگے بڑھنا اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے ۔ وہ صرف مذہبی کاموں میں تو راہنمائی کرنے کی سعی کرتے ہیں مگر سماجی' معاشی' سیاسی اور مزاحمتی جدوجہد میں عملی قدم بڑھانے یا جنگ جوؤں کا ساتھ دینے سے گریزاں رہتے ہیں ۔ چنانچہ عوام الناس کو آمرانہ غیض وغضب کے خلاف یہ جنگ بغیر سپہ سالاروں کے لڑنی پڑتی ہے ۔ یہیں پہ المیہ رونما ہوتا ہے روشن فکر دانشور کا کام قلم اور تلوار دونوں کو بیک وقت اٹھا کر میدان میں اترنا ہے ۔ علی شریعتی خود بھی ایسا ہی دانشور تھا اور وہ یہی شعور عام بھی کرنا چاہتا تھا۔

تاریخ نے دیکھا کہ یہ مرحلہ علی شریعتی کے ایران نے ہی طے کرکے ایک نئے انقلاب کا سورج اجال دیا ۔ روشن فکر دانشوروں نے خالص تعلیمی اور مذہبی وظائف سے آگے بڑھ کر سماجی' معاشی' سیاسی اور مزاحمتی جدوجہد کے میدانوں میں قدم رکھا اور چند ہی سالوں میں شاہوں کی ڈھائی سالہ ملوکیت و آمریت کے سورج غروب کردیئے ۔ خالی ہاتھ ۔ ان کی زبان میں فکر نو تھی قلب میں جذبہ ایمانی تھا' ہاتھوں میں نور ایمانی کی تجلیاں تھیں ۔ زمین اور زمانے کے ستائے کروڑوں مستضعفین ان کے پیچھے پیچھے تھے ۔ انہوں نے عوامی قوت کے قطروں کو جمع کرکے قوت وتوانائی کا بادر ہاوس بنادیا۔

انہوں نے لبریشن تھیالوجی کا سب سے بھرپور نمونہ پیش کرکے دنیا پر یہ ثابت کردیا کہ اسلام کو تاریخ کے تاریک ایام میں آمروں کے گھروں کی باندی بنانے والوں کا دور ختم ہوگیا۔ اگر یہ بیچ کے لوگ نہ ہوں تو کسی شاہ کی جرات نہیں ہوسکتی کہ وہ اسلام کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ مگر جب ظلینوں کو اپنے ہر ظلم اور عیاشی کے لئے ایک کی جگہ سو سو فتوے ٹکے کے بھاؤ ملنے شروع ہوجائیں تو پھر سچے اسلام کو غریب انسانوں کے دلوں میں پناہ گیر ہونا پڑتا ہے۔ ان دلوں میں یہ اسلام اس وقت تک انفرادی پاکیزگی کی روپ میں بیٹھا رہتا ہے تاآنکہ سر پر کفن باندھے روشن خیال دانشور قیادت کے لئے نہ آجائیں اور ظلم کا ہاتھ روک اسے برملا چیلنج نہ کریں ہیں۔ ایسے ہی مرحلوں پر مستضعفین کے دلوں میں پناہ گیر سچا اسلام قوت بن کر ہویدا ہوتا ہے پھر دنیا کی کوئی رکاوٹ اس کا سامنا نہیں کرسکتی۔

علی شریعتی اس حوالے سے دانشوروں پر بہت بھارتی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ اب منقطع ہوچکا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کرنے کے بعد یہ ذمہ داری مسلم عوام الناس پر مشترکہ طور پر ڈال دی ہے کہ وہ قرآن اور اور نبی پاک کی بنائی اور بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے تاریخ کا سفر کریں۔ اب کوئی پیغمبر ہماری راہنمائی کے لئے نہیں آئے گا۔ اسی صورت حال سے مستکبرین نے ہی استفادہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ اب کسی پیغمبر نے نہیں آنا۔ اس لئے ہم پیغمبر اسلام کے دین کو جو معنی پہنا لیں اس کا جو نسخہ چاہیں گے گھڑ لیں۔ اس میں سے اپنی مراعات کے جتنے سبز محل چاہیں بنالیں اب کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ دولت اقتدار تو پہلے ہی ان کے پاس ہے۔ علم ودانش کو وہ شراکت یا طاقت کی بنیاد پر خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ چودہ سو سالوں سے تاریخ میں یہ مناظر عام ہوچکے ہیں کہ اسلامی دنیا میں آمریت اور سوڈو مذہبیت کا گٹھ جوڑ بڑی شاندار کامرانی کے ساتھ پھریرے لہرا رہا ہے۔ یہ مٹھی بھر اقلیت پیداوار کے سب سرچشموں پر قابض ہوکے بیٹھی ہے۔ عوام الناس جو زمین کے وارث ومالک ہیں۔ بھکاریوں کی طرح اپنی ہی ملکیت کے سامنے کچکول ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ اپنی محنت، پسینے اور لیاقت کا صلہ ان کو خیرات کی صورت میں ملتا ہے۔ علی شریعتی کے بقول ان

پیداواری رشتوں کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔ جو مالک ہیں انہیں اپنی ملکیت دوبارہ حاصل کرنی ہے ۔ اس کام میں دانشور طبقے کو ان کا ساتھ دینا ہے ۔

علی شریعتی نے اس تناظر میں ایک سوشیالوجی آف اسلام کا ڈول ڈالا اور اپنی تحریروں لیکچروں اور زندگی و شہادت کے ذریعے اس کی عملی تعبیر پیش کی ۔ علی شریعتی ۴۴ کی جگہ ۸۸ سال کی زندگی پاکر بھی مرسکتا تھا۔ مرنا تو ہر ایک کا مقدر ہے مگر اپنی موت میں جلدی کرکے علی شریعتی جیسے لوگوں نے آمریتوں کی موت کو بھی عجلت نصیب کردیا ۔ اپنا چراغ بجھانے کے ساتھ اس نے ملوکیت و سرمایہ داری کے چراغ بھی بجھا دیئے ۔ اس کی اسلامک سوشیالوجی یہی ہے

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو
کاخ امرا کے درودیوار ہلا دو

کفن باندھ سر ہتھیلی پر رکھ دانش وحکمت کے چراغ جلا کر عوامی راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دینا دانشور کے لئے سب سے بڑی عبادت ہے ۔ پڑھ پڑھ کر وہ پتھر بن جائے مگر جب تک اس پڑھے پر عمل نہ کرے اور عمل بھی ایسا جو نوع انسان کی غلامی کی زنجیریں کاٹے اور اس کو ظلم واستحصال سے نجات دلائے اس وقت تک وہ حق علم وصداقت ادا نہیں کرسکے گا۔

علی شریعتی کا یہ تصور افلاطون کے اس تصور کی یاد دلاتا ہے ۔جس کے تحت اس نے صرف مفکروں اور دانشوروں کو حکمرانی کا سزاوار ٹھہرایا تھا ۔ مگر افلاطون تو دانشوروں کو بادشاہ بنانا چاہتا تھا۔ علی شریعتی دانشوروں کو شہادت کے مرتبے پر فائز کرنا چاہتا ہے ۔ حاکمیت تو صرف اللہ کی ہے مگر وہ اللہ نے اپنے بعد عوام الناس کی اجتماعی قوت کے نام کردی ہے ۔ اس حاکمیت پر نہ دانشور قابض ہوسکتا نہ کوئی ملوک و شہنشاہ۔ حاکمیت کو عوام الناس کے پاس لوٹانا ہی دانشور کا وظیفہ حیات ہے۔ علی شریعتی قرآن کے اس پیغام کو پوری طرح سمجھ چکا تھا ۔ وہ اپنی زندگی کی شمع بجھا کر ایرانی قوم کی زندگی کا الاؤ روشن کرگیا ۔ اب اس کے افکار کی تجلیاں سارے ایران کے گھروں کو منور کررہی ہیں ۔ اسے کوئی ڈیمالش نہیں کرسکتا ۔ کیونکہ اس نے شہادت کے جام کو اپنے سامنے رکھ کر قطرہ پیا تھا۔ رضاکارانہ طور پر پیا تھا اور ان ظالموں وغاصبوں کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر پیا تھا جو اس کے پاس دولت و مراعات کے انبار لے کر آئے تھے اور اس سے اس کے وجود کی بھیک مانگی تھی مگر شریحی اپنے وجود کی تمام تر رعنائیوں کو عوام الناس کی جھولی میں ڈال کر اپنے مقدر کا خود فیصلہ کرچکا۔ علی شریحی کے والد آقا محمد تقی شریحی نے اپنے بیٹے کی شہادت کے بعد کہا تھا کہ میرے بیٹے کی ایک بڑی خصوصیت اپنے عقیدے اور نظریے کی راہ میں صبر و تحمل کے ساتھ ڈٹ جانا تھا۔ اس نے اپنی قلمی زندگی کے بالکل آغاز میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد زندگی کے آخری دم تک وہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے دامن سے لپٹا رہا۔

علی شریحی کو بغداد قدیم کے عین القوات ہمدانی (1132ء) شہید سے بڑی عقیدت تھی۔ ہمدانی جو ایک ایرانی صوفی تھا اپنے خیالات و نظریات کی صداقت اور صاف گوئی کی بنا پر دار پر لٹکا دیا گیا تھا۔ شریحی کو اسی صوفی کی زندگی میں اپنا عکس نظر آرہا تھا۔ وہ شہادت کو اپنا مقدر جانتا تھا۔ علی شریحی کا کہنا تھا کہ شک' خوف اور بزدلی نعلی دانشوروں کی نشانیاں ہیں۔ جس چیز کو انسان کی بہتری کے لئے اچھا سمجھو اور جس چیز سے رجعت پسندی کے قلعے میں دراڑیں پڑتی ہوں بے دھڑک کہہ ڈالو۔ اس لحاظ سے وہ بہت بڑا مزاحمتی دانشور تھا۔ استکبار کے سامنے حرف استنکار اور اس کے بدلے میں قید و بند اور شہادت یہی وہ راستہ ہے جس کا علی شریحی نے سوچ سمجھ کر انتخاب کیا تھا۔ یہ مقصد حیات اس کے لئے حیات سے زیادہ قیمتی تھا۔

وہ راتوں کو نصف شب کے قریب بلند آواز میں رویا کرتا تھا۔ اور جب اس کی بیوی پریشان ہوکر اٹھ بیٹھتی اور پوچھتی کہ کیا بات ہے تو وہ کہتا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علی رضی اللہ عنہ سے محو کلام تھا۔ اس نے ان سے اجازت لے لی ہے۔ وہ ان کے مشن پر چل رہا ہے اور اس نے ان کے پاس جلد ہی جانا ہے۔"

علی شریحی نامکمل موت سے ڈرتا تھا۔ یعنی ایسی موت جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اور ایسی موت جو مقصد کے لئے نہ ہو چنانچہ خدا نے ان کی مراد پوری کردی۔ مقصد اس نے چنا' جدوجہد اس نے کی' موت بعد حیات اور حیات بعد شہادت اللہ نے دے دی۔ عین جوانی کے

عالم میں زندگی کے بدلے موت خریدی اور موت کے بدلے ہمیشہ رہنے والی زندگی پائی۔ یہ زندگی کتابوں کاغذوں اور تاریخ کے صفحات سے بڑھ کر لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔

علی شریعتی نے زندگی کے ایک مرحلے پر مندرجہ ذیل وصیت کی تھی

وصیت

"میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے وصیت کردینی چاہئے تاکہ جس کے لئے میں وصیت کرنا چاہتا ہوں ان تک پہنچ سکے۔ میرے وصیت کے موضوع ومخاطب یہ لوگ ہیں

۱ سکولوں کالجوں کے طلباء
۲ مظلوم ومستضعف عوام الناس
۳ باشعور اور غیرت مند لوگ

یہ لوگ رنگا رنگ سازشوں، تہمتوں اور بربادیوں کی اس بوقلمونی کے باوصف جو میرے چاروں طرف پھیلی ہے دیکھ سکتے ہیں کہ میں کیا تھا، کیا چاہتا تھا اور میں نے کیا دیا" یادنامہ (علی شریعتی دفتر 11۔ صف 64)

علی شریعتی کی تصانیف

علی شریعتی کی تصانیف کی کل تعداد سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ اس کی تصانیف زیادہ تر اس کے لیکچروں پر مشتمل ہیں ان میں بھی زیادہ تر وہ خطبات ہیں جو اس نے حسینیہ ارشاد میں دیئے تھے۔ وہاں اس کے سننے والوں کی کی تعداد چار سے چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے لیکچر دوسرے ہی دن پمفلٹوں اور کیسٹوں کی صورت میں ایران کے کونے کونے میں پہنچ جاتے تھے۔ اس کی پہلی کتاب ساٹھ ہزار کی تعداد میں چھپی تھی اور یہ کہنا درست ہے کہ انقلاب سے پہلے کا اسی فیصد انقلابی اور مزاحمتی لٹریچر علی شریعتی کا ہی لکھا ہوا ہے۔ اگر جدوجہد کے لحاظ سے وہ ایران کا والٹیئر تھا تو کسی نظریہ حیات کے لئے لٹریچر کے انبار مہیا کرنے کے حوالے سے وہ ایران کا ملٹن تھا۔ ملٹن نظریاتی لٹریچر لکھتے لکھتے اندھا ہوگیا تھا تو شریعتی اس راہ پر چلتے چلتے شہید ہو گیا تھا۔

علی شریعتی کے اسلوب خطابت کی ایران بھر میں دھوم تھی۔ جن لوگوں نے اس کو سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب وہ بولتا تو سننے والوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوجاتیں۔ سامعین آواز برگوش بیٹھے رہتے۔ وہ بات کو بڑے دھیمے انداز میں شروع کرتا اس کے بعد معنی کی پرتیں کھلنی شروع ہوجاتیں۔ سامعین جانتے تھے کہ وہ نئی قسم کی باتیں سننے کے لئے آئے ہیں۔ ہر سامع یہی سوچتا تھا کہ جو کچھ یہ شخص کہہ رہا ہے میرے دل میں بھی ہے مگر میرے پاس کہنے کے لئے ایسے الفاظ ہیں نہ ایسا اسلوب بیان ہے اور نہ اس جیسی جرات اظہار ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے جانا یہ بھی گویا میرے دل میں ہے

غالب

ان کی تقریر مندرجہ ذیل خصوصیات کا مجموعہ ہوتی تھی۔

1۔ منطقی انداز گفتگو اور افکار میں ربط و تسلسل

2۔ تنقیدی و تجزیاتی نکتہ نگاہ ہر مفروضے کو علمی انداز میں پرکھنا

3۔ عقیدے و جذبے کا جوش و فراوانی

4۔ علم جدید اور علم قدیم دونوں کا امتزاج

5۔ عظیم بزرگوں اور جدید فلسفیوں کے بامعنی اور برمحل حوالے

6۔ اثبات، استقامت اور فکری صلابت ایک ہی تصور و نظریے کا تسلسل

7۔ نظم و ضبط اور تقریر و گفتگو کو تحریر کے انداز میں بیان کرنا یعنی دعویٰ، دلیل، ابتداء، انتہا، حوالے، ثبوت، نتیجہ، جذباتی بہاؤ کو ساتھ لے کر چلنا، مخاطبین کی نفسیات اور ذہنی سطح کا لحاظ رکھنا، وقت تعداد، دن، ماحول، موسم، کیفیت داخلی و خارجی کا لحاظ رکھنا

8۔ جذبات اور افکار کے بہاؤ میں توازن، افراط و تفریط سے پرہیز، انتہا پسندی سے گریز، سفلہ جذبات سے پرہیز، گھٹیا زبان اور تحقیر و بغاوت سے گریز، مثبت سوچوں کے چراغ جلانا، حسب حال جذبے کا برملا مگر متوازن اظہار۔

9۔ دھیما، میٹھا اور تحمل و بردباری سے مملو عبارت اور طرز تخاطب

10۔ شاعرانہ اسلوب کو نثر میں استعمال کرنا۔ خطابت (Rhetoric) کے بنیادی تقاضوں سے آگہی اور ان کا فنکارانہ اظہار و استعمال

11۔ تقریر میں جیومیٹری کا تناسق پیدا کرنا۔ اپنے قلب سے لبن کا سائنٹیفک اظہار ہویدا کرنا۔ اور سننے والوں کے اندر جیومیٹریکل ڈیزائن ابھار کر اپنے خیالات کو ان پر منطبق کرکے بات آگے بڑھانا۔

12۔ جو بات سب سے آخر میں کہنی ہے اس کو سب سے پہلے کہہ دیا جائے اور وہاں سے گفتگو کو پیچھے کی طرف لے جایا جائے۔

تصانیف کے نام

1۔ تاریخ مذہب

2۔ تہذیبوں کی تاریخ

3۔ تفہیم اسلام

4۔ نژاد نو

5۔ تاریخ اسلام

6۔ نشاۃ ثانیہ

7۔ مطالعہ اسلام کی جدلیاتی تکنیک

8۔ امید اور ناامیدی

9۔ ٹوائن بی اور علم تاریخ

10۔ کہاں سے مدد مل سکتی ہے

11۔ حضور صلعم اور تصور خواتین

12۔ سیمائے محمدؐ

13۔ شرک کی میتھالوجی

14۔ شہادت

15۔ بعد از شہادت

16۔ معاشرے میں دانشوروں کا کردار

17۔ اسلام کا تصور انسان

18۔ آج کا دور اور مسلمان خواتین

19۔ سامراجیت

20۔ بحث اور تنقید

21۔ دریافت ذات
22۔ اقدار انسانی قرآن کی رو سے
23۔ پھر ابوذر غفاریؓ
24۔ عہد نو علیؑ کو تلاش میں
25۔ ثقافت اور نظریہ
26۔ اقدار کی تبدیلی
27۔ فکر کی جہتیں
28۔ ہم گناہ گار ہیں اے ماں اور باپ
29۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے
30۔ ایک متفکر مسلمان کے خیالات
31۔ اہل تشیع کی ذمہ داریاں
32۔ توقعات
33۔ تفہیم مذہب و تاریخ کا کردار
34۔ نشاۃ ثانیہ کی سماجی و اقتصادی بنیادیں
35۔ فاطمہؑ فاطمہؑ ہے
36۔ مشینوں کی غلامی
37۔ قلب زندہ کی عظمت
38۔ ذمہ دار دانشوروں کے لئے پیغام
39۔ آغاز کہاں سے ہو
40۔ اہل بیت کی یادمیں
41۔ معیشت ایک مکمل پارٹی ونظام فکر
42۔ حضرت علیؑ اور رفقائے علیؑ کے مصائب

43۔ محمدؐ عربی کے ساتھ ایک مہینہ
44۔ عقیدہ اور سائنس
45۔ خواتین کے سماجی حقوق
46۔ انسانیت کے چار زنداں
47۔ بیٹے کے نام خط
48۔ والد کے نام خط
49۔ قرآن اور کمپیوٹر
50۔ شہر شہادت پر الوداعی نگاہ
51۔ حضرت ابراہیم سے ایک عہد
52۔ عبادت
53۔ اقبال عصر حاضر کا شاعر و عمل
54۔ دانشور کی سماجی ذمہ داریاں
55۔ ان گنت صفر اور ایک کا ہندسہ
56۔ فلسفہ تاریخ اور مذہب ابراہیم علیہ السلام
57۔ امام حسینؓ اور میراث آدم
58۔ صحرا (کویر)
59۔ ہجرت اور تہذیب
60۔ تہذیب اور جدیدیت
61۔ نئی تہذیب اور تصور آدمیت
62۔ انسان کی تنہائی۔ اکیلا انسان
63۔ مذاہب کے زوال کے اسباب
64۔ زندہ رہنے کے مصائب

65۔ سائنس ایک نیا علم

66۔ فلسفہ عبادت

67۔ امام علیؑ اور اتحاد کا پیامبر

68۔ حضرت علیؑ تنہا ہیں

69۔ حضرت علیؑ انسان مکمل

70۔ آج کے دور کی ضرورت علیؑ ہیں۔

71۔ فلسفہ وجودیت

72۔ انسانی اور تاریخ

73۔ سائنس کی میتھاڈالوجی

74۔ اسلام میں مقام تاریخ

75۔ درمیانی مکتب فکر

76۔ بلخ شہر کیوں اہم ہے

77۔ حضرت ابوذر غفاریؓ

78۔ حضرت سلمان فارسیؓ

79۔ گوگیز (Gughes) کے ساتھ سائنسی بحث

80۔ خراسان (تاریخ و جغرافیہ)

81۔ الجزائری انقلاب کا پانچواں سال

82۔ حضور صلعم کی شخصیت

83۔ کل کی تاریخ پر ایک نگاہ

84۔ امت اور امامت کی سوشیالوجی پر ایک نگاہ

85۔ شیعیت کی سچی تصویر

86۔ غیر مسلم، منافق اور بھٹکے ہوئے انسان

87۔ مترجمہ الفاروق کی نقاب کشائی [illegible]

88۔ انسان خدا کا نمائندہ (LLIW) [illegible]

89۔ مادی توقعات اور ایلیٹ و فن کا کردار [illegible]

90۔ رضا اور عبادت [illegible]

انسان اور اسلام

انسان اور اسلام کے عنوان سے ڈاکٹر ظفر بھٹی نے ایک لیکچر پٹیریم کالج آباد لاہور کے مقام پر دیا جس میں انہوں نے اسلام کی رو سے انسان کے مقام کی وضاحت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آفاقی مذاہب کی زبان ہمیشہ علامتی ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک ہی انداز میں ایک زمانے کے لوگوں سے کہی ہوئی بات دوسرے زمانے کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اس لئے ایسے تمام پیغامات عالمگیر علامتوں کی زبان میں محفوظ کئے جاتے ہیں۔ صرف وہی ادبی شاہکار زمانے کی دستبرد سے بچ سکے ہیں جن کا اسلوب علامتی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدم و حوا کہانی کے بیان کے لئے علامتی اسلوب استعمال ہوا ہے۔ انسان کے بارے میں اسلام میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ چنانچہ انسان ایک خاص حد کے اندر رہتے ہوئے تخلیق کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے لیکن یہ لازم ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف ہرگز عمل نہ ہو۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو انسان کا بھائی قرار دیا ہے۔ یہ اس تصور مساوات سے مختلف ہے جو مغرب میں رائج ہے۔ انسان برابر تو ہیں مگر یہ برابری بھائیوں والی برابری ہے۔ جہاں چھوٹا بڑا، کمزور توانا، غریب امیر ہونا وجہ امتیاز نہیں رہتا۔ سب بھائی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوتے ہیں۔ ایک گھر میں پلتے بڑھتے ہیں۔ ان کی تاریخ جغرافیہ ماحول خوراک پس منظر مذہب رہن سہن ایک جیسا ہوتا ہے۔

انسان کی افضلیت کی بنیاد اس کا کردار و عمل ہے۔ بنیادی طور پر وہ مٹی کا پتلا

ہے مگر وہ جتنا جتنا اپنے اندر اوصاف ربانی پیدا کرتا جائے گا۔ اتنا اتنا دوسرے بھائی سے ممیز ہوتا جائے گا۔ انسان اللہ تعالیٰ کا ارادہ (WILL) رکھتا ہے۔ اس کو اشیا کا علم (سائنس) دیا گیا ہے۔ کچھ مذاہب کائنات میں نیکی بدی (یزدان واہرمن) کی قوتوں کا بیک وقت وجود تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام صرف ایک قوت یعنی خدا کی قوت کو تسلیم کرتا ہے۔ بدی کی جو قوت ہے وہ باہر نہیں انسان کے اندر ہے اور اسی کے خلاف انسان نے جدوجہد کرنی ہے۔ اسلام کی رو سے شیطان خدا کا مدمقابل نہیں انسان کا حریف ہے۔ انسان مختلف روحانی اقدار اور دنیاوی امور دونوں سے متعلق ہے اس کے کئی روپ ہیں اور اسلام ان کے سب رویوں کے لئے راہنمائی فراہم کرتا ہے۔

مرد کامل

اس لیکچر میں ڈاکٹر شریعتی نے بتایا ہے کہ انسان کامل ایک ایسی شخصیت ہے جس میں مٹی اور ریت کی خصوصیات پر روحانی اثرات غالب آچکے ہوں گے۔ ایسا انسان اپنے سفلی جذبات کو زیر کر چکا ہوگا یہ انسان ربانی خصائص کا مالک بن جائے گا۔ یہی انسان اکملیت کی منزل کی طرف رواں ہوگا۔ انسان ایسا ہونا چاہئے مگر وہ ایسا نہیں ہے۔ یہ انسان ان تہذیبوں کا انسان نہیں ہے جو انسان کو خانوں میں بانٹ دیتی ہیں۔ یعنی سپاہی الگ' عالم الگ' تاجر الگ' محنت کش الگ۔ یعنی انسان بازوؤں کا زور آور ہوگا تو علم ودانش میں بودا ہوگا جو علم ودانش کا حامل ہوگا وہ کمزور اور پھس پھسا ہوگا۔ اسلام کسی ایسے انسان کا تصور پیش نہیں کرتا جو کل جہاتی نہ ہو۔

اسلام کا مرد کامل وہ ہے جو عین فطرت کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے اور خدا کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ انسانیت کی رہ سے خدا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ انسانیت کو بھلا کر خدا کا طلبگار نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہاتھ میں قیصر کی تلوار اور دوسرے میں عیسیٰ علیہ السلام کا دل رکھتا ہے۔ وہ سقراط کی طرح دماغ رکھتا ہے تو منصور حلاج کی طرح خدا کا

عاشق ہے۔ وہ خدا کے حسن اور اس کی فطرت (نیچر) کے حسن دونوں سے آگاہ ہے۔ وہ زمینی خداؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے اور ابوذر غفاریؓ کی طرح بھوکے ننگے انسانوں میں بغاوت کے بیج ہوتا ہے وہ جہاد اور اجتہاد دونوں پر کارفرما ہے وہ ایسا انسان نہیں جسے ماحول نے بنایا ہے بلکہ وہ ایسا انسان ہے جو ماحول کو خود تخلیق کرتا ہے۔ اس نے تاریخ' موروثیت' فطرت اور ماحول کی قید سے اپنے آپ کو آزاد کروانے کے بعد خود کو اپنی قید سے آزاد کروالیا ہے۔ اس نے انانیت کو تسخیر کرکے اس کی تعمیر نو سے اپنی انا اور خودی کی تعمیر مکمل کرلی ہے۔ وہ نیکی کرکے کسی پر احسان نہیں کرتا۔ وہ خود سراپا نیکی ہے۔

ادب وفن اس کے ہاتھوں میں دل بہلاوے کے کھلونے نہیں ہیں۔ وہ جنسی بھوک کا شکار۔ نہیں فن کو وہ اللہ کی ودیعت خیال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی تخلیقی صلاحیت عطا کی تاکہ وہ اس دھرتی کو ایک دوسری جنت میں متشکل کرے۔ اسمیں نئی قسم کی زندگی' خوبصورتی اور فکر و خیال اور روحانی قدروں کو پیدا کرے۔ نئی زمین و آسمان پیدا کرے۔ اس انسان میں جسن خیر اور صداقت کی قدریں مجتمع ہوتی ہیں۔ وہ محکوم نہیں حاکم ہے اور فرشتوں کا شکار کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ انسان قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں سے متصف ہوکراور تاریخ کا ایک لمبا سفر طے کر اب قدرت کے اعتماد کا مستحق ہوگیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں خدا کا نائب بننے کا اہل ہے بشرطیکہ وہ ادراک رکھتا ہو ورنہ وہ پتھر ہے کیڑا مکوڑا ہے

اسلام اور اجتماعیت

اس لیکچر میں ڈاکٹر شریعتی لفظ امہ کی تشریح وتوضیح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس لفظ کا مادہ ام ہے جس کا مفہوم ہے راستہ اور ارادہ۔ اس لحاظ سے امہ سے مراد ایسی سوسائٹی ہے جس میں ایک جیسا عقیدہ رکھنے والے انسانی گروہ ایک قسم کا ارادہ باندھ کر ایک ہی مقصد حیات کے حصول کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ امہ کے تصور کی بنیاد

معاشیات ہے کیونکہ جس کی بادی زندگی نہیں ہوگی وہ روحانی زندگی ہے بھی عاری ہوگا۔ امہ کے سماجی ڈھانچہ کی بنیاد مساوات' انصاف اور عوامی ملکیت کے تصور پر ہوگی یہ ہابیل کا نظام ہوگا جس میں رہنے والے سب لوگ مساوات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے بھائی ہوں گے۔ یہ تو بنیاد اور ڈھانچہ ہوگا مگر مقصد ان سب چیزوں سے اعلیٰ اور ارفع ہوگا اور یہ مقصد ہی ہے جو کسی چیز کو بڑا یا چھوٹا بناتا ہے۔ اسلامی معاشرے کی اجتماعیت کی راہنمائی ایسی قیادت کو حاصل ہوگی جو نیکی اور تقویٰ کی بنیاد پر قیادت کی حقدار ہوگی۔

توحید اور ورلڈ ویو

ڈاکٹر شریعتی اس لیکچر میں توحید کو بطور ایک عالمگیر تصور کے دیکھتا ہے کیونکہ اسلام بھی توحید کو اسی تناظر میں پیش کرتا ہے اس کے مقابلے میں شرک ہے جو دنیا کو انتشار اور بدنظمی کا شکار بنا دیتا ہے۔ توحید دنیا کو ایک ربانی ایمپائر کی صورت میں دیکھتی ہے جبکہ شرک اسے ایک فیوڈل سسٹم بنا دیتا ہے۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ وہ کائنات کو ایک زندہ و متحرک وجود مانتا ہے جو اپنے آپ سے پوری طرح باخبر ہے۔ دنیا کی تمام کتابوں میں قرآن ہی ایسی کتاب ہے جو تمام اشیائے فطرت و ظاہر قدرت کو نشانیاں قرار دیتا ہے۔ اور یہ تصور آج کی جدید سائنس کے بہت قریب ہے۔ دنیا کی تمام کثرتیں توحید کی وحدت میں شیرازہ بند ہو جاتی ہیں۔ اسی توحید کے تحت انسان صرف ایک قوت کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس کا ایک قبلہ ایک کعبہ ایک منزل ایک ہادی اور ایک ہی رب ہے۔ ایک اللہ ہی سچ ہے۔ تمام خوف' حزن اور مایوسیاں شرک کا درجہ رکھتی ہیں توحید کا دامن تھامتے ہی ساری سیاھیاں چھٹ ہو جاتی ہیں۔ توحید انسان کو آزاد' خود مختار صاحب احترام بنا دیتی ہے۔ ایک سجدہ کرنے کے بعد وہ سارے سجدوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

سماجی جدلیات Dialectics

یہ لیکچر بہت ہی معنی آفریں اور انقلاب پرور ہے۔ اس تحریر میں ڈاکٹر علی شریعتی نے قرآن کی حقیقی روح کو جدید جدلیاتی تصورات کے حوالے سے سیدھے سادے الفاظ میں پیش کیا ہے اس میں کارل مارکس کے فلسفہ اشتراکیت کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اس لیکچر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں والناس یعنی عوام PEOPLE کو خدا کا ہم معنی ثابت کیا گیا ہے۔ اور قرآن کے حوالے دے کر اس تصور کی وضاحت کی گئی ہے۔

ڈاکٹر شریعتی کہتا ہے کہ تاریخ اور سماج کی طرح سوشیالوجی بھی طبقاتی جدلیت پر مبنی ہے سماج دو طبقوں پر مبنی ہوتا ہے جو ہابیل اور قابیل کے پیروکار کہلائے جاسکتے ہیں۔ تاریخ تو صرف وقت کی بنائی ہوئی لکیروں پر سفر کا نام ہے۔ یہ سفر انسان کرتے ہیں اور ان انسانوں کے دو طبقے بنے ہوئے ہیں۔ عصری سماجی تاریخ کے اس سفر میں وقت اس حصے کا نام ہے جو ہمارے سامنے ہے مگر اس سامنے کے حصے میں پورا ماضی اپنے تسلسل کے ساتھ مدغم ہوتا ہے۔ علی شریعتی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی نگاہ میں انسانی سماج کے دو بنیادی ڈھانچے ہیں اور ان کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ طبقاتی سماج کے حوالے سے وہ کارل مارکس کی تاریخی اور مادی جدلیت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تاریخ کا سفر سات سطحوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔

1۔ قدیم ترین سوشلزم: جب انسان برابر تھے زمین پانی جنگلات پر ان کا ساتھا قبضہ اور تصرف تھا۔ اس ڈھانچے کی بنیاد مساوی ملکیت پر تھی۔ ہر کوئی آزاد خود مختار اور مساوی تھا۔ کوئی مالک و آقا نہ تھا۔ سب مالک تھے۔

2۔ دور غلامی: اس دوران دو طبقے بنے شروع ہوئے۔ انسان پراپرٹی بن گیا۔ کچھ لوگوں نے زور زبردستی اور ناانصافی کے ذریعے ذرائع پیداوار پر قبضہ کیا اور دوسرے کمزور

انسانوں کو اپنا غلام بنا ڈالا۔ اب نیا تعلق انسانی تعلقات کا ابھرا۔ اب مالک اور آقا محتاج و غنی کے تصورات پیدا ہوئے۔ انسان کے استحصال کا یہ سب سے بدترین دور ہے۔

3۔ دور سرف ڈم SERFDOM ۔ اس دور میں انسان بظاہر آزاد نظر آتا ہے مگر درحقیقت وہ زمین کا غلام بن جاتا ہے اور زمینوں کے ساتھ ہی بکتا اور خریدا جاتا ہے یہ غلامی کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے انسان کا انسان سے صرف اقتصادی رشتہ ہے۔

4۔ دورجاگیرداری Feudalism ۔ اس دور میں پیداواری رشتے تبدیل ہوجاتے ہیں۔ زمین کا مالک سیاسی قوت کا حامل بن جاتا ہے۔ اور وہ محنت کش کے معاشی استحصال کے ساتھ اس کا سیاسی استحصال بھی کرتا ہے۔

5۔ بورژوائی دور ۔ یہ دلالوں کا دور ہے جو محنت نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی محنت پر پلتے ہیں دکاندار' تاجر' شہری ساہو کار دولت کو جمع کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اس دور میں انسان کو سیاسی حقوق ملتے ہیں۔ جمہوریت آتی ہے مگر اس کے نتیجے میں بھی استحصالی طبقے ہیں حکمران بن جاتے ہیں۔

6۔ سرمایہ داری نظام (کیپٹلزم) ۔ سطح نمبر2 سے لے کر سطح نمبر5 تک سرمایہ' زمین' محنت' اثاثے اکٹھے ہوکر چند شہری سرمایہ داروں کے ہاتھوں پر چلے جاتے ہیں۔ بڑی انڈسٹری چھوٹی انڈسٹری' ہاتھ کی محنت اور انسانوں کی اکثریت کو ہڑپ کرلیتی ہے۔ بنک' اسٹاک ایکسچینج' بیمہ کمپنیاں' چیک' ڈرافٹ اور زرمبادلہ کی منڈیاں سج جاتی ہیں۔ مشینیں سرمایہ داروں کے قبضے میں اور محنت کش خالی ہاتھ روزگار کی بھیک مانگتا پھرتا ہے ۔ اس کے ہاتھ پھاوڑہ' ہل' اوزار' کچھ بھی نہیں رہا۔ سب کچھ فیکٹری میں' فیکٹری کی چابی مالک کی جیب میں اور کل سرمایہ بنک میں رکھا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار مسلح اور محنت کش نہتا و بے یارومددگار ہوجاتا ہے۔

7۔ ظلم کی انتہا ہوجاتی ہے تو مظلوم ایک انجانی قوت سے لیس ہوکر سامنے آتے ہیں

اور اپنی بقاء کے لئے آخری معرکہ لڑتے ہیں۔ اس جنگ میں فتح اکثریت کی ہوتی ہے۔ مٹھی بھر سرمایہ دار شکست کھاجاتے ہیں اور انسان اپنے ارتقا کی پہلی سیڑھی پر واپس پہنچ جاتا ہے۔ جب وہ آزاد خود مختار اور برابر تھا۔ وہ زمین پر موجود خدا کی نعمتوں کا مشترکہ طور پر مالک اور وارث بن جاتا ہے علی شریعتی کہتا ہے کہ اس تجزیئے میں ہم نے دیکھا کہ استحصال کا ڈھانچہ تبدیل نہیں ہوا۔ صرف اس کی شکلیں' نام اور چہرے بدل گئے ہیں۔ فرعون' خسرو' اور بلعم باعور چہرے بدل بدل کر آتے ہیں۔

قرآن میں ان تینوں چہروں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور خداوند تعالیٰ نے دنیا کے تمام مظلوموں کو یکجا ہوکر والناس کی صورت میں انکا مقابلہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اسلام کی رو سے ہابیل وقابیل نام کی دو طاقتیں روز اول سے ایک دوسرے سے متصادم ومتحارب ہیں۔

طبقاتی جنگ میں اللہ تعالیٰ اور والناس (مستضعفین) ایک صف میں ہوتے ہیں جبکہ فرعون' خسرو و بلعم باعور مخالف سمت میں اللہ اور اس کے مظلوم بندوں سے برسرپیکار ہوتے ہیں قرآن میں اللہ اور والناس ہم معنی انداز میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً" کہا گیا کہ تم اللہ کو قرض دو۔ (64:17 قرآن) اس کا مطلب ہے کہ تم والناس کو قرض دو اللہ کو کسی کے قرض کی کوئی حاجت نہیں۔ تمام سماجی معاملات میں والناس کا ذکر اللہ سے متعلق نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حاکمیت اللہ کی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ حاکمیت عوام الناس کی ہے۔ نہ یہ کہ ان کی جو اپنے آپ کو دنیا کا خدا بنائے بیٹھے ہیں۔ اللہ کی اپنی حاکمیت متنازع نہ ہے نہ ہوسکتی ہے کوئی اسے مانے یا نہ مانے اور کسی کے ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کون ہے جو مشرق سے سورج نکال کر مغرب میں ہر روز غروب کرسکتا ہے حاکمیت تسلیم کروانی ہے عوام الناس کی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی حاکمیت قرار دیا ہے۔ اسی طرح کہا گیا کہ تمام زمین جائداد اللہ کی ملکیت ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے اللہ کو پلاٹ پلازے اور پجارو کی

ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ تمام پراپرٹی عوام الناس کی ہے ملکیت ہے فرعون ہامان شداد کی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے دین اللہ کا ہے یا اس کی ملکیت ہے تو اس سے مراد بھی یہی ہے کہ دین بھی مستضعفین کی ملکیت ہے۔ چند اجارہ داروں کی لونڈی نہیں جسے وہ اپنی مراعات کے محل تعمیر کروانے کے لئے استعمال میں لاتے رہیں۔

اسلام نے پیشہ ور ملوکیت کے ساتھ پیشہ ور ملائیت کے خلاف بھی جدوجہد کی ہے اسلام میں مذہبی سکالرز کی گنجائش ہے مگر مذہب فروش کا کوئی تصور نہیں ہے۔ کوئی بھی مسلمان اپنی صلاحیت محنت اور ذہانت کے ذریعے مذہبی سکالر بن سکتا ہے۔ مگر اسے مذہبی طبقہ یا ٹھیکیدار بننے کی اجازت نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دین صرف خدا کی ملکیت ہے اور خدا ساتھی ہے مستضعفین کا۔ اسلام میں عوام کا ایک خاص اور واضح مفہوم ہے۔ یہ کسی فرد کا نام نہیں بلکہ اکثریت کا نام ہے قرآن پاک اللہ کے نام بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے اور والناس (عوام الناس) پر ختم ہوتا ہے۔ کعبہ اللہ کا گھر ہے مگر قرآن اسے عوام الناس کا گھر قرار دیتا ہے۔ لفظ والناس مفرد ہے مگر جمع کا مفہوم دیتا ہے اس کا مفرد مفہوم ہے ہی نہیں۔

علم الانسانیت (انتھروپالوجی)

تخلیق آدم خدا اور ابلیس کا تضاد' روح اور مٹی کے تصورات۔ اس مقالے میں ان موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ شریعتی کہتا ہے کہ جب قرآن انسان کے بارے میں حیاتیاتی انداز میں گفتگو کرتا ہے تو وہ نیچر (سائنس) کی زبان استعمال کرتا ہے یعنی خون' قطرے' جرثومے حمل وغیرہ لیکن جب وہ انسان کی روحانی تخلیق کا ذکر کرتا ہے تو پھر علامتی زبان کا استعمال کرتا ہے۔ درحقیقت انسان مجموعہ ہے کیچڑ اور روح کا۔ مٹی علامت ہے جمود وسکوت اور بے حسی کی جبکہ روح نشاندہی کرتی ہے

ترجیح اور تکمیل کی۔ انسان بیک وقت آزاد و خودمختار بھی ہے اور دو انتہاؤں کے درمیان متحرک ایک امکان بھی یعنی خدائی صفات اور شیطان خصائل کے حامل بننے کا بیک وقت امیدوار۔ اگر وہ تمام اسرار سے اپنی سعی کے ذریعے آگاہ ہوجاتا ہے تو فطرت کا حاکم حکمران بن جاتا ہے۔ جس کے سامنے تمام اشیائے کائنات سجدہ ریز ہوں گی زمین آسمان چاند ستارے، شجر حجر فرشتے سب سرنگوں ہوں گے۔ اگر وہ محض حیوانی زندگی گزارتا ہے تو پھر وہ کیڑا مکوڑہ ہے حقیر و فقیر ہے۔

اسی لیکچر میں علی شریعتی ہیگل کی جدلیت کے اصولوں کو بھی انسانی تخلیق و ارتقاء کے عمل پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کا روحانی نصف وجود اس کا تھیسس (THESIS) ہے۔ اس کا دوسرا حیوانی نصف جو اس کی روحانی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے وہ اس کی انٹی تھیسس (ANTITHESIS) ہے ان دونوں کے ملاپ، تصادم اور ایک پر دوسرے کی فتح یابی سے ایک انسان یا شیطان کا مجموعہ (SYNTHESIS) وجود میں آتا ہے۔ یہ تصادم ازل سے جاری ہے۔ انسان ان دونوں انتہاؤں کے وسط میں ایک راستے پر دونوں کے امکانات لئے کھڑا ہے۔ وہ راستہ بھی ہے مسافر بھی ہے اور خود سفر بھی ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں مشاہدہ ہے کس حساب میں؟

خدا انسان کے اندر ایک امکان ہے۔ جبکہ اس کی حیوانیت ایک حقیقت ہے۔ کیچڑ اور خدا کے درمیان کا جو سفر ہے وہ وہی ہے جو انسان خدا کی تلاش میں صرف کرتا ہے۔ راستہ اس کو بتا دیا گیا ہے۔ راستہ مذہب ہے۔ مذہب کا مطلب ہی راستہ ہے اگر انسان سڑک کو ہی پوجنا شروع کردے تو منزل تک کیسے اور کب پہنچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے پجاری صدیوں سے سڑکوں پہ بیٹھے سڑک کو ہی پوج رہے ہیں۔ ان کو منزل کبھی مل ہی نہیں سکتی۔ جب تک وہ سفر کرکے آگے نہ بڑھیں وہ ایک مقام پر ٹھہرے رہیں گے۔ نماز اور دوسری

رسومات کو ہی مذہب سمجھنے والے خود یا دوسروں کو کیسے منزل کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ یہ نشانات ہیں منزل نہیں۔دین کا مطلب بھی راستہ یا راہ گزر ہے۔ شریعت کا مطلب ہے ایسا راستہ جو پیاسوں کو دریا کے کنارے لے کرجاتا ہے۔ امہ کا مطلب وہ انسانی گروہ ہے جو ایک مقصد کے تحت ایک واحد راہنما کی قیادت میں ایک ہی راستہ پر چلتے ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہو۔اس لحاظ سے مذہب ہی وہ راستہ ہے جو کیچڑ کو خدائی صفات کی طرف لے جانے کی تاب رکھتا ہے۔ اگر ہم سڑک کے بیچ بیٹھ کر سڑک کی ہی شان میں قوالیاں کرتے رہے تو کبھی کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

فلسفہ تاریخ

فلسفہ تاریخ نامی لیکچر میں بھی شریعتی ہابیل وقابیل کو قرآن کہانی کے ذریعے تاریخ کے مختلف ادوار کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ تاریخ وقت کے بہتے ہوئے دریا میں ایک معینہ دھارے کا نام ہے انسان چھوٹی سطح پہ تخلیق کا ایک بڑا معجزہ ہے۔ انسان اسی وقت کے دریا اور تاریخ کے دھارے میں شامل ہوکر اپنی تکمیل کی طرف بڑھتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کا مظہر ہے۔ تاریخ انسانی ہابیل وقابیل کے درمیان مسلسل ومستقبل آویزش کا نام ہے۔ فی الحال فتح قابیل کی ہوتی چلی آرہی ہے کیونکہ وہ دھوکے باز ہے۔ سرمایہ دار ہے اور ذرائع پیداوار پر اس کا قبضہ ہے۔ انسان کا کام اس قابیل کی شکست سے ہم کنار کرنا ہے۔ تاریخ کے ابتدائی ایام میں انسان آزاد پرندوں کی مانند تھے ڈاروں کی صورت میں اڑتے پھرتے جہاں پانی خوراک ملتی وہاں اترجاتے۔کھاتے پیتے مزے اڑاتے۔ ملکیت کا کوئی جھگڑا نہ تھا پھر جوں جوں ملکیت کا جھگڑا پیدا ہوا۔ پرندے ایک دوسرے کو نوچنے لگے۔ کونج کبوتر مرغابی کی جگہ گدھ الو اور باز پیدا ہونے لگے۔ انسان لالچ وطمع کے جال میں گرفتار ہوکر آزادی' مساوات اور انصاف کی قدروں کو پاؤں کے نیچے

روند بیٹھا ہے۔ اس لیکچر میں شریعتی قرآن کی آیات (28:5) کے حوالے سے مستضعفین انسانوں کو جو ہابیل کی معصومانہ راہ پر رواں ہیں نوید دیتا ہے کہ آخری فتح تمہاری ہوگی۔ تم ہی زمین کے وارث ہو اور یہ وراثت اور امامت تمہیں مل کر رہے گی۔

فن نجات دھندہ کے انتظار میں ہے

یہ علی شریعتی کا ایک اور لیکچر ہے جو ۱۹۷۲ء میں پیرس میں دیا گیا جس میں اس نے فن کی ماہیت اور فنکار کی کومٹمنٹ کو اجاگر کیا ہے۔ فن درحقیقت خالق اور اس کی تخلیق کاربندے کے درمیان ایک ربط کا نام ہے۔ فن کار بندے اور رب کے مابین ہونے والے معاہدے کو اپنی تخلیقات کے ذریعے روشن کرکے پیش کرتا ہے۔ فن ایک سماجی خدمت ہے فنکار خود دکھ سہتا ہے مگر اپنے پیام کو خدا کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ اسلام کا مرکز توحید ہے مگر فن میں اس کا اظہار کثرت کے ذریعے ہوتا ہے۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ ہمیں اپنے اندر ڈوب کر سراغ زندگی حاصل کرنا چاہئے اور اپنی اصلی ثقافتی بنیادوں کو استوار کرنا چاہئے۔ اس کا آغاز اس طریقے سے ہوگا کہ ہم اپنے آپ کو اس مرعوبیت کے چنگل سے نکالیں جس میں ہم مغرب کے زیر دام آنے کے بعد پھنس گئے ہیں۔ ان کی اقدار اور ماڈل اور ہیں ہماری اقدار اور معیار اور ہیں۔ مگر اپنی اصلیت کی طرف لوٹنے کا جو تصور ابھرا تھا اس نے ایسی صورت حال اختیار کرلی ہے کہ یہ رجعت قہقہری نظر آنے لگا ہے یعنی یہ تصور پرانی فرسودہ' ازکار رفتہ' جاہلانہ اور بنیاد پرستانہ رسوم وروایات کے احیا سے عبارت ہوگیا ہے۔ علی شریعتی اس بات کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس تصور کی غلط توجیح ہے۔

اس کے نزدیک اصلیت کی طرف لوٹنے کا مفہوم اس سرچشمہ حیات وتوانائی کی طرف لوٹنا ہے جس نے ازمنہ قدیم میں فن تہذیب کو جنم دیا تھا۔ یہ اپنی ثقافت کے ترقی

پسندانہ' فعال اور تعمیری عناصر کو بار دگر دگرفت میں لینے کا نام ہے۔ماضی سے رابطہ جوڑنے کا مطلب ماضی کی تاریکیوں کو زندہ کرنا نہیں بلکہ ماضی کی روشنیوں سے فیض یاب ہونا ہے جس طرح سارا مستقبل تابناک نہیں ہوتا اس طرح سارا ماضی تاریک نہیں ہوتا۔ مغرب پرستی نے ہم کو یہی باور کرایا ہے ہمیں اسی مفروضے سے باہر نکلنا ہے۔ ہم ماضی کی طرف لوٹ کو اس میں سے نسل پرستی یا تعصب کی روایات کو حاصل نہیں کریں گے بلکہ گزری ہوئی انسانیت سے اپنا رابطہ جوڑیں گے۔ اس طرح ہم تہذیب حاضر کی اندھی غلامی سے نجات پالیں گے اور اس انسانیت کے دھارے میں شامل ہوجائیں گے جس نے ماضی کو حال اور حال کو مستقبل بنایا ہے۔ اس طرح ہم تعصبات توہمات' مجہولیت اور رجعت پسندی کی دباؤں سے بھی دامن چھڑالیں گے جو ہماری تہذیب وترقی کا راستہ روکے کھڑی رہتی ہیں۔ اس کے لئے ہمیں سائنسی تحقیق کا دامن تھامنا ہوگا۔

ہمارا ثقافتی ورثہ فن کی اعلیٰ قدروں سے مالا مال ہے مگر اس کے لئے ہمیں اپنے فن وہنر کو عالمی تناظر میں دیکھنا اور پرکھنا ہوگا۔ فن زندگی کا ایک زندہ حصہ ہے۔ اسکی حیثیت ہرگز ثانوی نہیں ہے۔ آج کی دنیا شاہی محلات' اور اشرافیہ کے اللوں تللوں سے بہت آگے گزر کر انسانی سمندر میں داخل ہوچکی ہے۔ آج کی دنیا عوام الناس کی دنیا ہے اس حوالے سے آج کا فن افیون کی گولی نہیں رہا۔یہ انقلاب کا اعلان اور تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ اپنی اصلیت کی طرف لوٹنے کا مطلب ہے اپنے آپ کو پہچاننا۔ اپنے آپ کو وہی پہچان سکتا ہے جو دوسروں کو پہچانتا ہو۔ اپنی زبان وہی سمجھ سکتا ہے جو دوسروں کی زبان جانتا ہو۔ اپنی تاریخ ثقافت اور فن سے آگہی اس وقت ممکن ہے جب انسان عالمی تاریخ ثقافت اور ورثے سے واقف ہوگا۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ مغرب کا مقابلہ کرنے کے لئے مغرب کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ہم اپنی خامیوں کو مغرب کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ہماری بربادی تقلید کی وجہ سے نہیں بلکہ مغرب کی اچھائیوں کو نہ سمجھنے اور ان سے دور رہنے میں ہے۔ ہم مشرق کو سمجھے نہ مغرب کو چنانچہ ہم زیرو بن گئے۔ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔

شریعتی نے اس گفتگو کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ سچا فن خود ایک مذہب کا درجہ رکھتا ہے یہ فن اعلیٰ ترین آفاقی صداقت ہے جو انسانیت کی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ مگر آرٹ کا مرتبہ ومقام خود ان سوداگر آرٹسٹوں نے گرایا ہے جنہوں نے آرٹ کی نشوونما نہیں کی اور اس کا مقام نہ سمجھ سکے۔ اور جھوٹے فن کو بازاروں میں فن کے نام پر بیچنا شروع کردیا۔ جھوٹا فن دیکھو تو سمجھ لو کہ سچا فن بھی موجود ہے۔ کھوٹے سکے سے ہی کھرے کی پہچان ہوسکتی ہے۔ کھوٹے فن اور سکوں کے رواج کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کھرے سکوں کی تلاش سے ہی ہاتھ اٹھالیں۔

علی شریعتی کہتا ہے کہ میری نگاہ میں فن تفہیم انسان کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ انسان کو سمجھ لیں تو آرٹ اور حسن دونوں کی سمجھ آجاتی ہے۔ صحیح انسان وہ ہے جو مسلسل اور مستقل حالت تغیر میں ہوتا ہے پوری انسانیت ایک مکمل صورت میں تاریخ کے صفحات پر موجود نظر آتی ہے۔ انسان مجموعہ صفات ہے۔ اس کے پاس علم ہے اور علم کا مطلب ہے مسلسل سوچ وبچار، مستقل جدوجہد اور ادراک حقیقت وتصور۔ انسان کی داخلی زندگی تین عناصر سے عبارت ہے۔ یعنی عقل سوچ اور تاثر۔ مگر سب عقل کے دائرے میں آتے ہیں ہر انسان دنیا کو اپنی عقل کی عینک سے ہی دیکھتا ہے۔ انسان جب سچر میں موجود ہوتا ہے تو وہ حیوانوں کے ساتھ رہتا ہے۔ انسان کی اپنی حیوانی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ وہ انکو صرف اس لئے پورا کرتا ہے کہ ان میں اس کی جسمانی حیات کا راز مضمر ہے مگر اس کے بعد وہ ان کا محتاج نہیں رہتا۔ اگر انسان اس کے بعد بھی اپنے آپ کو اپنی ضروریات کا محتاج بنائے رکھے اور محض اپنی حاجات کے زندان میں مقید ہوجائے تو وہ درجہ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ انسان حیوانوں سے اسی طور الگ ہوسکتا ہے کہ وہ اعلیٰ تصورات ونظریات کا حامل ہو اور ان کے حصول کے لئے کوشش کرے۔ سائنس انسان کی اس جدوجہد کا اظہار ہے جو اسے موجودات کے حصول کے نزدیک کرتی ہے۔ جبکہ آرٹ اس جدوجہد کا نام ہے جو ان امکانات تک لے جاسکتی ہے جو ہونے چاہئیں مگر ہیں نہیں گویا یہ آئیڈیل کی تلاش کا نام

ہے۔ انسان دکھوں کی زندگی میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے فن کے ذریعے ارض وسما کے ساتھ ایک ربط استوار کرتا ہے۔ اس طرح فن تنہائی کے احساس کو کم کرنے کا ذریعہ ہے۔ انسان ایک قیدی کی طرح اپنے زندان کی درودیوار پر اپنے گھر کی تصویریں بنا کر گھر سے قربت کا تصور باندھتا ہے۔ آرٹ ان کیفیات کو روپ بخشتا ہے جو مرئی نہیں ہیں۔ یہ انسان کی قوت تخلیق کا مرئی اظہار ہے جو جدوجہد سے عبارت ہے۔ انسان جتنی جدوجہد کرتا ہے اتنا ہی وہ ارتقاء کرتا ہے اتنی ہی اس کی تخلیقی صلاحیتیں جلا پاتی ہیں۔

آج کا فن وادب ماضی کے فن کی طرح محض دل بہلاوا نہیں ہے۔ یہ انسان اور انسانیت کے ارفع ترین تصورات کا ترجمان ہے یہ ایک مشن اور فریضہ ہے۔ خالق کائنات نے سب اشیاء کو تخلیق کیا۔ پھر اس کے بعد اس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا کچھ حصہ انسان کو ودیعت کرکے اسے اپنے دائرے میں تخلیق کے لئے چھوڑ دیا۔ اس تخلیق کار کا نام آرٹسٹ ہے جو شخص صاحب تحریر ہے وہ اپنے آپ کو تخلیق کررہا ہے۔ فن کو صرف تفنن طبع کا ذریعہ سمجھنا فن کی تقدیس کو پامال کرنا ہے۔ شریعتی کے اس لیکچر کے کافی حصے کو اہل ایران کے مخصوص حلقوں نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا علی شریعتی نے بعد میں خود اس لیکچر میں کچھ ترامیم کردی تھیں۔ مگر بنیادی فکر وخیال وہی رہا ہے علی شریعتی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی کی پسند ناپسند کی وجہ سے راہ حق سے ہٹ جاتا اس نے صرف کچھ مثالوں کو تبدیل کردیا تھا۔

سیمائے محمدؐ

علی شریعتی کی تصنیف "اسلام شناسی" کا آخری باب ہے۔ جس کو الگ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اسلام کی ایک جدید اور نئی توجیح پیش کی گئی ہے ۔

بیشتر شیعہ علماء نے بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس پر یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ رسمی معنوں میں عالم دین نہیں ہے۔ یہ وہی اعتراض ہے جو برصغیر میں علامہ اقبال پر کیا جاتا رہا ہے علی شریعتی ایک ماہر سماجیات سوشیالوجسٹ تھے مگر انہوں نے دین اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے والد ایک بہت بڑے عالم دین تھے۔ جنہوں نے ان کی راہنمائی قدم قدم پر کی تھی۔ اس لیکچر کا انگریزی ترجمہ ۱۹۷۱ء میں عبدالعزیز ابوالحسین سچا دنیا نے کیا تھا اور علی شریعتی کی ہدایت کی روشنی میں اس میں استعمال شدہ اصطلاحات کو جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا۔

اس لیکچر میں علی شریعتی کہتا ہے کہ تاریخ تین چہروں کے ساتھ دنیا میں طلوع ہوتی ہے اس کا ایک چہرہ قیصروکسریٰ جیسے بادشاہوں کا ہے اس کا دوسرا چہرہ فلسفیوں اور دانشوروں کا ہے جبکہ اس کا تیسرا چہرہ انبیاء اور پیغمبروں کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ سلطانوں کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے جس کی دھار سے خون ٹپک رہا ہوتا ہے ان کے ارد گرد نجومی مسخرے شاعر اور خدمتگار ہوتے ہیں ان کی متاع حیات بس طاقت وحکمرانی ہے فلسفی کو اپنی لیاقت پر گھمنڈ ہوتا ہے۔ وہ کبھی تو شاہوں کی محفل میں جابیٹھتا ہے اور کبھی ان کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتا ہے۔ شریعتی کے بقول ہر دور میں قوم کے مدبر اور فاضل لوگ وہی ہوں گے جو دنیوی آسائشوں اور حقیر آرزوؤں سے دور ہوں گے۔ مگریہ دانشور بھی زیادہ تر اشرافیہ کی حکمرانی کے قائل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی حق حکمرانی صرف بہت ذہین افراد کو حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے عوام الناس کے لئے کچھ نہ کیا اور ان کو حقیر جانا۔ علی شریعتی دعویٰ کرتا ہے کہ اگر ہم سقراط اور اس کے شاگردوں کو تاریخ کے صفحات سے محو کردیں تو محض کتب خانے اور درسگاہیں ہی ان کا ماتم کریں گی۔ مگر کسی نبی کو تاریخ سے نکالنے پر تاریخ کبھی مکمل نہیں ہوگی۔ عوام الناس فوراً حقیقت کو پہچان لیتے ہیں مگر عبقری لوگ بڑی مشکل سے سمجھ پاتے ہیں۔ نبیوں کی بیچ روح میں حسن معنی اور اسرار کا ادراک رکھتی ہیں۔ یہ دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اور انسانی گروہ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ تاریخ دراصل انہی تین کے کردار

اور اس کے نتیجے کا نام ہے۔

علی شریعتی آگے چل کر سلسلہ انبیا کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی غیر سامی پیغمبر (ایرانی ہندی اور چینی) اور سامی پیغمبر ابراہیمی سلسلے کے سارے پیغمبر۔ شریعتی یہاں سامی اور غیر سامی پیغمبروں کی زندگی اور ان کے پیغامات کا ایک تقابلی جائزہ پیش کرتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ مانی' زرتشت' کنفیوشس' لاؤتزو اور مہاتما بدھ سبھی طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور اس طبقے کا حصہ بننے کے لئے کوشاں رہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ تمام غیرسامی پیغمبر اپنی دعوت کا آغاز شاہی محل سے کرتے ہیں اور انہی کے محل عاطفت میں بیٹھ کر منصوبے بناتے ہیں۔ دوسری طرف براہیمی انبیاء سب کے سب محروم طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں غالباً" چرواہے اور ان میں سے کچھ معمولی ہنر پیشہ تھے جو اسی دور میں عام تھے یعنی لوہار ترکھان وغیرہ۔ وہ سب کے سب جملہ معاشرتی حیثیت سے عاری اور فقرومسکنت میں پلے ہوئے تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ ان براہیمی انبیاء کی آمد پر محروم ومظلوم لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے اور ایک ایسی جمعیت وجود میں آئی جو سرمایہ داروں سود خوروں اور وقت کی اسٹیبلشمنٹ سے ٹکرا گئی۔ حضرت ابراہیم کلہاڑا لے کر چلے۔ موسیٰ کے ہاتھ میں عصا تھا عیسیٰ علیہ السلام روحانی قوت کی تلوار کے ساتھ قیصر روم سے بھڑ جاتے ہیں۔ داؤد جالوت سے اور یحییٰ علیہ السلام ہیروڈوٹس سے نبرد آزما ہوجاتے ہیں۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ایک یتیم نوجوان تھے مگر عرب کی کہانت کے ساتھ ساتھ قیصر وکسریٰ کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کردیتے ہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بادیہ پیما پیغمبروں کے سلسلے کی آخر کڑی ہیں آپ انسانیت کا سب سے حسین چہرہ لے کر طلوع ہوتے ہیں۔

علی شریعتی اس تحریر میں آگے چل کر کہتا ہے کہ کسی مذہب کا تجزیہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ کہ اس کے خدا' کتاب حیات اور پیروکاروں کی حقیقتوں کا مطالعہ کیا جائے۔ یہودہ

قوم کا خدا خشم ناک چہرے والا ہے وہ غیر معمولی جلالت وجبروت کا مالک ہے۔ کسی انسان کا اس سے راز ونیاز اور محبت کا رشتہ قائم کرنا آسان نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کا خدا معشوقانہ چہرے اور محبوبانہ لطافت کا حامل ہے۔ وہ انسان کے اس درجہ قریب ہے کہ اپنے پر شکوہ عرش کو چھوڑ کر زمین پر نزول اجلال کرتا ہے۔ وہ خون کے بدلے خون کی جگہ خون کو محبت کے دریا میں دھو ڈالنے کا درس دیتا ہے۔ اس غضبناک معشوقانہ چہروں کے بعد توازن واعتدال کی ضرورت لا ابدی تھی۔ اسی توازن واعتدال کا پرچم لے کر ہمارے نبی پاک تشریف لائے۔ اسلام میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام دونوں کے خداؤں کا عکس موجود ہے۔ مار اور پیار دونوں موجود ہیں۔ مسلمان رات کا عبادت گزار تو دن کو جہاد کرنے والا ہے۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی وجود میں لاتا ہے جس کا وجود اگر تہذیب ہے تو اس کی روح میں دین محمدؐ حلول کئے ہوئے ہے قیصر وکسریٰ کی تلوار عیسیٰ علیہ السلام کی صفت والے لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ منصور حلاج کی بے قرار روح سقراط کے سینے میں تڑپ پیدا کردیتی ہے۔ علی شریعتی اس لیکچر میں اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کرتے ہوئے فرانز فانن کی زبان میں کہتا ہے۔

مغرب کی اندھی تقلید سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہمیں افریقہ اور ایشیا کو ملا کر ایک اور یورپ بنانے کی ضرورت نہیں ہے امریکہ والے ایسا کرچکے ہیں مغربی تجربہ امریکہ میں جاکر ناکام ہوچکا ہے وہ نیا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی دنیا کو ضرورت ہے۔

ہمیں اس انسان کے نقش قدم پر چلنا ہوگا جو رات کا عبادت گزار اور دن کا شہسوار بنائے۔ اس کے مذہب کو اپنانا ہوگا جو عبارت ہے کتاب' توازن اور لوہے سے۔ کتاب علامت ہے ذات' تمدن اور تعلیم کی' توازن نام ہے عدل ومساوات کا اور لوہا علامت ہے قوت واقتدار کا۔ جس کے پاس کتاب' توازن ہے مگر لوہا ہوگا وہی جیتے گا مغرب کے پاس لوہا اور توازن اور کتاب نہیں ہے ہمارے پاس صرف کتاب ہے۔ ہمیں توازن اور لوہے کی ضرورت ہے۔ یہی ہماری نجات اور اسلام کی سربلندی کا راستہ ہے۔

سرخ شیعیت RED SHIISM

یہ ایک لیکچر ہے جو علی شریعتی نے ستمبر ۱۹۷۲ء میں حسینیہ ارشاد میں دیا تھا۔ اس گفتگو میں اس نے شیعیت کے دو رخوں کا تجزیہ کیا ہے۔ یعنی سرخ شیعیت جو جہاد اور شہادت پر منتج ہوتی ہے اور سیاہ شیعت جو صرف آہ وبکا' واویلہ اور ماتم سے عبارت ہے۔ اول الذکر خون اور قربانی کا تقاضہ کرتی ہے اور رہ حسینؓ پر چل کر انقلاب اسلامی کی طرف گامزن کرتی ہے۔جبکہ موخرالذکر صرف انسان کو مجہولیت کی طرف راغب کرتی ہے۔علی شریعتی کی نگاہ میں اپنے نظریے کے لئے جان کی بازی لگانے اور خاک وخون میں غلطاں ہونے کا نام ہی سرخ شیعیت ہے۔ یہ مسلک کمزور ہونے کے باوجود ظلم صبراور جہول کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا نام ہے۔

اس لیکچر میں ڈاکٹر شریعتی شیخ خلیفہ کی اس جدوجہد کا تذکرہ بھی کرتا ہے جو اس نے خراسان کے علاقے سبزوار میں اپنے فکر وعمل کے ذریعے برپا کی اور جس کے نتیجے میں اس کو موت کا جام پینا پڑا۔ اس کے افکار کی روشنی ہی میں سربیدار کی تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔ جس کے دوران ہزاروں لوگ منگول مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جہاد کے ذریعے اپنے آپ کو جابرانہ تسلط سے آزاد کروایا تھا۔

علی شریعتی کا کہنا ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا آغاز ہی لا سے ہوتا ہے یعنی ماسوائے ذات باری کے سب قوتوں کی نفی کرنا۔اسی طرح شیعیت کا مسلک بھی استکبار کے خلاف استنکاف سے عبارت ہے۔

اسلامی سوشیالوجی

یہ لیکچر ۱۹۶۸ء میں حسینیہ ارشاد میں پیش کیا گیا۔ اس میں علی شریعتی ان راستوں کا ذکر کرتا ہے جن پر چل کر صحیح اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس سلسلے

میں سب سے قبل ہمیں خدا اور اس کی واحدانیت کو سمجھنا ہوگا۔ دوسری سٹیج پر ہم کو قرآن عظیم کو بنظر غائر سمجھنا ہوگا۔ تیسری سٹیج پر ہمیں نبی اسلامؐ کا قرب حاصل کرنا ہوگا۔ چوتھی سطح پر ہمیں نبی پاک کے ظہور پر غور کرنا ہوگا اور پانچویں سطح تو وہ ہے جب ہم نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم رفقا کی شخصیات اور قربانیوں کو زیر غور لانا ہوگا۔

صحیح تفہیم ہی ہمیں صحیح راہ کی طرف لے جاسکتی ہے۔ صرف عقیدہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔ اگر ہم کسی چیز پر اعتقاد رکھیں مگر اسے سمجھیں نہیں تو ایسا عقیدہ بے کار ہے۔ نیکی اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب ہم اعتقاد کی ماہیت کو سمجھیں اور جو کچھ کریں سمجھ بوجھ کر کریں۔ اگر ہم اسلام پر ایمان لائے ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اسے اچھی طرح سمجھیں۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم الفاظ کو سمجھیں اور اسے اسلام کا منشور اور لائحہ عمل گردانیں۔ دوئم یہ کہ ہم اسلامی تاریخ کے مختلف ابواب اور سطوح کا مطالعہ کریں اور سمجھیں کہ اسلام اور قرآن کو کیسے سمجھا اور برتا گیا ہے۔

اسلام کو سمجھنے کا ایک طریقہ بھی موجودہ ہے جسے اہل مغرب (TYPOLOGY) کہتے ہیں اکثر سماجیات کے سکالرز کے نزدیک کسی سماج کے مسئلے کو سمجھنے کا یہ سب سے بہتر طریقہ ہے۔ اور خاص طور پر مذاہب کو سمجھنے کے لئے اہل علم یہی طریقہ اپناتے ہیں۔

علی شریعتی کہتا ہے کہ ابراہیمی پیغمبروں کے علاوہ جو بھی تبدیلی کے خواہاں مصلحین گزرے ہیں انہوں نے وقت کی موجودہ قوتوں کے خلاف بغاوت نہیں کی بلکہ سسٹم کے اندر رہ کر کام کرنا چاہا جبکہ براہیمی پیغمبروں کا وطیرہ ہی سکون وجمود کی حاضر قوتوں کو مٹا کر ایک نیا نظام قائم کرنا تھا۔ اس نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ سلمان فارسیؓ اور ابوذر غفاریؓ کی اسلام کے لئے خدمات کا صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا گیا اور غیر مسلم ہمیں ان سے متعارف کرواتے ہیں۔ اس لیکچر میں شریعتی آگے چل کر کہتا ہے کہ دنیا کی تمام بڑی تہذیبیں (ستائیس تعداد) ہجرتوں کے بطن سے ہی پیدا ہوئیں۔ اس نے یہ سوال اٹھایا کہ تاریخ کی محرک قوت کیا ہے۔ کچھ سکالرز کا خیال ہے کہ تاریخ گزرے واقعات کا ایک

مجموعہ ہیں۔ یہ تاریخ کے لئے کسی مقصد یا قوت کے وجود کو نہیں مانتے۔ کچھ دوسرے لوگ تاریخ کو محض اتفاقات وحادثات کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں یعنی از خود برپا ہونے والے بڑے بڑے واقعات کے نتیجے میں تاریخ بنتی جاتی ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخ کی مانند ایک درخت کے ہے جس کا بیج تو پتہ نہیں کس زمانے میں پڑ گیا مگر بعد میں اس کی جڑیں شاخیں پھل اور پھول پتے خود بخود نکل کر اپنے ہی کسی قانون کے تحت پھیلنے لگے۔ کچھ اور سکالرز کا کہنا ہے کہ تاریخ بڑی بڑی شخصیات کے کارناموں کی وجہ سے تشکیل پاتی ہے کارلائل اور ایمرسن جیسے لوگوں کا یہی نظریہ تھا۔

ان تمام تصورات میں عوام یعنی والناس کے وجود اور اس کے اجتماعی عمل کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اسلام وہ پہلا دین ہے جو عوام الناس کو تبدیلی اور انقلاب کا سب سے بنیادی فیکٹر قرار دیتا ہے۔اسلام ہی کہتا ہے کہ تہذیبیں عوام الناس کے اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ قرآن میں بار بار والناس کا ذکر آیا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا ہے کہ آپ کا کام پیغام ربانی کو عوام الناس تک پہنچانا ہے۔ عوام کو خوش خبری سنادو۔ باقی کام ان کا ہے تم ان کے اچھے برے کے ذمہ دار نہیں ہو۔ تاریخ کے بارے میں مختلف مباحث سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ شخصیات' روایات' حادثات اور عوام الناس وہ عناصر ہیں جو سماج میں تغیر پیدا کرتے ہیں اسلام ان چاروں عناصر میں سے انسان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ علی شریعتی کا کہنا ہے کہ علم سماجیات کے مطابق ایک فرد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں پانچ عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ 1۔ ماں 2۔ باپ 3۔ سکول 4۔ ماحول 5۔ معاشرہ۔ مگر پیغمبر اسلام کی تعمیر و تشکیل میں ان میں سے کوئی بھی عنصر موثر نظر نہیں آتا اور یہی بات ان کے بہت بڑے اور برگزیدہ نبی ہونے کی دلیل بھی ہے۔

ہاں دوست ایسا ہی تھا

یہ لیکچر بھی علی شریعتی نے مئی 1972ء میں حسینیہ ارشاد میں ہی دیا تھا۔ اس گفتگو کے آغاز میں علی شریعتی اپنی ذاتی زندگی کی طرف اشارے کرتا ہے۔ یہ لیکچر ان کی سوانح پر بھی بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

"ایک طرف میں آج کے تعلیم یافتہ طبقے سے متعلق ہوں اور آپ خوب جانتے ہیں کہ اس طبقے کا انداز فکر کیا ہے اور مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی کا کیا عالم ہے۔ ان کی زندگی کے اہداف کیا ہیں اور وہ کیسی زبان وثقافت کے مالک ہیں تو دوسری طرف میں ایسی سرزمین سے اٹھا ہوں اس علاقے میں پروان چڑھا ہوں اور ایسے صحرا میں پلا بڑھا ہوں جو آبادی سے خالی' خوشی سے محروم اور خوشحالی سے نابلد ہے۔ جہاں زندگی روکھی سوکھی غیر دلچسپ اور افلاس ومشکلات سے دوچار ہے۔ میرے آباؤاجداد بھی اس اشرافیت سے محروم تھے جس کا قد کاٹھ زر جواہر اور اقتدار کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ میری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون اور میرے نظریات میں بھی اس "اشرافیت" کی کوئی آلائش موجود نہیں ہے۔ ہم مفلس پیدا ہوئے' سختیوں میں پلے اور محرومیوں میں پروان چڑھے"

ان خصوصیات کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ اعلان کرتا ہے کہ یہی اسلحہ و آہن لے کر وہ تہذیب انسانی کے سفر پر روانہ ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ابنائے روزگار کا تماشہ کرنے نگر نگر گھوما ہے۔ یونان گیا' روما گیا' پھر ایک موسم گرما میں افریقہ چلا گیا۔ اس سفر سے اس کا واحد مقصد اہرام مصر کو دیکھنا تھا۔ گائیڈ نے اسے بتایا کہ غلاموں کے گروہ انسانی کو وقت کے فرعونوں نے پتھر ڈھونے کے کام پر لگایا تھا یہ انساں پتھر کی اسی لاکھ سلیں ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے سے اٹھا کر لائے۔ ان میں سے ہر سل کا وزن ستر من تھا۔ اسوان کے مقام سے لائی جانے والی ان سلوں سے چھ چھوٹے اور تین بڑے بڑے

اہرام کی تعمیر مکمل کی گئی۔ جو درحقیقت وقت کے فرعون اور اس کی ملکہ کی آخری آرام گاہ تھی۔ بڑے ہرم کی بلندی چار سو اسی فٹ ہے اور سارے ہرم کا بوجھ اس ایک سنگ مرمر کی سل پر ہے جو بادشاہ کی حنوط شدہ لاش کی چاردیواری پر چھت کے طور پر رکھی ہے۔ علی شریعتی اس عمارت کی رفعت وہیبت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اہرام کے چاروں اطراف کچھ سلیں بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ پوچھنے پر گائیڈ نے بتایا کہ یہ ان تہہ خانوں کے ڈھکنے ہیں جو زمین کھود کر کئی میل تک اندر ہی اندر تعمیر کئے تھے۔ وجہ وہ بیان نہیں کرنا چاہتا تھا مگر شریعتی کے اصرار پر وہ پھوٹا۔

تیئس ہزار غلام تیس سال تک ایک ہزار میل دور سے ان سلوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ڈھوتے تھے۔ ہر روز سینکڑوں غلام ان سلوں کے نیچے آکر مرتے جن کی جگہ تازہ دم غلام آجاتے اور کچلے ہوئے غلاموں کو گڑھے کھود کر دفن کردیا جاتا اور اوپر یہ سلیں دھردی جاتیں۔"

علی شریعتی یہ سن کر آبدید ہوگیا اور اس نے گائیڈ سے کہا اب تم اپنی راہ لو۔ میری سیاحت ختم ہوگئی۔ نہیں دیکھنا مجھے ظالم بادشاہوں کے کرتوتوں کو۔ وہ چپ چاپ سرنہوڑائے ایک سل کے کونے پر جابیٹھا اور گہری سوچ میں گم ہوگیا۔ اسے چاروں طرف معصوم اور مظلوم غلاموں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی انہی انسانوں کا ایک بھائی ہے وہ سوچنے لگتا ہے ہم ایک ہی نسل اور ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں جغرافیے جدا ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے ہم سب کی تاریخ، ہمارا نصیبہ اور انجام ایک ہے اس کے بعد اہرام کا شکوہ وجلال اس کی نظروں میں چبھنے لگا۔ گھن آنے لگی اسے تمدنی عظمت کی ان نشانیوں سے۔ چند منٹ قبل جن اہراموں کو اپنی محبوب نوع انسانی کا عظیم ورثہ سمجھ رہا تھا اب اس کو لعنت کا طوق نظر آنے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ روئے زمین پر انسان نے

تہذیب کے نام پر جتنی عظیم یادگاریں تعمیر کی ہیں وہ سب میرے آباؤاجداد کی ہڈیوں پر بنی ہیں۔ میرے بزرگوں کا گوشت پوست اور خون گارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہ آدم کی مظلوم اولاد کی اجتماعی قبریں ہیں۔ غم اور غصے سے علی شر۔متی کا برا حال ہوگیا۔ شدت غم سے اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ جن تہذیبی آثار کو دیکھنے اتنا لمبا سفر کرکے آیا تھا اب اسے جرم اور ظلم کی نشانیاں نظر آنے لگیں وہ معدوم قبروں اور لاکھوں انسانی ہڈیوں کے ہجوم پر بیٹھا رونے لگا اسے یوں لگا کہ اس کے بھائی پکار رہے ہیں شکات آمیز نظروں سے دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ یہاں خبر لینے آئے ہو یا تماشہ کرنے۔ علی شر۔متی کے اندر احتجاج کا لاوا ابلنے لگا۔ وہ وہاں سے اٹھا اور اپنی قیام گاہ پر آیا اور دروازہ بند کرکے چپ چاپ بیٹھ کر رونے لگا۔ کتنی دیر تک وہ روتا رہا کچھ معلوم نہیں۔ پھر اس نے کاغذ قلم اٹھایا اور اپنے کچلے مسلے مارے پیٹے بے گناہ انسانوں اور بھائیوں کے نام ایک خط لکھا۔

میرے بھائیو! تم تو مرکر نجات پاگئے۔ مت سمجھو کہ ہم آرام سے بیٹھے ہیں ہم بھی اسی بے گار میں پکڑے ہوئے ہیں جن میں تم نے اپنی جانیں گنوائیں تھیں۔ ہمیں اب بھی جانور ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں جنگوں کا ایندھن بنا کر ایسے لوگوں سے لڑنے پر بھیجا جاتا ہے جن سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہمیں اپنے ہی بھائیوں کو ذبح کرنے یا ان کے ہاتھوں ذبح ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے ہمارے دور کے فرعون ہمارے ضعیف ماں باپ کے سامنے ہمیں پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ وہ بے چارے پھر ساری زندگی انتظار ہی کرتے رہتے ہیں ان کی زندہ لاشیں آخری سانس تک ہماری مردہ لاشوں کا انتظار کرتی خود بھی مرجاتی ہیں جنگوں میں ہم شکست کھاتے ہیں تو خمیازہ ہمارے ماں باپ کو ان کے گھروں کھیتوں کھلیانوں کی تباہی کی صورت میں سہنا پڑتا ہے اگر جیت جائیں تو فتح وکامرانی کا مالک کوئی اور ٹھہرتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں پھر پرے لڑانے والے بادشاہوں کے محلات تعمیر کرنے پر لگا دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے پیغمبر زرتشت مانی' بدھ کنفیوشس

آئے مگر ہماری طرف متوجہ ہونے کی جگہ اپنی عبادت گاہوں میں گم ہوگئے۔ کنفیوشس بادشاہ لو کا وزیر بن کر چین کے شہزادوں کی مصاحبت میں گم ہوگیا۔ بدھ نے خود نرواں پانے کے لئے زہد وریاضت اختیار کرکے ہمیں چھوڑ دیا۔ زرتشت دھوم دھڑکے سے آیا مگر ہماری اجتماعی قبروں کی طرح توجہ دئے بغیر بلخ چلا گیا اور شاہ گشتاسپ کے دربار کی رنگینیوں میں کھوگیا۔ مانی روشنی کی باتیں کرتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آئیں نور کا پلندہ لپیٹ کر شاہ پور ساسانی کے قدموں میں ڈھیر کردیااور اس کی مدح کے گیت گانے لگا۔ اس نے یہ کہہ کر ہمیں اور شرمسار کردیا کہ شکست خوردہ انسان کی اصل تاریکی ہے تاریخ کی اصل روشنی ہے یعنی مرے ہوؤں کی قبروں پر لات ماردی۔

دوستو تم ہم پر رشک مت کرو ہمارا حال تم سے مختلف نہیں ہے۔ تم دیو ہیکل اہرام تعمیر کرتے کام آئے تو ہم شاہوں کے عشرت کدے سجاتے مارے گئے۔ انہوں نے ہماری مشکیں کسیں' مذہب کے نام پر ذاتی مفادات کی جنگوں میں جھونکا' حتیٰ کہ ہمیں نام نہاد دیوتاؤں کے قدموں میں اپنے بچے تک قربان کرنے پر مجبور کیا گیا۔ تم کیا جانو دوستو عبادت خانوں کی فضا معصوم بچوں کی چیخوں سے کتنی بوجھل ہے اور ان کے خون ناحق کی بو اس معبدوں میں کس حد تک رچی ہوئی ہے۔ ہم نے تم سے ہزاروں سال زیادہ عمر پاکر تم سے ہزاروں گنا زیادہ دکھ سہے ہیں فرعون اور قارون نے ملی بھگت کرکے ہم سب کو لوٹا ہے۔ ایران کی کل ثروت کا فیصد زرتشتی پادری ہم سے اہورا مزدا کے نام پر لے گئے ہم نے مندر بنائے چین کے عبادت خانے بنائے' روما کے محلات بنائے مگر ہم کو مرگ مفاجات کے سوا کچھ نہ ملا ہم غلاموں کے ساتھ یہ دیوتا بھی کینہ رکھتے ہیں سب پیشوا قصر سازی اور مقبرہ سازی میں فراعنہ کے آلہ کار ہوتے ہیں حتیٰ کہ ارسطو جیسے دانشور بھی اس ڈھرے پر چلتے نظر آتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں کہ کچھ لوگ غلامی کے لئے اور کچھ سرداری کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔" ہم نے

سمجھ لیا کہ جب سب لوگ یہی کہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ ہم غلامی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ غلام ہی مرجائیں گے۔

لیکن دوست انہی دنوں ایک عجیب خبر ملی کہنے والوں نے کہا عرب کے صحراؤں میں محمدؐ نامی ایک شخص آیا ہے اور کہہ رہا ہے۔

میں خدا کی طرف سے آیا ہوں۔ خدا کی دنیا کے غلاموں اور مستضعفین پر اپنی نعمتیں نازل کرنے ان کے مرتبے کو بڑھانے اور ان کو انسانوں کا سردار اور زمین کا وارث بنانے"

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ خدا کبھی غلاموں سے بھی مخاطب ہوسکتا ہے۔ خدا اتنا طاقتور کیسے ہوگیا کہ فرعونوں اور قارونوں سے حکومت' دولت چھین لے اور نہ صرف یہ کہ چھین لے بلکہ چھین کر ان کے مقبرے اور محلات کی سلیں ڈھونے والوں اور ان کے نیچے پس کر نابود ہوجانے والے بے گاریوں کو بخش دے۔ مال ودولت کے ساتھ ان کو زمین کی سرداری اور وراثت جیسی انہونی نعمتیں دے دے۔ مجھے اس شخص کی باتوں میں مبالغہ نظر آیا مگر جب اس نے کہا کہ وہ ایک یتیم ہے جسے سب نے اسی پہاڑ کی پشت پر بکریاں چراتے دیکھا ہے تو میرا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا نے چرواہوں میں سے ہی اپنا نبی منتخب کیا ہو۔ کیا اس پہاڑ کے ارد گرد کوئی مالدار شخص موجود نہ تھا۔ وہ خاندانی نبی تھا گلہ بان انبیاء کے براھیمی سلسلے کا آخری نبی۔ اس کے آباؤاجداد بھی نبی اور چرواہے تھے۔میں خوشی اور خون سے کانپ اٹھا کیونکہ میری اتنی طویل زندگی میں پہلی بار ایک نبی ہم میں سے مبعوث ہوا تھا اس کے گرد ہم جیسے ہی لوگ تھے۔ بلال حبشیؓ سلمان فارسیؓ اور ابوذر غفاریؓ جیسے غریب وگمنام صحرائی تھے۔ سالم تھا جو حذیفہ کی بیوی کا ادنیٰ غلام تھا۔ اس کا محل مٹی کے بنے ہوئے چند کمروں پر مشتمل تھا جس کی تعمیر میں خود اس کا پسینہ بھی بہا تھا۔ اس کا تخت ایک لکڑی کا تختہ تھا جس پر کھجور کے پتے بچھے تھے۔ میں بھی اس کے گرد بس گیا کیونکہ وہ یتیموں' بے

نواؤں' زمین کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کا ہمدرد اور راہنما تھا۔ میری دنیا میں مسرت کے پھول کھل اٹھے۔ میں سمجھا کہ ان گنت صدیوں کے ہیجانہ ختم ہوئے اور اولاد آدم کی زندگی میں نجات کا سویرا طلوع ہوگیا۔

مگر اے دوست پھر آندھی چلی۔ اس کے رخصت ہوتے ہی اس کے نام پر ایک بار پھر پہلے کی طرح عالیشان محلات و پرشکوہ عبادت گاہیں تعمیر ہونے لگیں' قرآنی آیات کی کندہ کاری سے مزین تلواریں ہمارے غریب انسانوں کے خلاف بے نیام ہونے لگیں۔ پھر عوامی خزانہ ہم سے ہی لوٹے ہوئے مال سے چھلک گیا۔ اس عظیم المرتبت انسان کے خود ساختہ نمائندے ایک بار پھر ہماری بستیوں پر ٹوٹ پڑے اور ہمارے نوجوانوں اور بچوں کو اپنے لیڈروں اور قبائلی سرداروں کی غلامی کے لئے پکڑ کر لے گئے ہماری ماؤں کو انہوں نے کنیز بازاروں میں بیچ ڈالا۔ ہمارے مردوں کو قتل اور ہمارے اموال کو لوٹ ڈالا۔ اس ہستی کے جانے کے بعد ایسی طاقت ابھر آئی تھی جس نے توحید کے لبادے کی آستینوں میں پرانے بت چھپا رکھے تھے اور دھوکے اور فریب کی آگ اللہ ہی کے نام پر ہر معبد میں مشتعل کردی۔ وہی فرعون و قارون کے چہرے ہم پر خدا اور رسول کے نام پر مسلط ہوگئے۔ ہم ایک بار پھر معبدوں' قلعوں اور مقبروں کی تعمیر کا ایندھن بننے لگے۔ بغداد کے الف لیلوی محلات اور غرناطہ و الحمرا کی پرشکوہ عمارات ہمارے خون کی آمیزش سے تیار ہونے لگیں۔ فرق صرف یہ پڑا تھا کہ اس بار یہ سارے کام اللہ کے نام پر ہو رہے تھے۔ مجھے انسان اور میرے نبیؐ دونوں کو ہی دھوکا دیا گیا ہے۔

اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں۔ کس کے پاس جاؤں۔ مسجد اور مندر کا فرق ختم ہوگیا ہے پہلے قرآن کو نیزوں پر چڑھایا پھر حسینؓ کے سر کو' عزیز بھائی! اب میں ایک ایسی دنیا کا باشندہ ہوں جہاں ہمارا دشمن میری آنکھوں کے سامنے ایک مضبوط تر نظام اور قوی تر تدبیر کے بل پر نصف سے زیادہ بلکہ ایک معنی میں ساری دنیا

پر قابض و حکمران ہے۔ ہماری پرورش غلام ساز ماحول میں ہوئی ہے جس میں ہمیں علوم وفنون تہذیب' تمدن وغیرہ کی تعلیم تو دی گئی ہے لیکن ہمارے قلب وضمیر سے مقصد کی محبت' انسانی اقدار کا احترام' اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس مکمل طور پر ختم کردیا گیا ہے اور بھائی اب تو ان حاکم نظاموں کے سامنے ہماری حالت اس منقش سیاوشی چینی مرتبان کی سی ہے کہ جس میں زہر ڈال دو یا آب حیات اسے کوئی فرق نہیں پڑتا"

علی شریعتی کی یہ تصنیف بہت موثر اور دل آویز ہے۔ اس میں علی شریعتی کا جذبہ فراواں ڈرامائی کیفیت اور دلنگار خطابت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس تحریر کو پڑھ کر کون سا دل ہوگا جو خون' کے آنسو نہیں روئے گا۔

صفر بمقابلہ ایک

علی شریعتی کا خطاب صفر بمقابلہ ایک درحقیقت بچوں کو ان کی اپنی زبان میں یہ سمجھانے کے لئے ہے کہ زیرو کے ہجوم میں اگر ایک کا ہندسہ سربفلک کھڑا ہوجائے تو اس کی قدر وقیمت بڑھ جاتی ہے اور ایک کے ساتھ سارے زیرو لگ جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ ایک دن طاقت کی نشانی ہے۔ زیرو تقلید اور شکست کی علامت ہے زیرو کا ہجوم ایک کے تعاقب میں رہتا ہے۔ ایک بنو تاکہ دنیا تمہاری تقلید کرے۔ اس لیکچر میں وہ بچوں کو بتاتا ہے کہ اہل مغرب کی مرعوبیت نے ہم کو زیرو بنا دیا ہے اور ہم اندھوں کی طرح ان کے تعاقب میں چلے جارہے ہیں اور یہ عجیب بات نہیں کہ وہ ہمیں بندر سمجھتے ہیں۔ اہل مغرب نے ہمارے سامنے سائنسی اشیا کا بازار سجا دیا ہے۔ ٹی وی دے دیا ہے کہ ہم صرف دیکھیں تو ریڈیو دے دیا ہے کہ ہم صرف سنیں۔ سوچ وبچار اور شعور سے بے گانہ اور بے نیاز رہیں وہ ہماری سوچ سے لرزاں ہیں ہماری جسمانی طاقت ان کو خوفزدہ نہیں کرتی کیونکہ ہم بہت طاقتور بھی ہوں گے تو بھینس سے بڑے تو نہیں ہوسکتے۔ بھینس بنا کر وہ ہمیں دوھ لیں گے۔ اگر ہم بہت مضبوط ہوئے تو

گدھے کی طرح ہم پر بوجھ لاد دیں گے۔ زیادہ تیز رفتار ہوئے تو گھوڑے کی طرح ہم پہ سوار ہوجائیں گے ہماری جسمانی تاب وتوانائی ان کے لئے کارآمد ہے مگر ہماری فکری رفعت ان کے لئے پیام موت ہے۔ اس لئے ہمیں اس فکری قوت سے اپنے آپ کو مزین کرنا چاہئے۔ جس طرح رب عظیم ایک ہے۔ ساری کائنات کروڑوں اربوں ستارے سیارے' درخت پہاڑ' سبزہ زار' انسان' جانور چرند پرند وہ صفر ہیں جو اس ایک ذات کی وحدانیت سے وجود پاتے ہیں۔قدر وقیمت پاتے ہیں۔ اس طرح انسان بھی اگر زیرو کی جگہ ایک بن جائے تو لاکھوں زیرو اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں گے ڈاکٹر شریعتی نے اس خطاب میں بڑی دانش وحکمت سے توحید' تنظیم اور اتحاد ویگانگت کے نکتوں کو بیان کیا ہے۔

نامزدگی یا انتخاب

یہ علی شریعتی کا ایک اور لیکچر ہے۔ جس میں اس نے شیعہ سنی مسالک کے بنیادی اختلافات پر روشنی ڈالی ہے اس کے نزدیک مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں کے درمیان سب سے بڑا اختلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے طریقہ انتخاب سے شروع ہوا۔ علی شریعتی اس خود کلامی میں اصل نامزدگی اور انتخاب دونوں کے معائب ومحاسن سے بحث کرتا ہے۔ ایک سوشیالوجسٹ اور جمہوریت پسند انسان کی طرح انتخاب کے اصول کو مانتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ان عوامل کا بھی ذکر کرتا ہے جن کے تحت اسلامی تاریخ کی بالکل ابتداء میں اس اصول سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ گومگو کی کیفیت میں ہے وہ آخر میں کہتا ہے کہ جو انتخابات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد وقوع پذیر ہوئے وہ اس کے سال بعد ہونے چاہیں تھے کیونکہ معاشرتی سماجی اور تہذیبی اعتبار سے اس وقت کا انسان اس جمہوری سطح پر نہیں پہنچا تھا۔ علی شریعتی کی

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی مسلکی طبقے یعنی شیعہ کمیونیٹی سے ہی نہیں مخاطب بلکہ وہ عامتہ المسلمیں سے مخاطب ہوکر تاریخ کے ایک خاص دور ہی ہونے والے واقعات کا تجزیہ کررہا ہے یہ لیکچر ایک طرح کی خود کلامی ہے وہ غار حرا میں بیٹھ کر اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہے اور نامزدگی کی جگہ انتخاب کی راہ کو کیوں اپنایا گیا۔

سارتر کا کہنا ہے کہ فانان کو نہ پڑھنے والا خود اپنے تعلیمی کلچر کا مقروض ہے۔ اسی طرح علی شریعتی شہید کے مطالعے سے محروم رہ جانے والا خود اپنا قرض دار ہے۔ دور جدید میں لبریشن تھیالوجی اور مزاحمتی ادب کے سقراط ڈاکٹر علی شریعتی کا مطالعہ کیجئے اور اپنا قرضہ چکائیے

سرمایہ داری نظام

"سرمایہ داری (کیپٹلزم) نظام بیدار ہوگیا ہے ایک اور لیکچر کا موضوع ہے جس میں علی شریعتی بڑی وضاحت کے ساتھ سرمایہ داری نظام کا تجزیہ کرکے یہ ثابت کرتا ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد مزدوروں کے بیدار ہوتے ہی سرمایہ داری نظام نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور اپنی زبردست حکمت عملی سے محنت کش طبقے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ جب سرمایہ دار کو پتہ چلا کہ انقلاب بے روزگاری اور مہنگائی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے تو اس نے فوراً" اس کے سدباب کرنے کا بندوبست کیا اور مل ملا کر کارٹل، کامن مارکیٹ او ٹرسٹ بنا ڈالے تاکہ انقلاب کا راستہ روکا جاسکے۔ ایک جدلیاتی اصول ہے کہ مقدار جب بڑھ جائے تو بڑھ معیار جاتا ہے یعنی اس کی تاثیر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ایک آواز کی جگہ سو آوازیں مل کر قوت کا طوفان بن سکتی ہیں۔ مارکس کا کہنا تھا کہ کسانوں کے انقلاب میں تاخیر اسی وجہ سے ہورہی ہے کہ کسان کی مقدار معیار میں نہیں ڈھلی یعنی وہ بکھرے اور پھیلے ہوئے ہیں۔ محنت کش اپنے کام کی نوعیت کے باعث چند سو یا چند ہزار کی تعداد میں ایک چھت کے نیچے یکجا ہوسکتے ہیں مگر کسان بوجوہ اس طرح نہیں کرسکتے۔ چنانچہ سرمایہ دار کی سعی یہ ہوگئی کہ محنت کو مجتمع نہ ہونے دیا جائے۔ سرمایہ دار کو یہ سبق دانشوروں نے پڑھایا۔ جی ہاں بڑے بڑے فلسفی سائنس دان اور حتیٰ کہ معروف مارکسسٹ بھی سرمایہ دار کی ملازمت قبول کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ ماہرین سماجیات کی رپورٹوں کی روشنی میں سرمایہ داری نظام نے ایسے منصوبے بنانے شروع کئے جس کے تحت محنت کشوں کی قوت منتشر ہوتی رہے۔ اس کا ایک حل یہ نکالا گیا کہ ان کی بستیوں کو ایک دوسرے سے دور کرکے بسایا جائے۔

علی شریعتی اس لیکچر میں ایک اور زبردست نکتہ یہ بیان کرتا ہے کہ عملی استحصال سے استحصال کا احساس زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یعنی مظلوم کو ظلم کا احساس

نہ ہو تو وہ ناانصافی کے خلاف نہیں اٹھ کھڑا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ خاموش اور خوابیدہ صدیوں میں ظالم و مظلوم بڑے پرامن طریقے سے ایک دوسرے کو برداشت چلے آئے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ مظلوم کا شعور استحصال بھی ناپختہ تھا۔ چنانچہ جدلیاتی منطق اسی زمانے میں منجمد تھی۔ عمل ردعمل اور نئی حقیقت کا ظہور ایک مقام پر ٹھہر گیا تھا۔ طبقاتی شعور کے فقدان نے انقلاب کی راہ کھوئی کئے رکھی تھی۔ بھوک کا شعور صرف بھوکا ہونے سے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ لاکھوں کروڑوں بھوکے ننگے لوگ بھوک و ننگ کے تصور سے بے نیاز ہیں۔ بلکہ اپنی اس حالت پر خدا کا شکر بھی ادا کرتے دیکھے گئے ہیں۔ وہ ان عوامل سے ہی بے خبر ہیں جنہوں نے ان کی زندگی سے سب کچھ چھین رکھا ہے۔ وہ سب کچھ خدا کے کھاتے میں ڈال کر صبر شکر کر لیتے ہیں۔ جو چیز انسان کو استحصال سے ہمکنار کرتی ہے وہ غربت نہیں جہالت ہے۔ محرومی نہیں احساس محرومی ہے۔ یہ موازنہ اور مقابلہ ہے۔

جب انسان استحصال کرنے والی مخلوق کو مزے اڑاتا دیکھتا ہے تو اس کے اندر احساس محرومی کا ناگ پھنکنے لگتا ہے۔ جب ملازم یہ دیکھے کہ اس کا آقا بھی اسی حالت میں رہتا ہے وہی کچھ کھاتا پیتا ہے تو اس کے اندر وہ احساس پیدا نہیں ہوتا۔ پرانے زمانوں میں ایسا ہوتا تھا کہ دونوں کلاسیں ایک دوسرے سے دور نہیں رہتی تھیں۔ مگر دور جدید میں جو سرمایہ داری کلچر ابھرا ہے اس میں غریبوں اور امیروں کے استعمال کی اشیاء' ان کی زمین' ان کا آسمان' ان کے کپڑے' طور اطوار' زبان' سکول' ہسپتال سب کچھ ہی بدل گئے ہیں۔ اب امیر امیر کا رشتہ دار بن گیا ہے۔ چنانچہ سرمایہ داری نظام نے اپنی کلاس کی برتری کو قائم رکھنے کے لئے محنت کش طبقوں کے لئے کچھ جدید تانے بانے بنے ہیں۔ کم سے کم تنخواہ' میڈیکل سہولیات' سوشل سیکورٹی اور انشورنس وغیرہ کے چکر بنائے ہیں۔ سرمایہ داری سسٹم نے غریب کو بھی ایک مفاد پرست گروہ میں ڈھالنے کی سعی کی ہے جعلی مذہب ان کی خدمت کے لئے پہلے سے موجود ہے جو غریب

کو کہتا ہے کہ صرف تو صبر کر کیونکہ تجھے ہمیشہ غریب رہنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ پاپائیت اور ملائیت غربت کے فوائد گنوانے میں اپنی ساری خطابت صرف کرتی رہتی ہے۔ شاعر اور قلم کار بھی یہی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود سرمایہ داری سسٹم غربت کا منہ بند کرنے کے لئے کچھ اور طریقے سے بھی اپناتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کا طریقہ واردات یہ ہے کہ غریب کو بھی ٹوٹی پھوٹی اشیا کا مالک بنا کر استحصالی سسٹم کا حصہ بنا دیا جائے۔ تاکہ وہ ہر تبدیلی سے خوف کھائے اور ہر تبدیلی میں اسے سرمایہ دار کے کروڑوں اربوں کی جائیداد کے گم ہونے کی جگہ اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی اور بکسوں کا غم ستائے۔ اس کے اندر جعلی احساس ملکیت کا جگانا ضروری ہوتا ہے۔

سرمایہ دار مزدور کو یونین اور سینڈیکیٹ کے ذریعے چند گھنٹے ہڑتال کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ تاکہ غصہ انقلاب نہ بننے پائے۔ نظریے کی جگہ یونین ایک کامیاب ہتھکنڈہ ہے۔ ان تمام ہتھیاروں نے سرمایہ داری نظام کو اس لئے استحکام بخشا ہے کہ مزدور سے پہلے سرمایہ دار بیدار ہو گیا ہے۔ مارکس کی تھیوری کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار نے مارکس کے فلسفے کو غریب اور مزدور سے زیادہ اور پہلے سمجھ لیا' غریب و محنت کش ان پڑھ ہے احساس محرومی سے عاری ہے پھر اس کے سامنے سرمایہ داری ایک آئیڈیل بنا کر پیش کر دی گئی ہے۔ وہ انقلاب اس لئے برپا کرنا چاہتا ہے کہ وہ بھی سرمایہ دار بن جائے۔ علی شریعتی نے اپنے لیکچر میں ویس لکاسٹے۔ Yves Lacoste کی کتاب بھوک کا جغرافیہ Geography of Huager سے بہت سی شماریات پیش کی ہیں۔ سرمایہ دار مغرب نے غریب اقوام سے سارا کام مال لے کر اس کے بدلے اسی مال سے ہی اشیا برآمد کیں اور ان کا تمام سرمایہ اپنے ہاں منتقل کر دیا۔ ان تمام دلائل سے شریعتی یہ ثابت کرتا ہے کہ کیپٹلزم کی کامرانی میں اس کی ذہانت اور بیداری کا بڑا دخل ہے۔ یعنی مارکس جیسے دانشوروں نے جو صور غریب کو جگانے کے لئے پھونکا تھا وہ سرمایہ دار کو

غریب سے پہلے جگا گیا۔

ابوذر غفاریؓ

علی شریعتی کو حضورپاکؐ اور علی مرتضیٰ کے بعد اگر کسی ہستی سے عشق تھا تو وہ حضرت ابوذر غفاریؓ تھے۔ اس نے 1955ء میں 22 سال کی عمر میں ابوذر غفاریؓ پر پہلا مضمون لکھا۔ اس کے بعد 1972ء میں ایک اور مقالہ لکھا۔ یہ دونوں مضامین کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ ابوذرؓ سچے عاشق رسولؐ تھے۔ حضورؐ کے دربہ آپڑے اور ان کی حیات طیبہ کو مشعل راہ بنالیا۔ زندگی بھر اپنی راہوں پر چلتے رہے۔ اور اسلام کے ابتدائی ادوار میں نبی پاک کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے سرمایہ دارانہ رویوں کے خلاف شمشیر بے نیام کی مانند مصروف عمل رہے۔ تا آنکہ اسی جدوجہد میں اپنی جان دے دی۔ ان کا تعلق قبیلہ غفار سے تھا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع پہاڑوں میں رہتا تھا۔ یہ لوگ انتہائی غریب تھے اور لوٹ مار ان کا پیشہ تھا۔ جندب ابن جنادہ ان کا قبائلی نام تھا۔ انہوں نے جب سنا کہ ایک شخص ہے جو اپنے لوگوں کا سربراہ بھی ہے مگر عاجزوں اور غریبوں کی سی زندگی گزارتا ہے تو آپ اس کی تلاش میں نکلے۔ جب ان کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان کا دامن اس طرح تھاما کہ مرتے دم تک اس سے جدا نہ ہوئے۔ سب سے منفرد اور جداکردار و عمل کے مالک تھے۔ ان کے متعلق نبی پاک نے فرمایا تھا کہ وہ "اکیلا جیئے گا اکیلا مرے گا اور اکیلا ہی اٹھے گا" ابوذرؓ نے اس پر عمل کرکے دکھایا ابوذرؓ اسلام کو غریب نواز سمجھتے تھے اور اسلام اور پیغمبراسلام ﷺ کی اسی لوا پر فدا تھے۔

نبی پاکؐ مدینے میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے مسجد تعمیر کی اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا گھر بنایا جس کا ایک دروازہ مسجد کی طرف کھلتا تھا جب اسلام سارے عرب میں پھیل گیا تب بھی حضورؐ کا طریقہ حیات تبدیل نہ ہوا۔ مسجدؐ سے ملحق

چھوٹے سے گھر میں مقیم رہے۔ ابوذرؓ اسلام کو غربا و مساکین کی سب سے بڑی پناہ گاہ سمجھتے تھے۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ اسلام کے پیچھے پیروکار دولت و امارت کی ریل پیل میں اپنے نبی پاک ﷺ کی حیات طیبہ کو بھول کر محلات میں رہائش پذیر ہوجائیں گے۔ ان کے دروازوں پر پہرے لگ جائیں گے۔ یہ تو قیصر و کسریٰ کے طور طریقے تھے جن کے خلاف اسلام نے جہاد کا درس دیا تھا۔ اگر وہی طور طریقے اسلام کے خدمت گزار اپنالیں تو کجا ماند مسلمانی۔ بس یہی حضرت ابوذرؓ کا مسلک تھا۔ اسلام باہر کی تعمیر سے زیادہ اندر کی تعمیر کا نام ہے۔ اسلام سلمان فارسیؓ ابوذرؓ عمار یاسرؓ اور بلالؓ جیسے اندر کے بادشاہ پیدا کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ ہرقل روم کی کرسی پر بنو امیہ اور بنو عباس کے بادشاہوں کو بٹھانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوذر غفاریؓ پکار اٹھتا ہے کہ اے معاویہؓ اگر تو یہ سبز محلات اپنی دولت سے بنا رہا ہے تو اسراف کررہا ہے اور اگر عوام کی دولت سے بنا رہا ہے تو اسلام کے خلاف بغاوت کررہا ہے۔

اس لیکچر میں علی شریعتی جناب ابوذرؓ کی زندگی کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کو اسلام کے اندر پیدا ہونے والی غیر اسلامی حرکات و روایات سے نبرد آزما دکھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دن جناب ارقم کے گھر میں ایک شخص داخل ہوتا ہے کہ نام جس کا جندب بن جنادہ ہے وہ اسی گھر میں غائب ہوجاتا ہے اس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا وہ کدھر گیا۔ اس گھر میں سے ایک اور شخص برآمد ہوتا ہے کہ نام اس کا ابوذر غفاریؓ ہے جو چاند سورج کی طرح چمک رہا ہے جو اعلان کرتا ہے کہ اسلام میں ان لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو خود تو امارت و عیش کی زندگی گزارتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو سادگی اور غربت کے فوائد بتاتے رہتے ہیں۔ اسلام نے غربت کو کفر قرار دے کر انسانی سماجیات میں زبردست انقلاب برپا کردیا تھا۔ اسلام اور غربت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اسلام اور استحصال، اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام، شکوہ قیصری اور ثروت

کسی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے یہی ابوذرؓ کا ایمان تھا۔ اسلام قرآن کے ساتھ تلوار بھی لے کر آیا تاکہ غربت کے خاتمے کے لئے مسلح جدوجہد کو اپنانے سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ایک مسلح پیغمبر تھے۔ قوت کی معاونت کے بغیر نظریہ محض کاغذی پلندہ ہوتا ہے۔ ابوذرؓ کا کہنا ہے تھا ایک دروازے سے غربت داخل ہوتی ہے تو دوسرے سے دین نکل جاتا ہے۔ غربت کے اس دروازے کو بزور شمشیر بند کرنا ہوگا۔ ابوذرؓ کی زندگی کے آخری یام کسمپرسی کے عالم میں گزرے مگر وہ اپنی راہ سے ایک انچ نہ ہٹے۔

حج

حج علی شریعتی کی ایک وقیع تصنیف ہے۔ جس میں اس نے اس رکن اسلام کی حقیقت کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے شریعتی نے تین بار حج اور ایک بار عمرے کی سعادت حاصل کی تھی۔ ان زیارتوں میں اس نے جو دیکھا اور سنا اور خاص طور پر جو کچھ سوچا اسے اس نے اسی کتاب کی صورت میں پیش کردیا۔ وہ حج کو ارکان اسلام میں بہت زیادہ اہم بتاتا ہے اس کا کہنا ہے کہ قرآن الفاظ میں جس پیغام کو پیش کرتا ہے۔ حج اس کی عملی تصویر ہے۔

اس تصنیف کی ابتداء میں وہ رسالت اسلام کے بارے میں کہتا ہے کہ کوئی رسالت اس قدر ترقی یافتہ قوی اور باشعور نہیں جتنی محمدؐ کی رسالت اور اس کا حصہ انسانی۔ اسلام کیا ہے یہ معاشرتی ترقی' خود شناسی' ذمہ داری' آگے کی طرف حرکت' اپنے ارتقا کی لگن' عدل وانصاف کی جدوجہد' انسان کی حق شناسی' فطرت کا پرتو ہونا' تخلیقی قوت' سائنسی اور مالی پیش قدمی کا ساتھ دینا اور نفیس تہذیب وتمدن کی سمت میں آگے بڑھنا ہے۔ یہی رسالت اسلام کی عظمت ہے۔

اس کے بعد وہ اظہار تاسف کرتا ہے کہ محمدؐ کے اسلام اور آج کے مسلمان کے تصور اسلام کوئی نسبت نہیں ہے۔ اسلام کے وہ اہم ستون جو امت مسلمہ کو حرکت بخش سکتے ہیں یعنی توحید' جہاد اور حج ہیں ۔ توحید مدرسوں اور علماء کی موشگافیوں تک محدود ہوگئی ہے۔ جہاں تک جہاد کا تعلق ہے تو وہ ممنوع ہے اور اس کو تاریخ کے قبرستان میں دفن کیا جاچکا ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے ایک بڑی شاطرانہ چال کے ذریعے اسلام کی ہیئت میں تبدیلی پیدا کردی۔ دعاؤں کی کتاب قبرستان سے شہرلائی گئی کہ مردوں کی مغفرت کی دعائیں زندہ لوگ پڑھا کریں اور قرآن جو زندگی کی عملی راہنمائی کے لئے آیا ہے وہ شہر سے لے جاکر قبرستان میں رکھ دیا گیا کہ مردوں کے ایصال ثواب کے لئے ورد کیا جائے۔ یہی حال مدرسوں میں ہوا۔ ہم کو قرآن واپس شہر میں لانا ہے اور زندوں سنانا ہے۔ ہم کو طاق سے اتار طالب علموں کے ہاتھ میں قرآن دینا ہے تاکہ وہ صحیح اسلام کو پڑھ اور سمجھ سکیں۔

حج مسلمان کی ایک بڑی تربیت گاہ اور ادارہ ہے۔ مگر اس لاکھوں کے اجتماع سے مسلمان کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اسے بھی محض ایک رسم بنادیا گیا ہے۔ اتنا لمبا سفر' مال ودولت کا اسقدر خرچہ اور اتنی تکالیف اٹھانا کیا محض اس لئے ہے کہ ہم ایک زیارت گاہ کو جاکر دیکھ لیں اور چند رسمی عبادات کو دہرا کر جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس لوٹ آئیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ حج ایک روحانی مشن ہے اور مسلمانوں کی تربیت کا زبردست ذریعہ ہے مسلمان ایک مکعب نما خالی کمرے کے سامنے کھڑے ہوکر سوچتا ہے کہ اس میں تو کچھ نہیں۔ ایک خالی کمرہ اور بس۔ کیا یہی ہمارے ایمان' نماز' محبت' زندگی اور موت کا مرکز ہے۔ مگر سوچو تو کعبے کا خالی کمرہ ہونا ایک بڑی علامت ہے جو مسلمان کو یاد دلاتا ہے کہ تم حج کرنے آئے ہو کعبہ تمہاری منزل نہیں ہے۔ یہ تو اس منزل کی طرف راستے کی نشاندہی اور رہبری ہے۔

یہ تعمیر نہایت سادہ ہے۔ بجوں کے کالے پتھر ایک دوسرے پر رکھے ہیں۔ نہ اس

میں کوئی ڈیزائن ہے نہ آرائش یہ اتنا سادہ بے رنگ بے نقش نگار اس لئے ہے کہ اللہ جسم اور شکل نہیں رکھتا نہ اس کا کوئی رنگ ہے۔ مکعب ہونے کی صورت میں کعبہ کی کوئی سمت نہیں ہے مگر اس کے سامنے کھڑے ہو کر تم اللہ کا راستہ منتخب کرتے ہو یہیں قریب ہاجرہ کی قبر ہے۔ کوئی پیغمبر بھی اس مسجد میں دفن نہیں ہو سکتا مگر ہاجرہؓ کا گھر اللہ کے گھر کے ساتھ ہے۔ ہاجرہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ سارا کی ایک حبشی کنیز تھی۔ وہ ایسی مفلس اور اس حد تک بے وقعت تھی کہ حضرت سارا نے اس بات پر ذرا بھی اعتراض نہیں کیا کہ اولاد کی خاطر ان کے شوہر اس کنیز سے وابستہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں میں ایک عورت کو اور عورتوں میں ایک سیاہ فام کنیز کو یہ اعزاز بخشا گھر میں جگہ دی۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ وہ اللہ کے گھر آئی اور اس کی ہمسایہ بن گئی۔ اب اس چھت کے نیچے دو وجود ہیں۔ ایک اللہ کا ایک ہاجرہؓ کا۔ اس حج کے ارکان ہاجرہؓ کی یاد میں ہیں۔ ہجرت کے لفظ کا ماخوذ ہاجرہؓ سے اور لفظ مہاجر بھی۔

مناسک حج میں سعی بھی شامل ہے۔ یہ ایک مقصد کی طرف حرکت ہے۔ حرکت کے لئے عجلت اور دوڑنا مناسب ہے طواف کے دوران مسلمان ہاجرہؓ کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ اس تحریر میں علی شریعتی مناسک حج کی مختلف کیفیات اپنے انداز میں توجیح کرتا ہے۔ طواف 'حجراسود' مقام ابراہیم' قربانی 'سعی' عرفات مشعر کے روح افروز مطالب نکالتا ہے۔ عرفات علم و حکمت کا سمبل ہے۔ عرفۃ کی جمع عرفات ہے۔ جبکہ مشعر واحد کا صیغہ ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ حقائق کئی طریقے سے بیان کیے جاسکتے ہیں مگر حق ایک ہے۔

علی شریعتی یہاں علم کی حقیقت کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ علم اچھا اور برا نہیں ہوتا۔ اس کو خدمت کے لئے استعمال کیا جائے یا فریب کے لئے علم علم ہے۔ ہر جگہ اور ہمیشہ' مسلم غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں۔ علم کنڈیشنڈ ہوتا ہے شعور کے

ساتھ۔ شعور ہی وہ طاقت ہے جو علم و حکمت کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کراتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونسٹ نظام دونوں میں علم و سائنس کے ایک ہی معنی ہیں نازی سائنس دان بھی اتنا کچھ جانتے تھے جتنا ان کے قیدی۔ مذہب کے بارے میں خلفاء کے درباری علماء بھی اتنا ہی علم رکھتے تھے جتنا خلفاء کی جیلوں میں سڑنے والے عالم۔ جو چیز ایک کو جلاد دوسرے کو شہید' ایک کو ظالم دوسرے کو حریت پسند بناتی ہے وہ علم نہیں شعور ہے۔

حج اس پر اصرار کرتا ہے کہ شعور انسانی مقدس اور برتر ہے ایک طرف عرفات نظر ہے تو مشعر بصیرت ہے ایک ایسی بصیرت جو احساس ذمہ داری کو ابھارتی ہے۔ بصیرت و حکمت وہ علم ہے جو پیغمبر انسانوں کے پاس لائے۔ یہ چیز سائنس دانوں اور فلسفیوں کے ذریعے مہیا ہونے والی نہیں ہے۔ یہی وہ علم اور شعور آگہی ہے جس کا اسلام متمنی ہے۔ یہ یونیورسٹیوں' کالجوں' سکولوں اور کتابوں میں نہیں پڑھائی جاتی۔ یہ کلفتوں' مشقتوں اور جہاد کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ حکمت کے طلب گار مجاہد اور انسانیت کی آزادی کے پرچم بردار ہیں۔ حکمت کو سیکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت نہیں یہ تو خود روشنی ہے اس کی روشنی میں رات کے اندھیرے کو دیکھا جاسکتا ہے۔ پیغمبر اسلام آئے تو حکمت کی روشنی لے کر آئے۔ تاریکیاں یعنی قیصروکسریٰ تاراج ہوئے مگر کچھ ہی دنوں بعد قیصروکسریٰ کا تاج خلفا نے پہن لیا۔ پرانے بچاری اب امام اور قاضی بن گئے رومی شہنشاہیت کا نام خلافت رسول پڑ گیا۔ قتل عام کو جہاد کا نام دیا گیا اور عوام کی کسمپرسی اور پریشان حالی کو اللہ کی مشیت کہا گیا۔

یورپ میں سائنسی انقلاب نے چرچ کو زیر کیا اور سائنس نے مذہب کا منصب سنبھالا۔ قدیم مذہبی تعلیمی ادارے جدید یونیورسٹیوں میں تبدیل کردئے گئے۔ بلعم باعور نے چرچ کو خیرباد کہا اور یونیورسٹی میں آکر بیٹھ گیا۔ انقلاب فرانس نے زمینداری ختم کی تو قارون دوڑا دوڑا شہر آیا اور ایک بنک کھول لیا شینڈل (Schandel) کا کہنا

ہے کہ آج انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ایٹم بم نہیں بلکہ فطرت انسانی کو تبدیل و مسخ کرنے کی کوشش ہے۔ آدمی کے اندر موجود انسانیت کے عنصر کو سرعت کے ساتھ ڈھاکر ایک غیر انسانی نسل کو وجود پذیر کیا جارہا ہے ایک ایسی مشین جس کی شکل آدمی جیسی ہے مگر اس کو نہ اللہ نے بنایا ہے نہ فطرت نے۔ انسان آج ایک ایسا غلام ہے جو نہیں جانتا کہ اس کا آقا کون ہے۔ اس کو بس اس حد تک آزادی ہے کہ وہ اور بہتر غلام بن سکے۔ وہ قیمت سے خریدا جاتا ہے مگر اپنی قیمت خود ادا کرتا ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے گھروں کے سامنے گھنٹوں لائن میں کھڑا رہتا ہے۔ اس انتظار میں کہ اس کی باری آئے تو وہ بھی ڈاکوؤں کے ہاتھوں لوٹا جائے آج کے دور کی سب سے بڑی ٹریجڈی اجنبیت (Alenation) ہے۔ انسان اپنے آپ سے بیگانہ ہوتا جارہا ہے چودہ سو سال میں سورۃ والناس کی عظیم آیتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حج ان تمام اسباق کو یاد دلانے کی ایک سعی اور تربیت ہے۔ امام حسین نے ایک جگہ حج کو روک کر سفر جہاد شروع کردیا تھا۔ اگر یزید موجود ہے تو کعبہ کے چاروں طرف طواف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایام جاہلیت میں کعبے کے بتوں کے چاروں طرف طواف ہوتا تھا۔

شہادت

یہ علی شریعتی کی ایک اور تصنیف ہے جس میں اس نے فلسفہ شہادت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور شہادت کو شہید سے بھی بلند مرتبہ قرار دیا ہے۔ شہادت کا درجہ واقعی حسینؓ سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ تبھی تو امام عالی مقام نے اسے اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے پسند فرمایا۔ اس کتاب میں شہادت اور امامت کی مختلف کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ نبوت کے بعد جو امامت علی مرتضیٰؓ سے شروع ہوئی وہ امام حسنؓ سے ہوتی ہوئی امام حسینؓ تک پہنچی تو انہوں نے تنہا' بے وسیلہ اور نہتا ہونے کے باوجود اسے قبول کیا اور اسلامی انقلاب جس کا آغاز ان کے نانا نے شروع کیا تھا اسے اپنا

خون پلا کر زندہ رکھا۔ جبروجور کی قوتوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور اسلام میں در آنے والی خاندانی ملوکیت اور قیصریت کے خلاف یکہ تنہا سینہ سپر ہو گئے۔

دولت' اقتدار اور مذہبی طبقوں نے اسلامی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں ہی سچے انقلاب اسلامی کے خلاف گٹھ جوڑ کرلیا تھا اور اسلام سے اس کی غریب پرور روح کو نکال کر اس میں شاہانہ تجمّر اور قارون بلعم باعور کے انداز خسروانہ شامل کردیئے تھے۔ امام حسینؓ سچے دین اسلام کو زندہ رکھنے کے لئے میدان میں آئے۔ ان کو اس جدوجہد کا انجام معلوم تھا۔ ایسٹیبلشمنٹ کی اتنی بڑی طاقت کے مقابلے میں ان کو اپنا زور معلوم تھا۔ شہادت یقینی اور واضح طور پر سامنے نظر آرہی تھی۔ مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ ایک طرف دین تھا دوسری طرف زندگی کے آرام و آسائش تھے۔ حسینؓ نے دین کا انتخاب کیا۔ چنانچہ دین کی حفاظت میدان کربلا میں خون کے نذرانے کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ اس کو مارنے والے خود مرگئے اور حسینؓ زندہ رہا۔ اس کا دین زندہ رہا۔ نبیؐ کے گھر کی عظمت و عزت زندہ رہی۔ شہیدوں کے گھر کا لاڈلا شہید اعظم زندہ رہا۔

شہادت حسینؓ ایک مشن ہے ایک علامت ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک زندہ و تابندہ مثال ہے اس بات کی کہ اصول و نظریہ کے لئے موت کو گلے سے لگانا سچے مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے۔ اسلام میں موروثی ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام میں فاسق وفاجر کا کوئی مقام نہیں۔ اسلام میں سرخ سبز محلات کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہی کچھ شہادت حسینؓ نے ثابت کیا اور یہی تاریخ کا سچ ہے جو سورج کی طرح روشن ہے۔ یہ درست ہے کہ بظاہر ملوکیت اور اس کے پرستار جیت گئے اور اب تک جیتے ہوئے ہیں۔ مگر بالآخر اس ملوکیت کا سورج غروب ہوگا۔ اور فتح بھوکے ننگے برہنہ پا انسانوں کی ہوگی جن کو قرآن میں بارہا والناس کہہ کر پکارا گیا ہے اور جن کو فتح کی نوید دی گئی ہے۔

فاطمہؓ فاطمہؓ است

یہ ڈاکٹر علی شریعتی کی ایک بڑی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی مختلف الہامات شخصیت کا تجزیہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ فاطمہؓ دختر پیغمبرؐ ہمسر علیؓ اور مادر حسنینؓ وزینبؓ ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھیں۔ وہ ایسی خاتون تھیں جو انقلاب اسلام کی وارث تھیں اور انہی کے نور سے وہ شرار پھوٹے جنہوں نے انقلاب کو میدان کربلا میں اپنے خون سے لالہ زار کیا۔ اس کتاب کی تصنیف وتدوین جو حسینہ ارشاد میں ان کے لیکچروں پر ہی مبنی ہے ڈاکٹر شریعتی نے پروفیسر لوئی ماسینون(Louis Massignon) کی موقر تحقیقی دستاویز سے استفادہ کیا جو اول الذکر نے ایک مستشرق کی حیثیت سے حضرت فاطمہؓ کی زندگی کے بارے میں تالیف کی تھی۔ شریعتی نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے خود اس کتاب کی تالیف میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ایک گونہ حصہ بھی لیا ہے بالخصوص اس تحقیقی کام کے ابتدائی مرحلہ میں جو اسناد اور معلومات کی جمع آوری کے مرحلہ تھا۔ یہ علمی کارنامہ علی شریعتی کے زمانے تک غیر مطبوعہ تھا چنانچہ اس کتاب کے متن سے براہ راست واقفیت رکھنے کی وجہ سے وہ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ جو اصحاب اپنے دین ومذہب کو بھی مغرب کے حوالے سے پڑھتے اور سمجھتے ہیں وہ بھی اس کتاب کے وجود سے بے خبر ہیں۔

وہ پروفیسر ماسینان کے بنیادی نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ تاریخ کا جبر عورت کو ایک مصنوعی قالب میں ڈھالنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوچکا ہے۔ قدیم عورت کا روایتی چہرہ ہو یا جدید عورت کا مصنوعی چہرہ دونوں انسانیت کے اس جوہر سے عاری ہیں جو عورت کی اصل اور مستقل حیثیت اور فطرت کو نمایاں کرتا ہے وہ حقیقی اسلام اور حکومتی اسلام کے فرق کو نمایاں کرتا ہے اور اس بات پر فخر کا اظہار کرتا ہے

ملت ایران نے عزت رسولؐ کو اپنا مرکز جان اور مان کر اپنی تاریخ کے سفر کو طے کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دمشق کے قصر خضرا کی چمک اور بغداد کے الف لیلوی شہر کے سحر کو رد کر کے ملت ایران کی نظر ایک مٹی کے چھوٹے سے گھر پر ٹھہرتی ہے۔ یہ علیؑ اور فاطمہؑ کا گھر ہے۔ "ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ اسلام اسی اداس اور خاموش گھر میں مکیں ہے۔"

انہوں نے وضاحت کی کہ ہم نے محمدؐ کے ساتھ علیؑ کا اضافہ نہیں کیا بلکہ ہم نے علیؑ کا دامن پکڑ لیا تاکہ ہم محمدؐ کو گم نہ کر دیں۔ ہم نے سنت پیغمبر کے ساتھ عترت پیغمبر کا اضافہ کیا ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ اسلام کے نام پر حکومت کرنے والے مسلمان حکمران درحقیقت قیصر و کسریٰ اور ابوجہل و ابوسفیان کے جانشین تھے ہم نے ان کا تتبع کرنے کی جگہ ابوترابؑ کا دامن تھام لیا۔ یہ صرف ہم ہی تھے جنہوں نے اسلام کے نام پر ملوکانہ استبداد نافذ کرنے والوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا ہم نے شہادت کا انتخاب کر کے حکومت کی طاقت کی نفی کر دی۔ ہم نے آسان راستہ چھوڑ کر مشکل راستہ اختیار کیا۔ بنی امیہ اور بنی عباس سلاطین ترک و مغول کے اذیت خانے اس بات کے گواہ ہیں کہ ہر دور میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے لوگ ہم ہی تھے۔ وہ خلیفہ متوکل اور عالم دین ابن سکیت کا ذکر کرتا ہے۔ ابن سکیت متوکل کے دو بیٹوں معتز اور مویّد کا اتالیق تھا۔ ایک دن خلیفہ نے اس سے پوچھا کیا تمہارے نزدیک میرے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ سے افضل نہیں۔ ابن سکیت نے بلا کسی توقف کے یہ کہہ کر اپنی زبان گدی سے کھنچوا دی کہ علی کا غلام قنبر تم سے اور تمہارے دونوں فرزندوں سے بدرجہا افضل ہے۔ یہاں علی شریعتی کے قلم سے شعریت کا شہد ٹپکنے لگتا ہے۔ ابن سکیت جیسے علما ہی تھے جن کے صبر و سکوت کو دیکھ کر جابر حکومتوں کے قید خانے فریاد کرتے ہیں جن کے خون آلود چہروں کی تازگی کو دیکھ کر جلاد شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور جن کی پشتیں ان چٹانوں کی طرح مضبوط اور مستحکم ہیں جن پر

تشدد کر کے خود ظالموں کے کوڑے دردمند ہو جاتے ہیں۔

علی شریعتی کے نزدیک ہر انقلاب کے اجزائے ترکیبی دو عناصر ہیں یعنی عقل اور عشق۔ ایک روشنی ہے دوسرا حرکت۔ ایک لوگوں میں شعور اور آگہی پیدا کرتا ہے اور ان کو دانائی و بینائی عطا کرتا ہے تو دوسرا ان میں جوش اور جذبہ اور ذوق عمل ابھارتا ہے۔ الیکس کارل کے بقول عقل موٹر کی روشنی ہے اور عشق اس کا انجن۔ اسی طرح دین اسلام کی دو بڑی بنیادیں ہیں۔ کتاب اور جہاد۔ کتاب علم ہے اور جہاد عشق۔ ان دونوں میں خط فاصل تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ ان دونوں خصوصیات کا اجتماع علیؑ کی ذات ہے جو باب العلم بھی ہیں اور شہید مجاہد اور شہیدوں کے باپ بھی۔ علی شریعتی آگے چل کر ایک اہم نکتہ بیان کرتا ہے کہ اسلامی دنیا میں علما علم ہیں اور عوام عشق۔ جب تک یہ دونوں ساتھ نہیں چلیں گے انقلاب رونما نہیں ہوگا۔

علی شریعتی اسی کتاب میں رونے رلانے کی حقیقت بھی بیان کرتا ہے اور اس عمل کو روح کا وضو قرار دیتا ہے بشرطیکہ یہ گریہ اندر سے خود بخود پھوٹے۔ بقول ریگی ڈی برے Regi Debre (فرانس کا مشہور انقلابی جو لاطینی امریکہ میں بفنس نفیس سرگرم عمل رہا) وہ انسان جو کبھی نہیں روتا اور جس کا دل ذوق گریہ سے عاری ہے اس میں درحقیقت انسانیت کی کمی ہے وہ ایک بے حس و حسن پتھر ہے۔ آنسو اگر سچے ہوں اور پیاز کے مرہون منت نہ ہوں تو صداقت کا شاہکار ہوتے ہیں۔ شعر کا حسن عشق کی بے تابی' ایمان کا سوز و گداز' شوق کی بے کلی' احساس کی تب و تاب جب کسی دل میں باہم گھل مل جاتے ہیں تو ایک قطرہ گرم آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے اس کا نام آنسو ہے جو محبت کی سب سے کھری زبان ہے اور جو اظہار جذبات کا لطیف ترین پیرایہ ہے ہمارے عوام محبت کی اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے عوام فلسفی ہیں نہ عالم وہ صرف محبت کرنے والے ہیں مگر وہ جھوٹے آنسوؤں سے خبردار بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مت بھولئے کہ امام حسینؑ کی شہادت

پر جس شخص نے سب سے پہلے گریہ کیا تھا وہ عمر ابن سعد تھا اور اس طرح کے جھوٹے رونے پر جس ہستی نے سب سے پہلے ملامت کی تھی وہ جناب زینبؑ تھیں اور یہ بات بھی یاد رکھئے کہ امام حسینؑ کے لئے جو پہلی رسمی اور دکھاوے کی مجلس برپا ہوئی اس کا محل وقوع دربار یزید تھا۔ ایسے اشکوں کی مثال اس بارش کی سی ہے جو کسی شور زمین پر برستی ہے۔ ہماری اکثریت اسی قسم کے آنسو بہاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری سعی بے ثمر رہتی ہے۔

قصور کس کا ہے۔ قصور علماء کا ہے جو شعور پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ہماری بے حسی دیکھئے لامار تین LAMARTINE فرانس کا رومانیت پسند مصنف ہے اس کی تمام کتابیں فارسی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یونان کی زن فاحشہ بلقیس کے تمام اشعار کا فارسی میں خوبصورت ترجمہ موجود ہے لیکن علی کا خطبہ یا ان کا ایک قول بھی فارسی میں ترجمہ نہیں ہوسکا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم جبین کی جگہ جیب پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ ہم سال میں دس لاکھ سے زیادہ مجالس ان ہستیوں کے نام پر منعقد کرتے ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ علماء اور ستر ہزار سے زیادہ روضہ خواں ان رقوم سے استفادہ کرتے ہیں جو عوام مذہبی کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ ہم علماء عوام کی ان قربانیوں کو صحیح سمت نہیں دے سکے اور محض رونے رلانے کے عمل کو ہی دین کا متبادل سمجھ لیا ہے۔ عوام کو دین کی اس توجیح پر لگا کر ہم نے چند ہزار نفوس کو کل قومی آمدنی کے دو تہائی پر قبضہ کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ان لوگوں کا اسلام بقول سید قطب "امریکی اسلام" ہے ایک ایسا مذہب جو انسان کو ہر قسم کی ذمہ داری، ایثار اور عمل کی زحمت سے بے نیاز کردیتا ہے۔ یہ بے مسئولیت، بے رحمت اور بے خرچ اسلام ہے۔ اس امریکی اسلام کے پیروکار ہی نظریاتی بحثوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کے حصہ اول میں سوشیالوجیکل اسالیب کے مطابق مشرق و مغرب کی خواتین کے کردار اور اس کے تاریخی ارتقا کا بھرپور علمی تجزیہ کیا گیا ہے اور عورت

کے وہ چہرے دکھائے گئے ہیں جو مشرق و مغرب میں مختلف اوقات میں نظر آتے رہے ہیں۔ ان علمی بحثوں میں خواتین کے مسائل اور مشکلات اور مختلف ادوار میں اس پر ہونے والے مظالم کی تصویر آنکھوں کے سامنے لائی گئی ہے۔ یہ تصنیف زبردست علمی تجزیہ ہے جو پڑھنے کی چیز ہے کتاب کا بقیہ نصف حصہ حضرت فاطمہ الزہراؑ کی حیات کا بصیرت افروز تذکرہ ہے جسے پڑھ کر فرط جذبات سے رونا تو آتا ہی ہے رشک بھی آتا ہے اس بزرگ ہستی پر جس نے سایہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پرورش پائی اور زندگی علیؑ کی معیت میں گزاری۔ اس حصے میں علی شریعتی اپنی خطابت کے عروج پر نظر آتا ہے اپنی عقیدت کے سارے پھول وہ حضرت فاطمہؑ کے قدموں میں نچھاور کرتا ہے اور مسلمان قوم کو بتاتا ہے کہ فاطمہؑ کی صورت میں رب جلیل نے کیسی ہستی ہم کو بخشی تھی۔ فاطمہؑ ایک ودیعت تھی جو پلٹا دی گئی تھی اور رہن چھڑا لیا گیا تھا۔ اس کے اعزازات بے شمار ہیں اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ حسینؑ کی ماں تھی۔

"روشن شناخت اسلامی"

اس نام سے علی شریعتی نے اکتوبر 1968ء میں حسینیہ ارشاد میں دو لیکچر دیئے۔ ان لیکچروں میں اس نے اسلام کی صحیح تفہیم کے لئے مختلف نکتہ ہائے نظر کا علمی تجزیہ علم سماجیات کی روشنی میں کیا۔ اس نے سب سے قبل اس سوال کو لیا جو آج کے اکثر لوگ کرتے اور سنتے ہیں۔ یعنی باتیں بہت ہو چکیں' رونا دھونا کافی ہو گیا اب عمل کا وقت ہے۔ بس ایک دم عمل کے میدان میں کود پڑنا چاہئے۔ وہ اس لیکچر میں اس مفروضے کی حقیقت بیان کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ باتیں تو ہوئی ہی نہیں۔ جس سڑک پہ ہم نے جانا ہے اس پر تو ہم نے سفر ہی شروع نہیں کیا۔ ہم نے اپنے حقیقی مسائل پر گفتگو کی ہی نہیں۔ نہ ہمیں اپنے دکھوں کا صحیح علم ہے اور نہ ان کے مداوے

کا۔ ہم تو کسی اور چیز کے متعلق باتیں کرتے رہے ہیں۔ ہم کسی ایسی چیز کو موضوع سخن بناتے رہے ہیں جس کو ہم جانتے ہی نہیں۔ مثلاً" ہم ایک مذہبی سوسائٹی ہیں۔ ہم صدیوں سے مذہب پر باتیں کرتے چلے آئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ مذہب ہے کیا۔

ہم اپنے مذہب کو ہی نہیں جانتے تو اس پر لاکھ باتیں کریں' نسوے بہائیں' دانش و حکمت کے طومار جمع کریں۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ میں ایک استاد ہوں۔ جب میرے طلبا مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کون سی کتابیں پڑھیں کہ مذہب کو صحیح طور پر سمجھ سکیں تو میری زبان گنگ ہو جاتی ہیں کیونکہ ایسی کتابیں ہیں ہی نہیں۔ یہ کسقدر باعث شرم بات ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی علیؓ سے ہم مسلمانوں کو جارج جور داق اور ابوذر غفاریؓ سے جودت السحر متعارف کرواتے نظر آتے ہیں۔ سلمان فارسیؓ جو ایرانی نسل کے پہلے ایرانی مسلمان کے طور پر ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں ہم سے نا آگاہ ہیں۔ اس پر پہلی کتاب ایک فرانسیسی نے لکھی۔ اپنی فارسی میں اس پر لکھے ہوئے چار صفحے بھی ہمارے پاس موجود نہیں۔ ایسے حالات میں کیسے یقین کرلیا جائے کہ بس باتیں بہت ہو چکیں اب کام شروع کیا جائے۔ اس لئے میرے نزدیک ہمارا سب سے اہم کام صحیح تناظر میں مذہب کو موضوع سخن بنانا اور سائنسی اور علمی انداز فکر اپنانا ہے۔ اسلام کو ہمیں علمی تنہائی ISOLATION میں نہیں بلکہ ایک کلی نظام کے طور پر دیکھنا ہو گا اسے ایک ورلڈ سسٹم سمجھنا ہو گا اور اس کی تمام جہات کی صحیح نشاندہی اور ان کا تجزیہ کرنا ہو گا آج کی زبان میں آج کے لوگوں کے لئے۔

میں چونکہ سوشیالوجی کا طالب علم ہوں۔ اس لئے میری کوشش ہے کہ میں جدید علوم کی روشنی میں اسلامک سوشیالوجی کا ایک تصور ابھاروں۔ میں نے دوران مطالعہ یہ محسوس کیا ہے کہ حضور پاکؐ کی حیات طیبہ اور ان کے اسالیب جدوجہد میں تاریخ و سوشیالوجی کا علمی و سائنسی ترتیب و توازن نظر آتا ہے۔ اسلام اور قرآن جدید تصورات

کا ایک جہاں بے کراں ہے۔ ہر چیز مبنی بر حقیقت ہے۔ قرآن ہر زمانے کے تقاضوں سے آگاہ ہے۔ میں نے انسانی آسائش کے کتنے ہی موضوعات کتاب اللہ میں تلاش کئے ہیں۔ ہجرت کے واقعے کو ہی لے لیجئے۔ یہ محض چند انسانوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا نام نہیں۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑا فلسفہ کار فرما ہے۔ تمام بڑی تہذیبیں ہجرت کی کوکھ سے ہی نمودار ہوئی ہیں۔ مگر اس نکتے کی سائنسی ماہیت کو نہیں سمجھا گیا۔ سومیریہ کی اولین تہذیب سے جدید ترین امریکی تہذیب تک تمام 27 بڑی ہجرتیں اس نکتے کی تفسیر ہیں۔

میں بطور سوشیالوجسٹ تغیر' ارتقا اور انقلاب کے موضوعات پر تفکر کرتا ہوں۔ ہجرتوں کے ساتھ ہی یہ تغیر انقلاب بن کر رونما ہوجاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ پودا جو ایک زمین میں لگا ہے پھلنے پھولنے سے قاصر ہے۔ جونہی اس کی زمین' آب وہوا تبدیل ہوئی پھلنے پھولنے لگا۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں سے سماجیات کے مفکرین ایک سوال بار بار اٹھاتے ہیں کہ تاریخ کی قوت محرکہ کیا ہے۔ تاریخ کا انجن اور موٹر کس چیز کو کہیں گے۔ کچھ لوگ تغیر کو صرف حادثہ قرار دیتے ہیں کچھ دوسرے لوگ سمجھتے ہیں کہ تغیر ایک درخت کی مانند ہے اور تاریخ زمانے کے سینے پر نصب ایک پودا ہے جو خود بخود بڑھ رہا ہے۔ پھل پھول رہا ہے اور بس۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخ نام کی کوئی چیز ہے نہیں۔ یہ بس گزرے ہوئے واقعات کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کی کوئی ابتداء وانتہاء نہیں ہے کچھ حضرات کا خیال ہے کہ افراد کا تاریخ کی تعمیر وتشکیل میں کوئی کردار نہیں ہوتا اور فطرت اور قدرت ان حالات و واقعات کو مابعد الطبیعاتی انداز میں تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلے میں افراد کے بطور ہیرو پرستش کرنے والے مورخوں کا ایک گروہ ہے جو سمجھتا ہے کہ تاریخ انہی افراد کی ذاتی کاوشوں کا شاخسانہ ہے(کارلائل وایمرسن) ان کے نزدیک عوام الناس کا تاریخ میں کوئی رول نہیں ہوتا۔ وہ تاریخ اور تاریخ ساز شخصیتوں کا چارہ ہیں۔ ایمرسن کا کہنا ہے کہ

مجھے نامور لوگوں کے نام بتاؤ اور میں تمہیں پڑھے بغیر پوری تاریخ سنادوں گا۔ گویا تاریخ چند مخصوص اور برگزیدہ افراد کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی ہے۔

علی شریعتی اس بات پر اظہار تاسف کرتا ہے کہ کوئی بھی ایسا سکول آف تھاٹ تاریخ عالم میں وجود نہیں رکھتا جو عوام الناس کی قدرت و قوت کا مداح ہو۔ جمہوریت کا سکول عوام الناس کے صرف ووٹوں کو زیر بحث لاتا ہے عوام الناس کو بطور ایک تاریخی قوت اور فیکٹر کے وہ بھی زیر بحث نہیں لاتا۔ یعنی عوام ووٹ تو دیتے ہیں لیڈر تو بناتے ہیں تاریخ اور تقدیر نہیں بناتے۔ ان سب کے مقابلے میں اسلام اور قرآن والناس کو مرکز اور محور بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بار بار اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتا ہے کہ تمہارا کام صرف پیغام نشر کرنا ہے۔ والناس کو راستہ دکھا کر چلے آو۔ تم ان کے انکار واقرار سے دل برداشتہ نہ ہو۔ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ عوام الناس خود اپنے بھلے برے کے ذمہ دار ہیں۔ "نبوت کا راستہ بند کرکے رب جلیل نے اس تصور پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ عوام الناس خود تاریخ وتقدیر بنانے پر قدرت رکھتے ہیں" (ظ ا)۔ جب حضرت محمدؐ کا پیغام مکمل ہوا تو ان کو واپس بلا لیا گیا۔ گویا اب تاریخ کی باگیں عوام الناس کے ہاتھوں میں چھوڑ دی گئی۔ اس لئے قرآن کے مخاطب "والناس" عوام (دی پیپل) ہیں۔ معاشرے کی ترقی یا تباہی کی ذمہ داری والناس کے حوالے کردی گئی۔ والناس کا ترجمہ عوام (MASSES) ہے جس میں تمام انسان بلا تفریق طبقہ' زبان' لباس' علاقہ' رنگ ونسل شامل ہیں۔

اسلام کی رو سے سماجی تغیر کے چار عوامل ہیں۔ اول عظیم شخصیتیں' دوم وقت کا تسلسل اور روایات سوم حادثات واتفاقات اور چہارم عوام الناس کا اجتماعی شعور و عمل۔ اسلام انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ جب وہ والناس کو مخاطب کرتا ہے تو وہ عوام الناس کے اجتماعی شعور یعنی سوسائٹی کی قوتوں کا ذکر کرتا ہے۔ اسلام جہاں یہ کہتا ہے کہ تم کو وہی کچھ ملے گا جو تم خود کماؤ گے تو وہ فرد سے

مخاطب ہے۔ اسی طرح جب وہ کہتا ہے کہ خدا اس قوم کی حالات نہیں بدلتا جسے اپنی حالت بدلنے کا خود خیال نہ ہو تو وہ والناس یعنی سوسائٹی سے بحیثیت اجتماع مخاطب ہے۔ حالات کو بدلنے کی ذمہ داری شعور انسانی کے حوالے سے کی گئی ہے جس شخص کا شعور پختہ ہو گا۔ اسی قدر اس پر معاشرے کو بدلنے کی ذمہ داری عائد ہوگی جانوروں پر معاشرے کے بدلنے کی کوئی ذمہ داری نہیں مگر انسان کو اس شعور کے ساتھ کام کرنے کی آزادی بھی دی گئی۔ دو انتہائی تصورات جبر و قدر کے مابین اسلام انسان کو وسط کی راہ دکھاتا ہے۔ یعنی انسان اپنے اعمال وافعال میں آزاد بھی ہے یعنی وہ اس باب میں کسی جبر کا زندانی نہیں۔ مگر اسے فطرت کے قوانین کے دائرے کے اندر بھی رہنا ہے جو پہلے سے طے شدہ ہیں۔ یعنی پودوں کا لگنا اور اگنا فطرت کے قانون کے تحت ہے۔ مگر پودوں کا لگانا انسان کے بس میں ہے۔ اگر وہ پودے لگائے گا تو فطرت ان کو ضرور اگائے گی اور انسان کے ارد گرد درختوں پر پھولوں سبزوں کے گلزار کھل اٹھیں گے۔ اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے صرف یہ سوچے کہ فطرت خود اس کے لئے سب کچھ اگا دے تو وہ پھر صحرا نشین ہی رہے گا تا آنکہ کوئی حادثہ یا اتفاق خود بخود ایسا نہ کردے اور ایسے حادثات واتفاقات بھی فطرت کے اصولوں کا حصہ ہے۔ فطرت بڑے انسانوں کو وقتے وقتے سے ابھارتی رہتی ہے جو دوسروں کے کام کرتے رہتے ہیں۔ ایسے بڑے انسان اصول فطرت کو دوسرے انسانوں کے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ نبضوں پر صحیح جگہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان میں اور دوسرے انسانوں اور دانشوروں میں من جملہ اور امتیازات کے ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ وقت اور فطرت دونوں کو سمجھ لیتے ہیں یا سمجھا کر بھیجے گئے ہوتے ہیں۔ اسی قوت امتیازی کی بناء پر وہ نئے سماج تخلیق کرتے ہیں نئی تہذیبیں اجالتے ہیں۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ سماج کی تقدیر کو چار عناصر متاثر کرتے ہیں جن میں دو یعنی والناس اور تسلسل زمان سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی

چاہیئے کہ قیادت کی ضرورت پسماندہ معاشروں کو زیادہ ہوتی ہے۔ جب معاشرے ترقی کر جائیں تو سسٹم یا NORMS کام کرتے ہیں۔ اجتماعی حیات کی ترقی کے ان اسالیب کی طرح افراد کی انفرادی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں جو عناصر کار فرما ہوتے ہیں کم و بیش پانچ ہیں یعنی ماں، باپ، سکول، معاشرہ، ماحول اور اجتماعی معاشرتی ترقی یا زمانہ۔ ان اصولوں کی روشنی میں اگر پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں عناصر و عوامل سے انکی زندگی کو مبرا رکھ کے نبی پاک کی حیات کو نمونہ عالم بنایا۔ ماں باپ دونوں ان کے بچپن میں فوت ہو چکے تھے۔ سکول مدرسہ نہ تھا، صحرا نشین تھے اور اس وقت کا عرب معاشرہ قیصر و کسریٰ کے ثقافتی سفر کے اثرات سے محفوظ تھا۔ یہ سب خلا ایک ڈیزائن کے مطابق رکھے گئے تھے۔ تاکہ یہ عظیم ہستی ان کو اپنے ودیعت کردہ کمالات سے پر کرے اور نئی تہذیب کو جنم دے۔

سوشیالوجی آف اسلام

اگرچہ اس لیکچر کو یہ نام نہیں دیا گیا۔ مگر اس میں علی شریعتی نے اسلامی سوشیالوجی کے خدوخال معین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت ہی مفید اور منطقی مقالہ ہے۔ جس میں دانش و حکمت کے ستارے جگمگا رہے ہیں وہ سب سے پہلے تاریخ کے حوالے سے میتھاڈالوجی (طریقہ کار) پر بحث کرتے ہوئے سائنس کی دنیا میں COGNITIVE طریقہ کار کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یورپ ایک ہزار سال تک عہد وسطیٰ کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے بعد ایک دم روشنیوں میں نہا گیا۔ انسانی افکار میں ایک دھماکہ ہوا اور نئی تہذیب، ثقافت کا پھریرا لہرا اٹھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صداقت کو دریافت کر لیا تھا اور یہ سب کچھ طریقہ کار METHODOLOGY کی تبدیلی سے ہی ممکن ہوا۔ عہد وسطیٰ جاہلانہ یورپ کے جمود و سکوت کی بڑی وجہ ارسطو کا مکتب فکر MEGHOD

ANALOGICAL تھا۔ جونہی اہل یورپ نے اس طریقہ کار کو بدل۔ تو ان کی زبان زمانہ اور سوسائٹی تبدیل ہوگئی۔ نشاۃ ثانیہ کی بنیاد یہی میتھاڈالوجی یا انداز فکر کی تبدیلی تھی۔ اس کے نتیجے میں ان کی فیوڈل سوسائٹی بورژوا میں تبدیل ہوئی۔ زمینداری کی جگہ سرمایہ داری نظام آیا۔ نظام پر پڑی ہزاروں سال کی گرد چھٹی اور مسلم اور عیسائی دنیاؤں کے درمیان جو ایک مغائرت کی دیوار صدیوں سے کھڑی تھی وہ بھی اس طریقہ کار کے تغیر کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ انالوجیکل منطق کی جگہ تحقیق تجزیہ کھوج اور تنقیدی نگاہ نے نظر کا رواج ہوگیا ہر چز کے جواز کو چیلنج کیا گیا۔ سوال اٹھائے گئے۔ جس کے نتیجے میں سائنسی اور صنعتی انقلاب یورپ کے گلی کوچے میں پھیل گیا اور یورپی سماج وسامراج کی فتح مندی ظاہر ہونے لگی۔

ارسطو اور افلاطون بلاشبہ بہت بڑے جینئس تھے۔ ان کے مقابلے میں فرانسس بیکن اور روجر بیکن کی ذہنی استطاعت اس قدر بلند نہ تھی مگر انہوں نے صحیح میتھاڈالوجی کو کام میں لاکر صداقت کا چہرہ دریافت کرلیا آج انسانیت ان کی مقروض ہے سارا یونان اور اس کا فلسفہ مل کر ایک پیسہ ایجاد نہ کرسکا (پیسہ ہندوستان والوں نے ایجاد کیا تھا) جبکہ یورپ کا ایک معمولی ہنرمند جو ارسطو کے شاگردوں کا شاگرد بننے کا بھی اہل نہیں سینکڑوں ایجادات کا موجد ہے۔ ایڈیسن کی مثال کو سامنے رکھیں۔ اس کی ذہنی استعداد کا مقابلہ ارسطو وافلاطون یا اس کے شاگردوں سے کریں تو معلوم ہوگا کہ جو کام سارا یونانی فلسفہ ڈھائی ہزار سالوں میں نہ کرسکا وہ ایک شخص نے کر دکھایا۔

آگے چل کر علی شریعتی کہتا ہے کہ کسی اعتقاد کو محض اپنا لینا کوئی نیکی نہیں ہے بلکہ اصلی نیکی اس عقیدے کو سمجھنا اور اس پر صحیح طریقے سے عمل پیرا ہونا ہے۔ اور صحیح طریقے پر عمل پیرا ہونے کے لئے صحیح طریقہ کی میتھاڈالوجی کو جاننا ضروری ہے۔ اسلام ایک متنوع الہامات دیں ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان رشتہ اس کی محض ایک جہت ہے۔ اس کی ایک اور جہت بندے کی اس کائنات میں زندگی اور اس کا تسلسل ہے۔ بندے کا بندے سے تعلق، اشیا سے تعلق، ماضی حال و مستقبل سے تعلق، خاندان، حکومت، سائنس و حکمت سے تعلق، وغیرہ ان تمام امور پر کسی واحد زاویے سے روشنی نہیں ڈال جا سکتی ہے۔ کوئی سنگل میتھاڈالوجی کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انسانی ذہن نے جو نئے طریقہ ہائے کار سائنس، تاریخ اور سماجیات کے حوالے سے وضع کئے ہیں ان کو ہی کام میں لاکر ان سوالات کو آج کی اصطلاحات میں سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے۔ آج تک اسلام قرآن اور بندے کو ان علوم کی روشنی میں نہیں دیکھا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ علوم خود بہت نئے ہیں ابھی علم نفسیات، سماجیات کی عمر ہی کیا ہے۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ وہ بطور ایک سوشیالوجسٹ اس کام کو آگے بڑھانے کی اپنی سعی کر رہا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ اس علم کی روشنی میں میں مذہب کو ایک فرد INDIVIDUAL کے طور پر فرض کرتا ہوں۔ کسی فرد کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے پہلی چیز جو دیکھنی پڑتی ہے وہ ہے اس کے اپنے خیالات، نظریات اور لکھے ہوئے الفاظ۔ دوسری چیز جو اس باب میں مد نظر رکھنی پڑتی ہے وہ ہے اس شخص کی سوانح حیات۔ مذہب کے نظریات اس کی لائی ہوئی کتاب میں ہوتے ہیں اور اس کی بائیو گرافی اس کی تاریخ پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے مذہب اسلام کا مطالعہ بطور ایک فرد کے کرتے ہوئے ہمیں قرآن اور تاریخ اسلامی کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس وقت جو مسلم نشاۃ ثانیہ کی لہریں اٹھتی دکھائی دے رہی ہیں ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اسلام قرآن اور تاریخ کا مطالعہ علوم

جدیدہ کی روشنی میں کریں۔

دین اسلام کو سمجھنے کا ایک اور طریقہ کار بھی موجود ہے۔ جسے میتھالوجی آف ٹائپالوجی TYPOLOGY کہا جاتا ہے جس کے تحت موضوعات وافکار کی درجہ بندی کرکے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے بعض انسانی علوم کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے یورپ میں یہی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے اسی اصول کے تحت علی شریعتی نے بھی ایک اسلامی ٹائپالوجی وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تکنیک کے تحت ہر مذہب کے پانچ بنیادی پہلوؤں کو سامنے رکھا جاتا ہے اور پھر دوسرے مذاہب میں موجود اس کے مقابل پہلوؤں کا موازنہ کیا جاتا ہے یہ پانچ پہلو درج ذیل ہیں۔

1 ہر مذہب کے خدا کا تصور (اللہ)

2 ہر مذہب کے پیغمبر کا تصور (پیغمبر اسلامؐ)

3 ہر مذہب کی کتاب (قرآن)

4 ہر مذہب کے مخاطبین (والناس)

5 ہر مذہب کی نمائندہ شخصیتیں (عمرؓ، علیؓ، حسینؓ، ابوذر غفاریؓ)

اسلام کا خدا غفور الرحیم ہے جبار و قہار ہے۔ اسلام کا قرآن صرف مذہبی اور امور کو ہی زیر بحث نہیں لاتا بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ پیغمبر اسلام کی شخصیت محض ایک روحانی پیشوا کے نہیں بلکہ وہ ایک حکمران، جج، سپہ سالار، عام شہری، باپ، دوست، رشتہ دار، اور عالم کے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہر پہلو سے اگر اسلام کو دیکھا جائے تو وہ دوسرے ادیان پر برتر نظر آتا ہے۔ ابراھیمی پیغمبروں کی سب سے بڑی خصوصیت رہی ہے کہ وہ جمود وسکوت کی موجود قوتوں کے مقابلے پر میدان میں اترتے ہیں۔ اور نیا نظام اور تہذیب وضع کرکے زمانے کو دے جاتے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ یہ مذاہب دنیا کو اچھے انسانوں کو ایک کھیپ بھی دے کر جاتے ہیں۔

کہاں سے شروع کریں

یہ علی شریعتی کے اس لیکچر کا عنوان ہے جو اس نے نومبر 1971ء میں ٹیکنیکل یونیورسٹی تہران کے مقام پر دیا۔ اس لیکچر کا آغاز وہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے ذکر سے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہی اس کے محسن ہیں اور انہی کے نقش قدم میں چلنے کی وہ کوشش کرتا ہے۔ آج کے مسلمان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کا آغاز کہاں سے کرے اور سب سے پہلے کیا کرے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ یہ سوالات آج اٹھائے جارہے ہیں پرانے زمانوں میں اس چیز کا احساس تک نہ تھا۔ عہد وسطیٰ میں اس نام اور موضوع پر ایک تحریر بھی دستیاب نہیں ہے۔ علی شریعتی کی نگاہ میں سب سے بڑا المیہ دور جدید کا یہ ہے کہ عوام الناس اور دانشوروں کے درمیان دوریاں پیدا ہوچکی ہیں۔ عہد حاضر کے دانشور مخصوص دائروں اور سونے کے پنجروں میں اسیر ہوچکے ہیں۔ وہ عوام الناس میں رہنے کے باوجود ان سے کوسوں دور ہیں یہ وہی دانشور ہیں جن کی تعلیم تربیت اور سماجی بہبود پر عوام الناس کی خون پسینے کی کمائی صرف ہوئی ہے۔ عوام الناس خوراک اجناس اور نعمتوں کے پروردگار ہیں اور یہ دانشور محض رس چوسنے والے کیڑے PARASITE دانشور مفروضوں کے جزیرے میں ناک ٹوئیاں مارہے ہیں جبکہ عوام الناس سخت زمینوں پر بیٹھے راہنمائی کے لئے ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کوئی پل موجود نہیں ہے۔

سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ جزیرے اور ساحلوں کے درمیان پل تعمیر کرنے چاہیں اور یہ پل بھی دونوں نے مل کر بنانے ہیں۔ دانشور ساحل کی طرف بڑھنے کا ارادہ تو کریں عوام الناس بڑھ بڑھ کر خود پل بنائیں گے۔ (یہ وہی پل ہے جو علی شریعتی اور ایرانی عوام الناس کے درمیان قائم ہوچکا تھا) کہاں سے شروع کرنے کے ساتھ جو دوسرے سوالات ابھرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ کون شروع کرے اور کیوں شروع

ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آغاز دانشور کے ہاتھوں سے ہی ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دانشور کون ہے۔ کیا وہ لوگ دانشور ہیں۔ جو رسمی معنوں میں بڑی بڑی ڈگریوں کے حامل ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ سکالر کہلاتے ہیں۔ علی شریعتی اس لیکچر میں دانشور اور روشن فکر کی الگ الگ تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر دانشور روشن فکر بھی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی روشن فکر سرے سے پڑا تعلیم یافتہ دانشور ہی نہ ہو۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ بڑے بڑے انقلابی راہنما دانشور طبقوں سے تعلق ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہ غریب' عاجز اور زمانے کے ٹھکرائے ستائے ہوئے انسان ہی ہوتے ہیں۔

علی شریعتی نے صحیح الفکر دانشور جسے وہ روشن فکر کے نام سے پکارتا ہے کو مندرجہ ذیل اوصاف کا حامل قرار دیا ہے۔

1۔ وہ صاحب علم ودانش ہوگا (Knowledge able)

2۔ اس کا رابطہ عوام الناس سے ہوگا (Committed)

3۔ وہ خود آگاہ ہوگا۔ ذمہ دار ہوگا (Resposible)

4۔ اس کے قول وعمل میں فرق نہیں ہوگا (Activist)

5۔ اس کا قول عمل عصری تقاضوں کے مطابق ہوگا (Relevant)

اگر کوئی دانشور یہ خصوصیات رکھتا ہے تو وہ روشن فکر کہلائے گا۔ اور وہی اس عمل تعمیر اور اصلاح کو شروع کرے گا۔ مقصد کے بغیر دانشوری ایسے ہی ہے جیسے خوشبو کے بغیر پھول۔ محض علم اور سائنس کا حصول اور ترسیل بے لگام قوت کا حصول اور ترسیل ہے۔ ایک اندھی طاقت جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے۔ لیکن روشن فکری وہ روشنی ہے جو اندھی طاقت کو راستہ دکھاتی ہے۔ سائنس دان ایجاد کرتا ہے۔ روشن فکر اسے انسانیت کو راہ میں خرچ کرتا ہے سائنس دان کو اپنی پیدا کردہ قوت کے استعمال کا پتہ نہیں۔ یہ قوت اس کے ہاتھ سے سیاستدان حکمران اور

استحصال کرنے والے چھین کر لے جاتے ہیں اور انسانیت کو پابہ جولاں کر دیتے ہیں۔ روشن فکر علم و حکمت کو طاقت کو انسانیت کو خدمت کے لئے استعمال کرتا ہے۔

علی شریعتی کا تجسس یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کو الگ الگ قسم کی دانش و حکمت اور حکمت عملی کی ضرورت ہے کیونکہ دونوں انسانی ارتقاء کے مختلف درجوں پر موجود ہیں۔ مغرب میں سارتر ایک روشن فکر کہلا سکتا ہے کہ وہ مذہب اور انسانیت سے بھٹکے ہوئے مغرب کو مذہب کی طرف بلاتا ہے۔ مغرب کے پاس روٹی کپڑا اور مکان تو ہے مذہب نہیں ہے۔ سارتر مادی ترقی کے نقصانات گنواتا ہے۔ مشرق میں ایسا کرنا پسماندہ لوگوں کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔ مشرق کو اندرونی دنیا کی طرف متوجہ ہونے کا درس کوئی کیوں کر دے سکتا ہے جبکہ وہ رہتی ہی اندر کی دنیا میں ہے ایسا مشورہ مسخرہ پن ہی کہلا سکتا ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے مغرب کو کہا جائے کہ تم سائنسی ترقی اختیار کرو۔ جبکہ وہ اس ترقی کے اندر غرق ہیں۔

چنانچہ علی شریعتی کی نگاہ میں روشن فکر کا تعلق براہ راست زمان و مکان، تاریخ اور ماحول سے ہے جو شخص یورپ کو مزید سائنسی ترقی کا مشورہ دیتا ہے وہ روشن فکر نہیں اور جو شخص ایشیا میں سائنسی ترقی کو رد کرتا ہے وہ بھی روشن فکر نہیں۔ اپنی معاشرتی سطح کو ضرور ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ لیکن بعض دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ دوائیوں اور مشینوں کی طرح ہم روشن فکری بھی مغرب سے درآمد کر سکتے ہیں۔ یہی ان کی بھول ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کے لوگوں کا مسئلہ روحانی ارتقا نہیں بھوک ہے۔ جبکہ اہل مغرب کا سب سے بڑا مسئلہ روحانی خلا اور افلاس ہے۔ ہم وہاں سے بھوک کا علاج تو منگوا سکتے ہیں مگر ہمیں روحانی تشنگی کا علاج ان کے پاس سے نہیں ملے گا۔ یہ تو ہے ہی ہمارے اپنے پاس۔

ہمارے دانشوروں نے غلط راہوں کی طرف راہنمائی کر کے قوم کو گمراہ کیا ہے اور خود بھی گمراہ ہوئے ہیں۔ علی شریعتی یہاں کچھ مثالیں دیتا ہے۔ پیڑا عظم تعلیم

کے لئے ہالینڈ گیا اس نے دیکھا کہ وہاں ترقی ہی ترقی ہے۔ جبکہ روس پسماندہ ہے۔ اس نے غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ چونکہ ڈچ لوگ داڑھی نہیں رکھتے اور روسی لوگ داڑھیاں رکھتے ہیں اس لئے یہ ترقی نہیں کر سکے۔ اس نے آتے ہی روسی لوگوں کو داڑھیاں موڈنے کا حکم دے دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روسیوں کی داڑھیاں تو غائب ہو گئیں مگر ترقی پھر بھی نہ آسکی۔ علی شریعتی اپنے ایک استاد کا حوالہ دیتا ہے جس کا کہنا تھا کہ تعلیمی اور انسانی ترقی کا دارومدار ڈرائنگ کی ترقی پر ہے اور ایشیا کی پسماندگی کی بڑی وجہ مخلوط تعلیم اور ڈرائنگ کے مضمون سے بے توجہی ہے۔ پھر ایک زمانے میں (1941-53ء) میں ایران رسم الخط کی بحث چھڑی اور کہا جانے لگا کہ ایران اس لئے ترقی نہیں کر سکا کہ یہاں کے لوگوں کو رسم الخط اور حروف تہجی کے مسائل درپیش ہیں۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ ترکی والوں سے پوچھو' رسم الخط تبدیل کر کے وہ کتنے ترقی یافتہ ہوئے۔ چین اور جاپان والوں سے پوچھو کہ وہ رسم الخط تبدیل نہ کر کے کتنے گھاٹے میں رہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک زمانے میں ایران کے دانشوروں نے کلاسیکی شعرا (بالخصوص حافظ شیرازی) کی کتابیں جلانا شروع کر دی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اہل ایران کی پسماندگی کی بڑی وجہ یہ شعری مجموعے ہیں جس کی وجہ سے وہ بے حس کاہل اور بے عمل ہو گئے۔ یہ دانشور ہفتے میں ایک بار کسی جگہ جمع ہوتے اور تقریروں' شور شرابے اور ضیافت کے بعد ان کتابوں کو باقاعدہ نذر آتش کرتے۔

علی شریعتی کا خیال ہے کہ اہل مغرب نے ہم کو فروعات میں الجھایا۔ ہمیں ان دیواروں کو گرا دینے کا مشورہ دیا جو ہماری راہ میں تھیں ہی نہیں۔ ایک خاص موقع پر جب ایران میں جمہوریت' تیل اور نیشنلائزیشن کا بحران برپا تھا۔ ہمارے دانشور حافظ شیرازی کی محبوباؤں کے نام پتہ دریافت کرنے یا ان کی کتابوں کو جلانے میں مصروف تھے۔ اہل مغرب ایک زمانے میں جب مذہبی اجارہ داری اور پاپائیت سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے تو انہوں نے نیشنلزم (قوم پرستی) کو اس کے مقابل لا کھڑا کیا تھا۔ یہ

گویا اس سوادِ مذہب کے خلاف ان کا ہتھیار تھا۔ لیکن ہمیں تو اس ہتھیار کی ہرگز ضرورت نہ تھی اور نہ ہے۔ ہم نے تو مذہب سے چھٹکارا حاصل نہیں کرنا مگر دانشور اسی تصورِ قومیت کو بھی درآمد کر کے اپنی قوم پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اہل مغرب عرب دنیا کو تقسیم کرنے اور سلطنت عثمانیہ کی ذلالت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس تصور کو برآمد کرانے کے درپے تھے اور ہم فیشن اور ترقی کے نام پر الٹے سیدھے نعرے لگا رہے تھے یعنی اپنی سزا خود تجویز کر رہے تھے۔ ہم تو مذہب کے بندھنوں میں بندھے ہوئے تھے۔ مغرب نے عیسائی مذہب سے چھٹکارا پانے کے بعد اپنے آپ کو باندھنے کے لئے قوم پرستی کو اپنایا۔ یہ ازم انہیں نصیب ہو مگر ایسی قوم پرستی ہمارے کام کی چیز کبھی تھی ہی نہیں۔

پھر مغرب سے ہی ہم نے انسانی بھائی چارے (HUMANISM) کے تصور کو لے کر اپنے اوپر نافذ کیا۔ یہ تصور بہت عمدہ ہے۔ یہ ہمارے پاس پہلے سے موجود تھا۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اہل مغرب اس کو ایک دوسری راہ سے لے کر آئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ محمود و ایاز کو ایک کر دو۔ آبادیاتی حکمران اور محکوم کو ایک دوسرے کا رشتہ دار بنا دیں۔ حاکم و محکوم کیسے رشتہ دار بن سکتے ہیں۔ مگر ہیومنزم کے تصور کو اس کارِ خیر کے لئے استعمال کیا گیا۔ جونک اور اس کے شکار کے خون کو ایک جیسا قرار دے کر ظلم کے مفہوم کو تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح داخلی طور پر مسلم معاشروں میں مذہبی بھائی چارے کی بنیاد پر ظالم اور مظلوم طبقوں کو بھائی بھائی بنانے کا ڈھونگ رچایا گیا۔ یہ کیسے ایک دوسرے کے بھائی ہو سکتے ہیں کیا ایک بھائی دوسرے بھائی پر ظلم و ستم ڈھانے کے بعد بھی اس کا بھائی رہ سکتا ہے۔ روشن فکر کا یہ کام ہے کہ وہ ان جھوٹے اور جعلی نظریوں کا بھانڈا پھوڑے اور عوام الناس کو ان کے حقیقی دشمنوں سے آگاہ کرے۔ اس مشن کے لئے دانشور کو اپنے خول سے نکلنا ہو گا۔ وہ اپنے مخصوص علمی حلقوں سے مخاطب ہونے کی بجائے سڑکوں، گلیوں، سکولوں اور

بازاروں میں آکر نئی فکر کا چراغ جلائے گا۔

علی شریعتی اس اشتراکی مفروضے کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ جدلیاتی منطق کے مطابق غربت کا پلکر خود بخود ٹوٹ جائے گا اور تاریخی جبر کے تحت معاشرہ از خود تبدیل ہوجائے گا۔ سوسائٹی خود بخود تبدیل نہیں ہوتی اسے تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ اسے دھکا دینا پڑتا ہے۔ یہ دھکا روشن فکر دانشور ہی دے سکتے ہیں۔ جدلیات کے اندر حرکت نہیں۔ حرکت انسان کے اندر ہے۔ اس تناظر میں روشن فکر دانشور پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس نے شعور پیدا کرنا ہے۔ اپنے سوسائٹی کی غلط کاریوں سے عوام الناس کے ذہن اور ضمیر کو آگاہ کرنا ہے۔ سوسائٹی اس خود آگہی سے مسلح ہوکر ہی جدلیات کے سفر پر روانہ ہوگی۔ ہزاروں سال تک دانشوروں نے یہ فریضہ سرانجام نہیں دیا۔ سوسائٹی جمود کا شکار رہی۔ فرانسیسی انقلاب والٹیئر اور روسو کے ذہن میں پیدا ہوا اور پھر عوام الناس کے ناخنوں نے باسٹیل کی اینٹ سے اینٹ بجادی

طبقات میں بٹی دنیا میں سب طبقوں کو یکجا کرنے والے نیشنلزم' ہیومنزم اور مذہبیت کے فلسفوں کی بات کرنا استحصالی طبقوں کی مراعات کو دوام بخشنا ہے۔ ہمارا مسلم معاشرہ ایسے مقام پر ہے جس پر یورپ والے عہد وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ سے قبل موجود تھے۔ ہم نے اس مقام سے ہی شروع کرنا ہے۔ ابھی ہمارے ملک میں زرعی منڈیاں ہیں۔ ابھی ہمارے ہاں بیچ کے دلالوں کی حکمرانی ہے۔ ابھی پیداواری رشتوں کا تعین ہونا باقی ہے روشن فکر بننے کے آرزو مند دانشور کو ایک بات کبھی نہیں بھلانی چاہئے کہ مسلم معاشروں کی بنیاد مذہب پر رکھی ہوئی ہے۔ ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا جینا مرنا اٹھنا بیٹھنا ہمارے رسوم ورواج' شادی بیاہ' مرگ موت' تعلیم وتدریس زبان لباس ہر چیز پر مذہب کی گہری چھاپ ہے۔ اس کو اکھاڑنے کی کوشش کرنے والے کبھی عوام الناس سے رابطہ قائم نہیں کرسکتے۔ اس فریم ورک سے باہر نکل کر مسلم معاشروں میں عوام الناس کی راہنمائی کا تصور ابھی ممکن نہیں ہے۔

مذہب یورپ کی سماجی زندگی میں شامل نہیں مگر ہماری زندگیوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ اس لئے یہاں مذہب سے ہٹ کر کسی فکر کو آگے بڑھایا ہی نہیں جاسکتا۔ ان معاشروں میں اسلام کے خلاف باتیں کرنے والے دانشور عوام الناس کو خوفزدہ کردیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بدک کر انہی رجعت پسند مذہب فروشوں کی آغوش میں چلے جاتے ہیں جو مذہب کو محض چند بندھی ٹکی عبادت کا مجموعہ قرار دے کر اس کی فعالیت کی مضمحل کرتے رہتے ہیں۔ جو زندگی اللہ کی مہربانی سے عطا ہوئی ہے اسے چھوڑ کر اگلی زندگی کی طرف راغب کردیتے ہیں۔ موجودہ زندگی استحصالی طبقوں کے حوالے کردی جاتی ہے چنانچہ عوام معبدوں' غاروں اور خانقاہوں میں گھسنے میں عافیت سمجھنے لگتے ہیں۔

جدید دانشوروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مذہب انسانی زندگی میں منفی کردار ہی ادا کرتا ہے۔ جو اس دنیا سے بے زاری کا تصور دے کر انسان کو ایک عضو معطل بنا دیتا ہے۔ دراصل یہ سوچ ان نام نہاد دانشوروں کی سچے دین سے بے خبری کی دلیل ہے۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ اسلام ایک بہت بڑی فعال قوت کا نام ہے اس فعال قوت نے عرب کے جاہل' پسماندہ اور بے تعلیم معاشرے کو چشم زدن میں قیصر وکسریٰ کی تہذیبوں سے ممیز وممتاز بنا دیا تھا۔ اس کے اندر وہ قوت موجود ہے مگر اسے سمجھنے' عام کرنے اور اس سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مذہب کے جھوٹے پرچارک مذہب اسلام کے نقلی نسخے اجال کر بیچتے اور پیٹ پالتے رہے۔ حکمران مذہب کے نام پر حکومت کرتے رہے۔ مظلوم عوام اسلام کے نام پر لٹتے اور مار کھاتے رہے۔ سچا اسلام تاریخ کے قبرستان میں گم اور دفن اپنے اظہار کی راہیں تلاش کرتا رہا۔

علی شریعتی کہتا ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ کیتھولک عیسائیت' بدھ مت' ہندومت' تاؤازم اور دوسرے مذاہب فرد کی ذات تک محدود ہیں۔ یہ شخصی مذاہب ہیں جو انسان کو دنیا سے بے زار کرکے غیر مرئی اور غیر موجودہ چیزوں کے پیچھے

سرگرداں ہو کر نجات پانے کی راہ دکھاتے ہیں جبکہ اسلام موجود اور سامنے کی زندگی کو مرکز نگاہ و حیات بنا کر اس کی راہ سے اگلے جہاں کو سنوارنے کی بات کرتا ہے۔ اسلام میں تلوار، خون اور جہاد کا تصور ایسے ہی نہیں دیا گیا۔ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو مسلسل جدوجہد اور خونی عمل کے ذریعے حیات نو پاتا رہتا ہے۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ یاد حسینؓ اور واقعہ کربلا سچے تصور اسلام کو زندہ رکھنے کی سب سے اہم علامت ہے۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ خون حسینؓ کو صرف آنسوؤں میں نہیں بہا دینا چاہئے۔ تلوار اٹھا کر صرف اپنے جسم زخمی نہیں کرنے چاہئے۔ یہی تو ہمارے مخالفین چاہتے ہیں کہ ہم غم کو آنسوؤں میں تبدیل کرتے رہیں — خون ہم نے اپنا نہیں ان لوگوں کا بہانا ہے جو اسلام کا خون صدیوں سے بہاتے چلا آرہے ہیں۔

اسلام ہر لحاظ سے دوسرے مذاہب سے مختلف و ممتاز ہے۔ دوسرے مذاہب غربت و افلاس کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ اسلام اسے مسترد کرتا ہے۔ بقول ابوذرؓ ایک دروازے سے غربت داخل ہوتی ہے تو دوسرے دروازے سے مذہب رخصت ہوجاتا ہے۔ جو معاشرہ اقتصادی افلاس کا شکار ہوگا۔ وہ روحانی افلاس کا بھی شکار ہوجائے گا علی شریعتی یہاں حضرت علیؓ کے دور خلافت کی مثال پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے خلافت کا منصب سنبھالتے ہی معاوضوں کی شرحیں تبدیل کردیں۔ انہوں نے بڑے بڑے عہدیدار اور چھوٹے سے چھوٹے کارکن کی تنخواہوں کو مساوی کردیا۔ سینٹ پال جیسا انسان کہتا ہے کہ خدا کے گھر بھوک کی اینٹوں سے بنائے جاتے ہیں اور بھوک سے انسان کو تراوت ملتی ہے۔ جبکہ ابوذر غفاریؓ بھوک کو انسان کا سب سے بڑا دشمن بتاتے ہیں۔ چنانچہ اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ روشن فکر دانشور اسلامی معاشرہ میں اسلام کے حوالے سے ہی بات کرے گا۔ پہلے وہ خود سچے اسلام کو سمجھے گا اس کے بعد اس سوچ کو عام کرے گا جہاد اور اجتہاد یہی دو ہتھیار ہوں گے اس کے پاس۔ ان دو ہتھیاروں کے بغیر وہ روشن فکر بن ہی نہیں سکتا۔

اب کیا کیا جائے

یہ لیکچر حسینیہ ارشاد میں دیا گیا۔ اس میں اسی تقسیم کی مزید وضاحت کی گئی جو ٹیکنیکل یونیورسٹی تہران میں "ہم کہاں سے آغاز کریں" کے عنوان سے دیا گیا تھا۔ اس میں بھی ابتدا میں مغرب کے نو آبادیاتی نظام کی سیاہ کاریوں کا پردہ چاک کیا گیا۔ اس تہذیب نوی نے اپنی راہ کی سب بڑی بڑی رکاوٹوں کو ڈھانے کا عزم کر رکھا ہے۔ مشرقی دنیا میں اس کی سب بڑی مزاحمت مذہب کے ہاتھوں ہوئی تھی چنانچہ اسے مسمار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ کسی معاشرے کو مکمل طور پر صارف (CONSUMER) بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تخلیقی استعداد کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ ایسا طبقہ پروان چڑھایا گیا جو نقل اور تقلید پر فخر کرتا ہو اور اپنی تہذیب سے عاری ہو کر دوسروں کا دریوزہ گر بن جائے۔ چونکہ خطرہ مذاہب کی طرف سے تھا۔ اس کا حل ان کو تیار مل گیا یعنی ایک بے عمل اور بے روح قسم کا رسوماتی ڈھانچہ مذہب کے نام سے مسلم معاشروں میں پہلے سے رائج تھا۔ اسے ہی مذہب کا متبادل سمجھ کر آگے بڑھا دیا گیا۔

اس مذہب کا فائدہ یہ بھی تھا کہ اس کو قوم کا شیرازہ بکھیرنے کا کام بھی آسان سے سونپا جا سکتا تھا۔ قتل مقاتلے، دنگے فساد، جھگڑے اور فرقہ بندیاں عام کروائی جا سکتی تھیں۔ جس سے ایک تو مذہب خود کمزور ہو جاتا تھا دوسرے عوام الناس میں مذہب سے تنفر اور بے زاری کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ مزے کی بات ہے کہ مذہب کے سب حریف گروپ اپنی نو آبادیاتی ضرورتوں کو پورا کرتے نظر آتے تھے۔ مگر ان کو یہ باور کروا دیا گیا تھا کہ تم نو آبادیات کے خلاف کام کر رہے ہو۔ سبحان اللہ مگر فائدہ صرف استعمار کو تھا۔ دوسرا نام نہاد دانشور گروہ اپنی پتلون کوٹ ٹائی میں گم تھا۔ بنے

ہوئے مغربی افکار و نظریات اسے ملتے اور وہ ان کو بغیر سوچے سمجھے اور دماغ پر زور ڈالے طوطے یا ٹیپ ریکارڈ کی طرح آگے منتقل کرتا جاتا۔ اس کو ساری ترقی انگریزوں سوٹ بوٹ چھری کانٹے اور مذہب دشمنی میں نظر آتی۔ وہ بھول جاتا کہ مغرب نے ترقی ان وجوہات سے نہیں کی۔ بلکہ محنت ذہانت اور علم و حکمت کے ذریعے کی۔ اس کے مغز میں بس ایک ہی بھوت سوار تھا کہ مذہب کو اپنی سوسائٹی سے نکال کر باہر کرو کیونکہ اس کے بغیر تم ترقی یافتہ کہلا ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ مسلمان ممالک میں جونہی ایک نوجوان اخبار پڑھنے یا یورپی فرنیچر، کپڑے، سرخی، پاؤڈر استعمال کرنے لگتا ہے اور ایف ایس سی، بی ایس سی تک فزکس، کیمسٹری بیالوجی پڑھ لیتا ہے۔ وہ خدا اور مذہب کے وجود سے منکر ہونا اپنی شان اور اپنے ادھورے علم کی آن قرار دیتا ہے۔

دوسری طرف مغربی دانشوروں کا رویہ ملاحظہ کریں آئین سٹائن اور میکس پلانک (MAX PLANCK) جیسے سائنس دان مذہبی جذبات کو سائنسی تحقیق کی بنیاد قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں میکس پلانک کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ "سائنس کی ہر لیبارٹری کے دروازے پر جلی حروف میں یہ لکھ دینا چاہئے کہ جس آدمی کے پاس عقیدہ نہیں ہے۔ اسے اس دروازے کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے" مغرب خود تو اس بات پر نالاں ہے۔ کہ اس کی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہوتی جارہی ہیں۔ دوسری طرف ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ افراد مذاہب بیزاری کو عام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بقول ایک مغربی مفکر چانڈل (CHANDELL) ان چوروں کے ساتھی ہیں جو انسان کو قتل اس لئے نہیں کرتے کہ اس سے مزدوری کروا کر اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹیں اگر اسے مار دیا تو لوٹیں گے کسے۔ ہمارے جدید دانشور اپنی قوم کو وہ باتیں بتاتے ہیں جو خود یورپ میں بھی نہیں ہیں۔ علی شریعتی اپنے ایران کے ان جھوٹے دانشوروں کے نام بھی گنواتا ہے یعنی مرزا ملکم خان، سید حسن تقی زادہ وغیرہ۔ یہ لوگ اسلام کو رجعت پسند غیر ترقی پسند

غیر مہذب قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب اسلام جو درحقیقت مذہب انسانیت ہے کو ہٹا کر اس کی جگہ معاشیات وسیاسیات کا مذہب نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

علی شریعتی کے بقول مذہبی اور سیکولر دانشوروں کے دونوں طبقے مذہب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسلام کو کبھی کسی باہر کی طاقت نے زک نہیں پہنچائی۔ کفر شرک' قیصریت وکسرائیت' بڑی بڑی افواج سب کا مقابلہ اسلام نے کیا ہے اور کرتا چلا آرہا ہے۔ مگر اس اندرونی دباؤ کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں جو منافقت کی صورت میں اس کے اندر در آئی ہے۔ جو لوگ بدر اور اور حنین اور خندق میں اسلام کو نہ ہرا سکے وہ اندر داخل ہوکر اس کی جڑوں کو ہلانے سے دریغ نہیں کرتے۔ وہ بار بار ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنی ساری زندگی جنگیں لڑنے کے باوجود اس کا بال بیکا نہ ہوا۔ پر اسے مارا تو کس نے مارا اپنوں نے۔ جرم اس کا کیا تھا کہ سرمایہ داری نظام اور روپوں کی مخالفت۔ جن لوگوں کی تلواریں بیرونی قوتوں کو سرنگوں کرتی ہیں ان کو اپنے گھروں میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں تہہ تیغ ہونا پڑتا ہے کوئی دوسری تاریخ اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر علی شریعتی کہتا ہے کہ آج کے عہد میں اگر نام نہاد دانشوروں کو مذہب کے خلاف کوئی کامیابی ملی ہے تو وہ ان نام نہاد مذہبی طبقوں کی ہٹ دھرمی اور تنگ نظری کی وجہ سے ملی ہے۔ جنہوں نے نوجوان نسل کو بھگایا ہے۔ باہر دوسرے شکاری بیٹھے تھے انہوں نے جال پھینکا اور نئی نسل گرفتار ہوگئی۔ مذہبی طبقوں نے مفروضوں کے طوطے مینا اڑائے۔ جدید طبقوں نے جدید ایجادات کے انبار لگائے۔ مذہب کو ماضی بنادیا گیا تاکہ حال سے فرار حاصل کیا جاسکے۔ یہ دنیا تو صرف اگلے جہاں کی تیاری کے لئے ہے۔ یہ صرف ایک انسان کے عارضی زندگی کی ساٹھ ستر سال گنتے ہیں اربوں انسانوں کی ہزاروں صدیوں کے اربوں سالوں کو نہیں گنتے۔ اسلام ان سب کے لئے ہے۔ ہزاروں صدیوں کے اربوں انسانوں کے اربوں سالوں کی زندگی کو

عارضی، حقیر اور بے معنی کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ دلیل دیتے ہیں کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے یعنی حیات اور ممات کا بھی احاطہ کرتا ہے خوب ہے لیکن حیات قبل از ممات کا کیا بنے گا۔ کیا اسے ممات قبل از ممات بنا دیا جائے۔ یہی کچھ یہ کرتے ہیں مگر اپنے لئے اور اپنے آقاؤں کے لئے اس موجودہ حیات کی ساری نعمتیں خوانوں میں جوڑ کر رکھتے ہیں۔ غریب اور نادار انسانوں کو اگلے جہاں پر ٹرخاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ خود حیات سے بعد ممات کے اسقدر پرستار ہیں اور اس دنیا کو حقیر جانتے ہیں تو پھر فقر حیدرؓ اور ابوذرؓ کو اپنے اوپر طاری کریں۔ جھونپڑیوں میں سوئیں پیوند لگے کپڑے پہنیں اور پتے کھا کر زندگی گزاریں۔ مگر نہیں خود تو اطلس کم خواب کے چوغے چولے پہنیں گے۔ محلات میں رہنے کے خواب دیکھیں گے۔ قاہرہ وجابر حکمرانوں کے دسترخوانوں پر پڑ تھلے مار کر بیٹھیں گے۔ محراب منبر پر آئیں گے تو لوگوں کو تقریروں کے ذریعے فقر کی ویران گلیوں کی طرف کیش کیش کریں گے۔ یہ لوگ کم فہم تو ہیں ہی خود فریب بھی ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ان کی حرکتوں کو نہ کوئی دیکھتا ہے نہ سمجھتا ہے مگر نژاد نو سب سمجھتی ہے سب دیکھتی ہے اس لئے وہ جدیدیت کے مداریوں کی طرف دوڑتی ہے وہاں بھی ایک مصنوعی کھیل جاری ہوتا ہے۔ دونوں طبقے انسانوں کو مسحور، مخمور اور اندھا بہرا اور ماؤف کرکے اس کی جیب کاٹنا چاہتے ہیں اور فی الحقیقت کاٹتے بھی ہیں۔ اگر کوئی پکڑا جائے تو باقی سب مداری اور گانجا پلانے والے جمع ہوکر اس ایک آدھ آدمی کا قیمہ بنادیتے ہیں۔

کافر بنانا تو اسلام کے اندر کوئی بڑی بات نہیں۔ جب لوگ انسان کو مخمور کرلیتے ہیں تو پھر تخیل کے پر باندھ کر ایک طبقہ خدا کے پاس لے جاتا ہے اور دوسرا طبقہ مغرب کی جنت اور اسکی حوروں کے پاس۔ مسلمان کو جب تکلیف پہنچتی ہے زخم لگتے ہیں آنسو اور خون بہتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ افق کے اس پار بننے والے محلات ہر قطرہ خون کے بدلے ایک اینٹ لگ رہی ہے۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ یہ کہنا غلط ہے

کہ مغرب کو ہم سے صرف سیاسی اور معاشی اختلافات ہیں اور مغرب کو ہمارے مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ولیم گلیڈسٹون وزیراعظم برطانیہ (98-1809) کا اس قول کا حوالہ دیتا ہے۔ "جب تک قرآن ان لوگوں کے درمیان موجود ہے۔ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

علی شریعتی کہتا ہے کہ مذہبی رویوں کا اقتصادیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے عیسائی دنیا پروٹسٹنٹ عیسائیت اور کیتھولک عیسائیت دو واضح فرقے ہیں۔ پہلا فرقہ اس دنیا کو زیادہ حقیقی جانتا ہے چنانچہ ان ممالک میں یعنی امریکہ اور جرمنی میں زیادہ اقتصادی اور سائنسی ترقی ہوئی ہے۔ جبکہ کیتھولک عیسائیت ممالک سپین اور اٹلی صنعتی وسائنسی لحاظ سے پسماندہ سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں پروٹسٹنزم اور کیتھولکزم ساتھ ساتھ چلتے ہیں یعنی فرانس اور برطانیہ وہاں ان دو انتہاؤں کے درمیان والی کیفیت ہے۔

علی شریعتی کہتا ہے کہ عیسائیت جیسے روحانی مذہب کے بارے میں جب یہ رائے ہے کہ انسانی زندگی کے معاشرتی پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے تو اس مذہب کے کیا کہنے جو جس کے پیغمبر علیہ السلام کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار۔ جو مذہب ٹیکس کی ادائیگی کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ جو آمروں سے خلاف جدوجہد کا درس دیتا ہے اور بغاوت تک آمادہ کرتا ہے جس مذہب کے لیڈر حضرت علیؓ اور ابوذر غفاریؓ جیسے روشن فکر ہوں جو اقتصادیات کو اخلاقیات کا فریم ورک اور مادیت کو روحانیت کا زینہ قرار دیتے ہیں جس کا نعرہ پکار اٹھتا ہے کہ اقتصادی زندگی نہ رکھنے والا آخرت کی زندگی سے بھی محروم ہے۔ جس کا ایک درویش فرزند ابوذر یہ کہتا ہے کہ سرمایہ چھین کر غریبوں میں پھر سے تقسیم کردو۔ تاکہ اسلام کا اصول مساوات صاف دکھائی دینے لگے۔ جو درویش ایک بھوکے کو دیکھتا ہے کہ اس کے پاس تلوار بھی ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ اس بھوکے نے بغاوت کے لئے تلوار بے نیام کیوں نہیں کی۔ جس کا ایک عظیم فرزند یہ قرار دیتا ہے کہ جو شخص اس دنیا کو اپنے مذہب پر قربان کرتا

ہے وہ گویا اپنے مذہب کو دنیا پر قربان کر رہا ہے اور وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ شاندل کہتا ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب جس نے مذہب کو آخرت سے نکال کر اس دھرتی تک پہنچایا (مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے نام نہاد مذہبی راہنما اسے زمین سے اٹھا کر پھر آخرت میں لے جانا چاہتے ہیں)

"اب کیا علاج" نہ ہو کے عنوان باب میں علی شریعتی کہتا ہے۔ جس معاشرے میں آدھے سے زیادہ آبادی ان پڑھ ہو اور باقی آدھی گمراہ اور غلط کار ایسے حالات میں انقلاب کیسے برپا کیا جاسکتا ہے۔ لوگ جب اسلام کو سمجھتے نہیں تو اس پر عمل کیا کریں گے۔ ایسے حالات میں بہتری کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ جتنے بھی روشن فکر لوگ ہیں ـــــ اپنے ذاتی اختلافات و امتیازات سے بلند ہو کر قوم کی راہنمائی کے لئے میدان میں نکل آئیں کہ اب ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آن پڑی ہے۔ اجتہاد، جہاد اور شہادت یہی لائحہ عمل سامنے رہ جاتا ہے۔ اگر روشن فکر سچے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا ہوگا۔ یہ روح اسلام کے اندر موجود ہے۔ اس کا مظاہرہ اسلام انتہائی تاریک صدیوں اور انتہائی نامساعد حالات میں کرچکا ہے۔ علاج ہمارے مصائب کا یہ ہے کہ ہم خود آگاہ ہوجائیں اور اپنے آپ کی طرف لوٹیں۔ مغرب ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کرکے ہمارے اثاثوں پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو بچانا ہے تو اپنے آپ کو پہچاننا ہوگا۔ ورنہ ہمارا کوئی نام لیوا بھی نہیں بچے گا۔

موجودہ حالات سے فرعون، خسرو اور بلعم باعور فائدہ اٹھا رہے ہیں اور عوام الناس گھاٹے میں ہیں اس سب کا علاج سچے مذہب کی سچی پیروی اور پہچان میں ہے۔ مذہب سلا بھی سکتا ہے۔ جگا بھی سکتا ہے۔ اب فیصلہ ہم نے کرنا ہے کہ سلانے والے مذہب کی پیروی کریں یا جگانے والے مذہب کا ساتھ دیں۔ تمام تاریخ میں مذاہب کی جنگ جاری رہی ہے۔ یہودیت کے خلاف عیسائیت اور اسلام کے خلاف عیسائیت۔

اسلام یہودیت اور عیسائیت سے تو لڑ کر جیت چکا ہے اب اس کی جنگ اپنے آپ کے ساتھ ہے اپنے جھوٹے نصف کے ساتھ ہے ایک اسلام کی دوسرے اسلام ایک قرآن کی دوسرے قرآن اور ایک قسم کے مسلمانوں کی دوسرے قسم کے مسلمانوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہے۔ فی الحال نقلی نسخے جیت رہے ہیں جب اصلی نسخوں کی جیت ہوگی تو انسان کی نجات نمودار ہوگی اور یہ کام روشن فکر مسلمانوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچے گا۔ یہی لوگ تاریخ کو ظالم طبقوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر اپنے حق میں رواں کریں گے

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں سے آئیں گے ہمارے تعلیمی نظام دریا کے کناروں کی طرح ایک دوسرے کے متوازی چل رہے ہیں ایک نے مغرب کو قبلہ و کعبہ بنالیا ہے تو دوسرا ماضی کے خول سے ہی نہیں نکلنا چاہتا لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ اب خال خال ایسے روشن فکر دانشور سامنے آنے لگے ہیں جو مغرب کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس سے مرعوب نہیں ہیں یہ لوگ مشرقی تہذیب و روایات اور مذہبی فکر و آگہی سے بھی باخبر ہیں اور مشرق و مغرب کی دانش کا صحیح امتزاج ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ جرأت مند بھی ہیں۔ کومٹ منٹ بھی رکھتے ہیں اور قربانی دینے کا جذبہ بھی یہی لوگ ہماری کشتی کو پار لگا سکتے ہیں۔ ایسے لوگ فی الحال افریقہ میں زیادہ ابھرتے ہیں کیونکہ وہاں نو آبادیاتی نظام نے سب سے زیادہ ظلم ڈھائے ہیں۔ (ایشیاء میں نو آبادیاتی نظام چوہا بن کر آیا افریقہ میں ڈاکو بن کر اترا) ان میں فانن، ایم سیزرے جولیس نائیریرے کینیاٹا، عمر مولود اہم ہیں۔ ان لوگوں نے نہ صرف افریقہ بلکہ ایشیا اور لاطینی امریکہ تک میں ایسے روشن فکر دانشوروں کی کھیپ (پالو فریری۔ لاطینی) پیدا کر دی ہے۔ ان کے اثرات ان ملکوں میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں اور تیسری دنیا کا چہرہ روشن ہونے لگا ہے۔

یہ لوگ اپنے پہلے گزر جانے والے دانشوروں جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، علامہ محمد اقبال وغیرہ سے پوری طرح متاثر ہیں یہ لوگ ترقی پسند اور مستقبل بیں تھے۔

یہ سائنس و حکمت کی ترقی سے آگہی رکھتے تھے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ اس لئے نہیں کی کہ یہ ان کا موروثی مذہب تھا بلکہ اس لئے کہ مذاہب عالم کے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلام ہی سب سے مکمل دین ہے۔ ہمارے وجود خالی ہیں اور صرف سچے دین اسلام میں ہی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہمارے اندرون کو بھر سکتا ہے۔ غیر مسلموں تک نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ اگر ان کے فلسفہ و فکر اور حکومت واقتدار کو کسی سے خطرہ ہے تو وہ اسلام ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ سامراج دشمن' ضد نوآبادیات اور خلاف سرمایہ داری مذہب ہے یہ نہ صرف ان کے خلاف ہے۔ بلکہ ان کے خلاف تلوار اٹھانے کی بھی ہدایت کرتا ہے۔ تلوار والا مذہب اور کوئی نہیں ہے۔

اسلام مغرب کے انسان کی روحانی تشنگی بھی بجھا سکتا ہے اور مشرقی انسان کو آگے بڑھ کر چاند ستاروں پہ کمند ڈالنے کا حوصلہ بھی دے سکتا ہے یہ اس دنیا کو بھی حقیقی سمجھتا ہے اور دوسری دنیا کی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا جو دانشور ان روشن جذبوں سے معمور ہیں۔ کیا ان کی آواز آگے آنے والی وہ نسل سننے کے لئے تیار ہوگی جن کی آنکھوں پر مغرب زدگی اور مشرق گزیدگی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ کیا ان کی باتیں صرف کتابوں' مقالوں اور کلاس رومز تک ہی محدود ہوں گی۔ جب ان کی رسائی ہی عوام الناس تک نہیں تو پھر انقلاب کیسے برپا ہوگا۔ مگر یہ سب کچھ تو سہنا ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے عوام دانشوروں کے پاس نہیں آئیں گے۔ دانشوروں کو ان کے پاس جانا ہوگا۔ یہاں علی شریعتی علامہ اقبال کا حوالہ دیتا ہے کہ یورپ سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد وہ چاہتا تو بڑے بڑے عہدوں کے لئے کوشش کرتا۔ اپنے جیسے لوگوں سے ملتا اور صرف اپنی فکر کو اوپر کے دانشور طبقے تک ہی محدود رکھتا مگر اقبال نے ایک صحیح روشن فکر کی طرح دنیاوی مناصب کو اپنی زندگی کا مطمع نہیں بنایا۔ اس نے عوام تک پہنچنے کے لئے اپنی فکر کو بامقصد شاعری کا لباس پہنانا شروع کردیا۔ اس کی آواز اگر فلسفے اور دانش کے مقالوں اور کتابوں کے ذریعے عوام الناس تک

نہیں پہنچ سکی۔ تو اس نے سادہ اور آسان شعروں میں گوندھ کر وطن کی ہواؤں فضاؤں میں بکھیر دیا۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کو چھوڑ کر انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں جا پہنچا۔ (روشن فکر دانشور سرمایہ دار کے سامنے تو اپنی انا کو سلامت رکھ سکتا ہے۔ مگر غریب کے سامنے انا کو بھی توڑنا پڑتا ہے۔ مقصد بڑا ہو تو پھر خودی کی تلوار سے خودی کو مجروح کیا جا سکتا ہے۔ شاعر ایسا کرتا ہے جہاں عوام الناس موجود نہ ہوں وہاں عوام الناس کے متعلق یا ان سے بات کرنا فراڈ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ پروفیسری کا لبادہ اتار کر پھینکنا پڑتا ہے۔ یہ لبادہ صرف علم کے احترام کے لئے ہے تاکہ عوام سے اپنے آپ کو چھپانے کے لئے ہے۔ عوام الناس سے اپنے آپ کو Identify وابستہ کرنے کے لئے ان کے پاس جانا ضروری ہے۔ ترقی کے بارے منانا بھی پڑتا ہے (عوام الناس خدا کا پرتو ہیں ان کے پاس جانا کمزوری کی نشانی نہیں ہے) طعنے اور طنز بھی سہنا پڑتا ہے۔ روشن فکر یہ منصب رکھتا ہے گا مگر جائے گا ضرور عوام الناس کے پاس اور ان کو ان کی زبان میں سمجھائے گا۔ وہ سمجھتے ہیں وہ سمجھیں گے آزو محبت کرنے والے لوگ ہیں جو وہاں اس کو ملتے دانشور بھی اپنی زندگی بتانے نظر آئیں گے۔ مذہبی شکاری بھی جال لئے بیٹھے ہوں گے کیونکہ ان لوگوں کی جہالت اور بے خبری پر ہی تو ان کا کاروبار اور دکانیں چلتی ہیں۔ روشن فکر دانشور جب نئی دانش لے کر ان کے پاس پہنچے گا تو یہ کاروباری دانشور اس پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے اس کو بدنام کرنے اور کافر ٹھہرانے کی باتیں ہوں گی (اقبال کے ساتھ ایسا ہوا اگر یہ منصب کچھ سہنا پڑے گا)۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] الا محمد عمل [illegible]

[illegible]

۔ اس تحریک میں علی شریعتی ان اللہ اعظم کی اصل ترجمانی بنانا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسانی و اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ جس کا خواب اقبال زندگی بھر دیکھتا رہا اور جس کی

۴ سرسید احمد خان
۵ حسن البنا
۶ علامہ اقبال
۷ سلافین (ریٹرن ٹو سیلف)
۸ اخوان المسلمین
۹ تحریک خلافت ہندوستان
۱۰ عبدالقادر آف الجیریا
۱۱ سانوسی تحریک افریقہ
۱۲ برصغیر کے مسلمانوں کو سامراج دشمن تحریک
۱۳ سوسائٹی آف اسلامک علماء تیونس' الجیریا' مراکو' موریطانیہ
۱۴ شار آف نارتھ افریقہ
۱۵ الجزائر کی تحریک آزادی
۱۶ بدعتی تحریکیں
① وہابی ② قادیانی ③ بابی ④ بہائی ⑤ کمیونزم

نجات دھندہ اور مسیحا کی آمد

یہ ایک اور لیکچر ہے جس میں علی شریعتی نہایت تفصیل کے ساتھ فلسفہ امامت کے تسلسل سے بحث کرتا ہے۔ ہر لیکچر کی طرح اس گفتگو میں اس کا بنیادی نقطہ یہی ہے کہ اسلام کی روح کو سمجھنے کی جگہ اس کے الفاظ کو ہی حرز جاں بنا لیا گیا ہے۔ دوسرے مذہب میں اصل روح سے معمولی سا گریز ملتا ہے۔ جبکہ اسلام کی صورت کو ہی سرے سے بدل دیا گیا ہے وہ اس بارے میں حضرت علیؑ کے اس قول کو نقل کرتا ہے کہ اسلام کی مثال ایک بھیڑ کی کھال کی ہے جس کو الٹا پہن لیا گیا ہے۔ علی شریعتی

اس لیکچر میں ایک مابعد الطبیعاتی تصور کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ نجات دہندہ کی آمد لازمی ہے۔ کیونکہ اس کی آمد کے بغیر حق وانصاف اور صداقت ودیانت کا بول بالا نہیں ہوسکے گا۔ شریعتی اس لیکچر میں "فلسفہ انتظار" پر بھی روشنی ڈالتا ہے انتظار تاریخ کا لازمہ ہے مستقبل کا انتظار انسانی کا انتظار' انتظار برائے انتظار۔ کسی نہ کسی طرح انسانی فطرت کا خاصہ رہا ہے۔ مسلم عقیدے اور خاص طور پر اہل تشیع کے مسلکی فکر کے مطابق انتظار سب سے اہم حقیقت ہے۔ اگر اس مسلک سے انتظار کو نکال دیا جائے تو پھر تاریخ کربلا پر آکر ختم ہوجاتی ہے کربلا میں ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ ہونا باقی ہے۔ اس کا ازالہ نجات دہندہ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ امامت کی تکمیل بھی اسی کے ہاتھوں سے ہوگی ۔ فعال اور متحرک جذبوں کے لوگ ہی انتظار کے تصور کو سمجھ سکتے ہیں جمود سکوت کے حامی اور قسمت کے غلام ان باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ انتظار کی ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں۔ اس لیکچر کے آخر میں سوال وجواب کی صورت میں تصور انتظار پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ لیکچر عمرانیات سے بڑھ کر مذہبی تصورات اور عقاید پر مبنی ہے۔

حر

"حر" کے عنوان سے علی شریعتی نے ایک لیکچر حسینیہ ارشاد میں ہی دیا تھا جس میں حضرت حر کی شہادت کے واقعات کو اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا اور فلسفہ شہادت کی فلسفیانہ توجیحات پیش کیں۔ انہوں حضرت امام جعفر صادق کے اس قول کا حوالہ دیا کہ کل زمین کربلا اور کل زمانہ عاشورہ اور کل انسان حر انسان بن جائیں تو زمین کا مقدر سنور جائے۔ حرؑ نے اپنے لئے شہادت کا رتبہ حاصل کرکے وفا وحیات کی اک تاریخ رقم کردی ہے۔

تعدد ازدواج

ڈاکٹر شریعتی کا ایک لیکچر اور ازدواج مطہرات نبی پاکؐ کے عنوان سے

حسینہ ارشاد میں ہی دیا گیا۔ جس کا انگریزی ترجمہ ایم نیک دوست نے کیا ہے۔ اس لیکچر میں علی شریعتی نے حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی کے حقائق پر مفصل روشنی ڈالی ہے انہوں نے غیر مسلم اور تنگ نظر مغربی پادریوں کے اعتراضات کا علمی اور منطقی جواب دیا ہے۔ انہوں نے اس دور کے معاشرتی ڈھانچے' نفسیاتی عوامل اور اقتصادی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ لاوارث اور بیوہ خواتین کے لئے بغیر مرد کے سہارے اور تحفظ کے زندہ رہنا محال تھا۔ ان حالات میں عورتوں کو بغیر نکاح کے گھر میں ڈالنا اور خراب تھا۔ چنانچہ تعدد ازدواج کو کڑے ضوابط کے ساتھ مربوط کرکے خصوصی حالات میں اجازت دی گئی۔ جنگوں میں بے شمار مرد شہید ہوجاتے تھے۔ عورتیں اور بچے لاوارث ہوکر در در کی ٹھوکریں کھاتے تھے۔ ایسے حالات میں ایک ضابطے کے اندر مجبور عورتوں کو سہارا مہیا کرنا ہر سماجی اور اخلاقی نظام کا فرض تھا۔

علی شریعتی نے اس لیکچر میں اسلام کی طرف سے خواتین کو دئے جانے والے حقوق کا بھی ذکر کیا۔ اسلام نے مردوں پر عورتوں کے حقوق ادا کرنے کی پابندی عائد کرنے کے ساتھ ساتھ عورتوں کو وراثت میں بھی شریک ٹھہرایا۔ یہاں تک کہ بال بچوں کی پرورش کے لئے شوہر سے معاوضے کا بھی ان کو حقدار ٹھہرایا۔ اسے حق مہر کا بھی مالک قرار دیا۔ علی شریعتی نے کہا مغربی تصورات کے برعکس اسلامی معاشرے اور فلسفے کے مطابق عورت برابر ہونے کے ساتھ ساتھ مرد کی تکمیل کرنے والی ہستی بھی ہے۔ فطرت نے مرد وزن کو دو ایسے ٹکڑے بنایا جن کے ملاپ سے ہی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ دونوں کے ملاپ کے بغیر فطرت کو یہ تصویر نامکمل اور ادھوری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین سے بھی بیعت (ووٹ) حاصل کی۔ ان کو صحابیات کا درجہ بھی عطا کیا۔ اس عرب معاشرے میں جہاں خواتین کو بچپن میں زندہ گاڑ دینے کا رواج ہو وہاں عورتوں کو ان مدارج ومناصب کا حقدار ٹھہرانا ایک

سرگرداں ہو کر نجات پانے کی راہ دکھاتے ہیں جبکہ اسلام موجود اور سامنے کی زندگی کو مرکز نگاہ و حیات بنا کر اس کی راہ سے اگلے جہاں کو سنوارنے کی بات کرتا ہے۔ اسلام میں تلوار' خون اور جہاد کا تصور ایسے ہی نہیں دیا گیا۔ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو مسلسل جدوجہد اور خونی غسل کے ذریعے حیات نو پاتا رہتا ہے۔ علی شریعتی کہتا ہے کہ یاد حسینؓ اور واقعہ کربلا سچے تصور اسلام کو زندہ رکھنے کی سب سے اہم علامت ہے۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ خون حسینؓ کو صرف آنسوؤں میں نہیں بہا دینا چاہئے۔ تلوار اٹھا کر صرف اپنے جسم زخمی نہیں کرنے چاہئے۔ یہی تو ہمارے مخالفین چاہتے ہیں کہ ہم غم کو آنسوؤں میں تبدیل کرتے رہیں اور خون ہم نے اپنا نہیں ان لوگوں کا بہانا ہے جو اسلام کا خون صدیوں سے بہاتے چلا آرہے ہیں۔

اسلام ہر لحاظ سے دوسرے مذاہب سے مختلف و ممتاز ہے۔ دوسرے مذاہب غربت وافلاس کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ اسلام اسے مسترد کرتا ہے۔ بقول ابوذرؓ ایک دروازے سے غربت داخل ہوتی ہے تو دوسرے دروازے سے مذہب رخصت ہوجاتا ہے۔ جو معاشرہ اقتصادی افلاس کا شکار ہوگا۔ وہ روحانی افلاس کا بھی شکار ہوجائے گا علی شریعتی یہاں حضرت علیؓ کے دور خلافت کی مثال پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے خلافت کا منصب سنبھالتے ہی معاوضوں کی شرحیں تبدیل کردیں۔ انہوں نے بڑے بڑے عہدیدار اور چھوٹے سے چھوٹے کارکن کی تنخواہوں کو مساوی کردیا۔ سینٹ پال جیسا انسان کہتا ہے کہ خدا کے گھر بھوک کی اینٹوں سے بنائے جاتے ہیں اور بھوک سے انسان کو تراوت ملتی ہے۔ جبکہ ابوذر غفاریؓ بھوک کو انسان کا سب سے بڑا دشمن بتاتے ہیں۔ چنانچہ اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ روشن فکر دانشور اسلامی معاشرہ میں اسلام کے حوالے سے ہی بات کرے گا۔ پہلے وہ خود سچے اسلام کو سمجھے گا اس کے بعد اس سوچ کو عام کرے گا جہاد اور اجتہاد یہی دو ہتھیار ہوں گے اس کے پاس۔ ان دو ہتھیاروں کے بغیر وہ روشن فکر بن ہی نہیں سکتا۔

سماجی انقلاب ہی تھا۔ اس لیکچر میں شریعتی نے بڑی تفصیل کے ساتھ بی بی زینب سے حضورؐ کی شادی کے واقعے کو بیان کیا ہے اور ان عوامل پر روشنی ڈالی جس کے تحت یہ شادی ناگزیر ہوگئی تھی۔ زید بن حارثہ کی حضورپاکؐ سے محبت اور زیدؓ اور زینبؓ کی شادی کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ منطقی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ کہ یہ شادی ایک بہت بڑی سماجی ضرورت اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔

حضورؐ نے بی بی خدیجہؓ سے ۲۵ سال عمر میں شادی کی جبکہ بی بی کی عمر ۴۰ سال سے اوپر تھی۔ حضورؐ نے ۲۵ سال تک یہ شادی نبھائی اور بی بی خدیجہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ ان کی ساری اولادیں انہی سے ہوئی۔ باقی سب ازدواج جو پہلے سے شادی شدہ (سوائے حضرت عائشہؓ) تھیں اور بچے پیدا کرسکتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آنے کے بعد کسی بچے کی ماں نہ بن سکیں (سوائے حضرت ماریہؓ کے جن کا بچہ پیدا ہوتے ہیں فوت ہوگیا)۔ حضورؐ کی باقی کی ساری شادیاں آخری دس سالوں میں ہوئیں۔ علی شریعتی نے اس لیکچر میں اس نازک موضوع پر بڑی علمی گفتگو کی ہے اور ایک ایک کرکے تمام جھوٹے الزامات (نعوذ باللہ) کو مسترد کیا ہے۔

سارتر کا کہنا ہے کہ فانان کو نہ پڑھنے والا خود اپنے تعلیمی کلچر کا مقروض ہے۔ اسی طرح علی شریعتی شہید کے مطالعے سے محروم رہ جانے والا خود اپنا قرض دار ہے۔ دور جدید میں لبریشن تھیالوجی اور مزاممتی ادب کے سقراط ڈاکٹر علی شریعتی کا مطالعہ کیجئے اور اپنا قرضہ چکائیے

اقبال اور علی شریعتی

اقبال کو بیسویں صدی کا سب کے بڑا مسلمان مفکر شاعر و دانشور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اپنے قلم وعلم کو تلوار بنا کر استعماری قوتوں کے خلاف استعمال کرنے والوں کی صف میں وہ سب سے آگے نظر آتا ہے۔ بھوک پیاس جہالت اور آمریت کی زنجیروں میں جکڑی تیسری دنیا کے مسلمان حصے میں بہت کم ایسے دانشور ابھرے ہیں جنھوں نے اپنے قلم وعلم سے وہ استعمار شکن کام لیا جو اقبال نے لیا۔ اس نے برصغیر کے رہنے والوں میں سیاسی شعور بیدار کیا' مسلمانوں میں جذبہ اسلام کی صحیح تصویر ابھاری اور کچلے مسلے انسانوں کو خودی و خود داری کا درس دے کر ان کو اپنے پاؤں پہ کھڑا کرنے کی سعی کی۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں جتنے بھی دانشور و و تعلیم یافتہ لوگ سامنے آئے وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر فکر اقبال سے ضرور متاثر ہوئے۔ نوجوانوں کی آنکھ کا تو وہ تارا تھا۔

اقبال مشرقی و مغربی علوم دونوں سے آگاہ تھا۔ اس لئے عصر حاضر کے مسائل کا پورا ادراک رکھتا تھا۔ وہ ماضی پرست نہ تھا بلکہ ماضی کی اچھی روایات کو ساتھ لے کر حال کو سنوارنا چاھتا تھا۔ وہ مستقبل بین بھی تھااور مستقبل شناس بھی۔ وہ رجائیت پسند تھا اور قوم کو بیدار کرکے اسے اپنی قوت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان نسل اسکی گرویدہ ہوگئی اور اسکے نغموں سے اپنی زندگیوں میں روشنیاں بھرنے لگی۔ اقبال نے صرف برصغیر کے روشن خیال مسلمان دانشوروں کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ، سرے مسلم ممالک میں بھی مسلمان دانشور طبقہ ان کے خیالات سے پوری طرح متاثر ہوا۔

ایران کا ملک نہ برصغیر سے دور تھا نہ اقبال کے افکار ونظریات کی پہنچ سے پرے۔ اقبال کا بیشتر کلام چونکہ فارسی میں ہے اس لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ان کے مخاطبین ہندوستان کے لوگوں سے زیادہ ایران اور افغانستان کے لوگ ہیں جن کی زبان ہی فارسی ہے۔ ایران کے ان ہی فارسی دانوں میں ایک نوجوان ابھرا۔ نام اسکا علی شریعتی تھا۔ مقصد

اور مشن اسکا وہی تھا جو ڈاکٹر اقبال کا تھا۔

اقبال 21 اپریل 1938ء کو فوت ہو گیا اس وقت علی شریعتی کی عمر پانچ چھ سال تھی۔ جوں جوں یہ بچہ بڑا ہوتا گیا اپنے مشن کی تکمیل کے لئے فکر نو سے آگہی حاصل کرتا گیا۔ جب وہ سکول سے نکل کر کالج اور یونیورسٹی پہنچا تو اقبال کے کلام کی دھوم اسکے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے جانا یہ تو سب اسی کی باتیں ہیں۔ علی شریعتی نے بن دیکھے اقبال کو اپنا استاد مان لیا۔ روشن خیالی کا جو مشن اقبال نے برصغیر میں شروع کیا تھا علی شریعتی نے ایران میں اسی مشن کر آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھا لیا۔ وہ استاد سے تیز ثابت ہوا۔ استاد نے صرف اپنی زندگی اپنے مشن کے لئے سپرد کی۔ شاگرد نے اپنی جان بھی دے دی۔ علی شریعتی نے اقبال کے بارے میں چند لیکچر دئے جو کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ علی شریعتی نے ہی اقبال کو علی نما کے معزز خطاب سے نوازا۔ یہ وہ خراج تحسین ہے جو شاید ہی کسی نے اقبال کو دیا ہو۔ علی شریعتی کے مسلک سے تعلق رکھنے والے کسی فرد سے اسکی توقع کرنا بھی محال ہے۔ مگر علی شریعتی جان گیا تھا کہ اقبال کیا ہے۔ اور وہ کیا پیغام دے رہا ہے۔ جس آواز دوست کو اقبال اپنی شاعری کے ذریعے گھر گھر پہنچا رہا تھا۔ وہی آواز دوست علی شریعتی کا بھی منتہائے حیات تھی۔

مشرق کے ان دو دانشوروں میں حیران کن مماثلتیں پائی جاتی ہیں دونوں مشرق و مغرب کے تہذیبی اور تعلیمی کلچر سے ابھرنے والے اس نئے انسان کی شبیہہ تھے جو اس سیلاب میں بہنے سے بچ گیا تھا جسے تہذیب مغرب اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ دونوں کے پاؤں اپنی زمین میں گڑے تھے دونوں کے سر فخر سے بلند تھے اور دونوں خود آگہی کی شراب کے نشے میں چور تھے۔ ذیل میں ان کے افکار اور زندگی کے حالات و تجربات کا مختصر موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔

مشرق و مغرب کا امتزاج

اقبال کی ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی۔ عربی و فارسی کی تعلیم اس نے اس

زمانے کے دستور کے مطابق مسجد میں حاصل کی۔ اتفاق سے سکول کے ہی زمانے میں ان کو مولوی میر حسن جیسا فاضل استاد مل گیا جو علم و فضل کا نمونہ ہونے کے ساتھ روشن خیال بھی تھا۔چنانچہ زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی وہ عربی فارسی اور دوسرے مروجہ دینی علوم سے بہرہ مند ہوسکا۔ سکول سے کالج آکر وہ مغربی علوم سے آشنا ہوا۔ اس نے فلسفے کو بطور مضمون پڑھا اور اسلامی تاریخ سے گہری شناسائی حاصل کی۔ پروفیسر آرنلڈ جیسا مستشرق استاد میسر آیا جو ایک غیر متعصب سکالر تھا اور جس نے اقبال کے اندر مغربی افکار کو تقلیدی انداز سے ہٹ کر تنقیدی انداز میں سمجھنے کا شعور پیدا کیا۔ اسکے بعد وہ جرمنی اور انگلستان کو تعلیم کے سلسلے میں گیا۔ جرمنی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کیا تو انگلستان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ جرمن زبان سیکھی قانون اور جدید فلسفے پر عبور حاصل کیا مگر اپنی جڑوں سے پیوستگی قائم رہی۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا تو اپنے علوم پر لکھا۔ اسکے مقالے کا موضوع ایران کے فارسی شعرا کی مابعد اطبیعاتی فکر سے متعلق تھا۔ گویا اس طرح اس کو ایران' فارسی زبان' اسلامی تصوف اور ایران کے بڑے بڑے صوفی شعراء اور دانشوروں کے کلام سے بھرپور شناسائی کا موقع ملا۔ وہ ان تمام تحریکوں سے آگاہ ہوا جو اسلامی دنیا میں تصوف کے حوالے سے جاری چلی آرہی تھیں۔ اسے مولانا روم' حافظ' سعدی' عطار' خیام اور دوسرے شعرا کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ کلاسیکی فارسی ادب کا گہرا شعور حاصل کر سکا۔ یہی افکار بعد میں ان کے کلام میں نئے نئے رنگوں سے جلوہ گر ہوئے۔

علی شریعتی مازیناں کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک عالم دین و مجتہد تقی شریعتی کے گھر پیدا ہوا۔ فارسی اپنی زبان تھی عربی و دینی علوم والد بزرگوار سے سیکھے۔ سکول کالج میں فرانسیسی زبان سیکھی اور ان پر ایسا عبور حاصل کیا کہ فرانسیسی سے فارسی زبان میں کئی کتابوں کے ترجمے کر ڈالے۔ علی شریعتی ایک سکالر شپ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس پہنچا۔اس نے بھی اقبال کی طرح یورپ میں پانچ سال قیام کیا اور سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کا موضوع بھی سوشیالوجی اور فلسفہ تاریخ تھا۔

دونوں دانشور پانچ سال یورپ میں رہنے کے بعد اپنے اپنے ملکوں کو لوٹے۔ دونوں کر وہاں کی تہذیبی چکا چوند نے متاثر نہیں کیا۔دونوں مغرب سے مرعوب و متاثر نہیں ہوئے۔ دونوں کے سامنے ایک مشن تھا اور وہ یہ مشن اپنے ملکوں میں بیٹھ کر اپنی قوم کی رہنمائی کرتے ہوئے جاری رکھنا چاہتے تھے۔ دونوں ڈالروں' پنڈلیوں اور اعلیٰ مناصب سے بے نیاز رہے۔ دونوں اگر چاہتے تو مغرب میں ہی رہ کر دولت کما سکتے تھے مگر دولت کمانا دونوں کی زندگی کا مقصد کبھی نہیں رہا۔ دونوں نے استاد بننے کو ہی اپنے مشن کی تکمیل کا حصہ جانا۔ دونوں کو مستقل نوکری کہیں نہ ملی

ان بے قرار روحوں کو نوکریوں کی تنگنائے میں بند کرنا آسان بھی تھا۔ روزگار کی تلاش میں دونوں مارے مارے پھرتے رہے۔ اقبال چھوٹی موٹی وکالت بھی کر لیتا تھا۔ علی شریعتی گلی گلی کوچہ کوچہ لیکچر دے دے کر اپنا کام چلاتا تھا۔ دونوں دانشور قلم ہاتھ میں پکڑے اپنے مشن کو عام کرتے رہے اقبال نظمیں پڑھتا اور لکھتا تو علی شریعتی کی زبان لیکچروں کی صورت میں آگ برساتی تھی۔ اقبال جتنا بڑا شاعر تھا علی شریعتی اتنا بڑا خطیب تھا۔ اس کی اکثر تحریریں ان کے خطبوں کی ہی تحریری شکل ہیں۔اقبال کی سب سے پہلی تصنیف اقتصادیات کے بارے میں تھی کہ وہ اسلامی انقلاب کے لئے اقتصادی مسائل کو بہت بڑی اہمیت دیتا تھا۔ علی شریعتی نے بھی سب سے پہلے ابوذر غفاریؓ پر قلم اٹھایا جو اسلام کو اقتصادی جبر اور سرمایہ داری نظام سے پاک کرنے کا مشن اپنائے ہوئے تھا۔ ابوذرؓ اسلام کے پہلے روشن خیال مجاہد تھے۔ جو اسلام میں داخل ہوجانے والی سرمایہ دارانہ بدعتوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

اقبال و شریعتی تین فکری دھاروں سے متاثر تھے۔ بلکہ تینوں کے اندر سے پیدا ہونے کے باوصف اپنا منفرد تشخص ابھارنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اقبال ہندوستانی مسلمان اور مغربی تہذیب و تمدن کے اندر سے ہو کر نکلے تھے۔ علی شریعتی قدیم فارسی' مسلمان اور مغربی ثقافت و روایات کی پیداوار تھے۔ دونوں مفکروں نے ان سرچشموں سے

سیراب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سلامت رکھا تھا اور تینوں تہذیبوں سے اپنے مطلب کے موتی چن کر فکر و خیال کی ایک ایسی مالا تیار کی تھی جسمیں انسانی بصیرت کی پوری دمک موجود تھی۔ دونوں مفکر دور جدید کے نئے انسان تھے۔ تاریخ کے سارے دھاروں کو سمجھنے اور ان کو ساتھ لے کر چلنے والے۔ مغرب سے ڈرنے والے نہ مرعوب ہونے والے۔ مشرق سے بے زار نہ اس سے دور بھاگنے والے

ضد سامراج

اقبال اور علی شریعتی دونوں سامراج دشمن تھے۔ اقبال کو برطانوی سامراجیت کا براہ راست سامنا کرنا پڑا مگر اس کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اسے ایک ایسی طاقت سے مقابلہ درپیش تھا جو اجتماعی طور پر تو قوموں کو نو آبادیاتی چنگل میں گرفتار کئے بیٹھی تھی مگر انفرادی سطح پر قانون اور شخصی آزادیوں کا احترام کرنا جانتی تھی اس لئے اقبال کو قیدوبند کی صعوبتوں میں سے نہیں گزرنا پڑا۔ اسکی سوچ' اسکے قلم اور اسکے افکار کی اشاعت پر کبھی پابندی نہیں لگی۔ گو اسے کوئی بڑا منصب پیش نہیں کیا گیا بلکہ ایک مرتبہ لاہور ہائی کورٹ کی جج شپ کے لئے اسکا نام بھی تجویز ہوا جسے انگریز گورنر نے مسترد کردیا۔ اسکے علاوہ اسے نائٹ کا خطاب دے کر سر بھی بنایا گیا۔ اقبال کی زندگی کے اس پہلو پر ابھی تحقیق باقی ہے کہ وہ اس قدر ضد سامراج اور انٹی ویسٹ خیالات رکھنے اور ان کی اشاعت کرنے کے باجود انگریزوں کے احتساب سے کیوں کر بچ سکا۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اقبال نے کبھی مسلح جدوجہد کی ترغیب نہیں دی۔ اس نے نام لے کر کسی ایک فرد گروہ قوم یا حکومت کو ٹارگٹ نہیں بنایا۔ وہ کسی تشدد پسند گروہ میں شامل بھی نہیں ہوا۔ وہ مسلم لیگ میں شامل رہا۔ صوبائی اسمبلی میں پہنچا' تقریریں کیں اور پرامن سیاسی جدوجہد کے ذریعے اپنے وطن کو آزاد کروانے کی فکر میں غلطاں رہا۔ مسلم لیگ اس زمانے میں بھی ایک معتدل مزاج لبرل پارٹی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے قائدین میں نواب وقار الملک' آغاخان' قائداعظم اور دوسرے زعما تھے جو اسی پرامن سیاسی جدوجہد میں شامل رہے۔ یہ لوگ کبھی جیل گئے نہ نو آبادیاتی غیض

وغضب کا شکار ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ کے مخالفین اس جماعت پر انگریز پرست اور سامراج دوست ہونے کا الزام بھی لگاتے ہیں۔

ہم اس بحث میں یہاں نہیں پڑتے۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ اقبال کی شاعری مغربی سامراج پر آگ برساتی نظر آتی ہے۔ یہ نو آبادیاتی نظام کے خلاف کھلم کھلا ایک بغاوت تھی اور مغربی تہذیب و تمدن کو زہر قاتل سمجھتی تھی۔ اقبال برصغیر کی آزادی کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ 1930ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اس نے اپنے شہرہ آفاق خطبے میں تصور پاکستان کے واضح خطوط ابھارے۔ دو مرتبہ لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنسوں میں شرکت کی۔ان کی تحریریں محمد علی' شوکت علی ظفر علی خان سے کم انقلابی نہ تھیں بلکہ اثر و تاثیر کے لحاظ سے وہ ان راہبران سیاست سے بہت بڑھ کر نفوذ پیدا کرنے والی تھیں۔علی برادران ظفر علی خان حسرت موہانی' گاندھی' نہرو' ابوالکلام آزاد جیل آتے جاتے رہے مگر اقبال کو کسی نے ٹچ نہیں کیا۔ کیا انگریز حکمران اور ان کے ہندوستانی کارندے اقبال کی شاعری اور کلام کو سمجھنے سے قاصر تھے؟۔ کیا اقبال کو محض شاعر اور فلسفی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ نو آبادیاتی حکمران تو اسقدر سادے اور بھولے بھالے نہیں ہو سکتے۔ نہ برطانیہ سے آئے ہوئے سفید فام اسقدر ناسمجھ تھے کہ وہ اقبال کے کلام کی مغرب دشمنی' نو آبادیات شکنی اور ضد سامراج کیت و کیفیت سے آگاہ نہ ہوں گے۔ یہ بات وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ مقرر کی سو تقریروں' خطیب و ادیب کی سو تحریوں سے انقلابی شاعر کی ایک نظم زیادہ موثر اور آگ لگا دینے والی ہوتی ہے۔ اقبال پر کیوں کبھی کوئی قدغن نہیں لگی اس پر ضرور سوچنا ہوگا۔ یہ کہہ کر اس باب کو ختم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بیرسٹر تھے اور قانون کو سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے کبھی کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔ کبھی کسی قانون کو نہیں توڑا۔ مگر یہ بات تو دوسرے بہت سے لیڈران کرام کے حق میں بھی درست ہو سکتی ہے۔ پھر وہ کیوں جیلوں میں سڑتے رہے۔

بات کچھ بھی ہو یہ طے ہے کہ اقبال کو سیاسی محاذ پر اپنے افکار کی نشر و اشاعت میں

کبھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نہ اس کی کسی تحریر پر پابندی لگی نہ کبھی سی آئی ڈی نے ان کے خلاف کوئی فائل کھولی۔ نہ کبھی اس کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا اور نہ کبھی گرفتاری سے بچنے کے لئے اسے چھپنا پڑا۔ انگریزوں کی قانون دوستی کے باوجود ہندوستان میں انہوں نے جسطرح قانون و آئین کی مٹی پلید کی۔ بڑے بڑے لیڈروں کو جیلوں میں ٹونسا' زبان بندیاں کیں' پریس اور اخبار ضبط کئے اسکو دیکھ کر یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں اقبال جیسے انقلابی مفکر و دانشور کو محض اس لئے بخشنے کے لئے تیار تھے کہ اس کا تعلق مسلم لیگ سے تھا یا یہ کہ وہ بے ضرر قسم کی مخلوق تھا۔ اقبال کے حوالے سے برصغیر میں انگریزوں کی سیاست و طریقہ واردات کا کچھ حصہ ناقابل فہم حد تک دلچسپ ہے۔ ایک بات ضرور ہے کہ اقبال انٹی اور ویسٹ انٹی کولونیالزم ضرور تھے۔ مگر وہ انتہا پسندی کی حد تک انٹی اسٹیبلشمنٹ نہ تھے۔ وہ سسٹم کے اندر رہ کر کام کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ نوآبادی نظام کی تردید و تنسیخ کی بات کرنا معمولی بات نہیں۔ پھر بھی اقبال پر ریاستی جبر کا نزلہ نہیں گرا جو ایک معجزہ ہی نظر آتا ہے۔ یہ اس کی خوش بختی تھی کہ اس کی آزمائش اس انداز سے نہ ہو سکی جس انداز سے تیسری دنیا میں رہنے والے دوسرے انقلابی سیاست کاروں اور دانشوروں کو جسمانی مصائب و تکالیف سے گزار کر کندن بنایا جاتا رہا ہے۔ میں اسے اقبال کی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت کی ہندوستانی بیورو کریسی اور امن وامان قائم رکھنے والی خفیہ و ظاہر ایجنسیوں نے اقبال کے بارے میں سب اچھا کی رپورٹ نہ صرف دی بلکہ اوپر والوں سے منظور بھی کروالی اور اقبال کا بال تک بیکا نہ ہو سکا مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اقبال نے کوئی سلیمانی ٹوپی قسم کی چیز پہن رکھی تھی کہ وہ جو کچھ لکھ رہا تھا وہ کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

اس تناظر میں جب ہم علی شریعتی کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ وہ جبر و خوف کے شکنجے میں رہتے ہوئے زمانہ طالب علمی سے ہی معتوب سرکار ہوا۔ اپنے وطن ایران میں شاہ اور اسکی جبر کار ریاستی مشین نے اسکا جینا دوبھر کردیا۔ قید تنہائی' جیل کے اندر

تشدد' ملاقات پابندیاں' جلا وطنی اور بالاخر شہادت یہ تمام چیزیں اسکے نصیب میں پہلے دن سے لکھی تھیں۔ اقبال کے مقابلے میں وہ ایک آزاد مسلمان ملک کا شہری تھا۔ بڑا عالم' دانشور اور پروفیسر تھا۔ معاشرے میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا مگر ریاستی جبر نے موت کے دن تک اسکا تعاقب کیا بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے موت کی نیند سلایا۔اس ضمن میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جہاں نو آبادیاتی نظام کے تحت سفید فام حکمران براہ راست فرائض حکمرانی سرانجام دیتے ہیں وہاں کسی حد تک قانون و آئین کی پاسداری ہوتی ہے اور تحریر و تقریر پر اتنی پابندیاں نہیں لگائی جاتیں جتنی خود نو آزاد ممالک میں نو آبادیاتی نظام کے پروردہ کالے حکمران لگاتے ہیں۔

پاکستان میں آزادی کے بعد روشن خیال شاعروں ادیبوں کی کیسی گت بنی یہ سب پر عیاں ہے۔ علامہ مشرقی جیسے عالمی شہرت یافتہ دانشور راہنما کو کیسے کیسے ریاستی جبر کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ علی شریعتی اقبال کی طرح خوش نصیب نہ تھا۔ موت اور تشدد اسکے تعاقب میں تھے۔ نوکری سے بر طرف ہوا' رزق کے دروازے بند ہوئے' حسینیہ ارشاد جیسا علمی ادارہ صرف اس وجہ بند ہوا کہ علی شریعتی وہاں لیکچر دینے آتا تھا۔ ان لوگوں پر بھی زیادتیاں ہوئیں جو اسکو سننے آتے تھے۔ وہ چھپ چھپ کر لوگوں کے گھروں کے تہہ خانوں میں آدھی رات کو دھیمی آوازوں سے اپنی بات پہنچاتا تھا۔ وہ آج ایک شہر میں تو کل دوسرے شہر میں ہوتا۔ ایک رات ایک محلے میں تو دوسری رات کسی اور گلی میں ہوتی۔ ہر آہٹ پر کان ہوتے تھے۔ ہر دستک موت کا پیغام لے کر آتی تھی وہ بھیس بدل بدل پھرتا تھا

وہ انٹی ویسٹ تھا اس سے شاہ کو غرض نہ تھی۔ وہ ملائیت و پاپائیٹ کے خلاف تھا۔ شاہ کو زیادہ غرض نہ تھی۔ وہ روشن خیال' ترقی پسند' جمہوریت پسند اور سوشلسٹ خیالات کا حامی و پرچارک تھا اس سے بھی شاہ کو غرض نہ تھی مگر وہ مکمل طور پر انٹی اسٹیبلشمنٹ تھا اور ملوکیت کو ضد اسلام قرار دیتا تھا۔ وہ اس سسٹم کے اندر رہ کر اسے توڑنا چاہتا تھا۔ شاہ کی ڈھائی ہزار سالہ باشاہت کو علی شریعتی جیسے دانشوروں سے خطرہ لاحق گیا تھا۔ علی

شریعتی عملی جد وجہد سے وابستگی رکھتا تھا۔ وہ نوجوانوں کو ابھار کر میدان عمل میں لانا چاہتا تھا۔ اسکی جدوجہد کے دو پہلو تھے۔ ایک اسلام کی روشن خیال توجیح و تفسیر اور اسلام کے اندر گھسے غیر اسلامی عناصر سے فکری و عملی پنجہ آزمائی اور دوسرے ایران پر چھائی غیر اسلامی ملوکیت کا خاتمہ۔ اسکی جدوجہد کا یہ دوسرا پہلو اس کے لئے زبردست مشکلات کا باعث بنا۔

شاہ کو ملاؤں سے زیادہ خطرہ نہ تھا۔ اگرچہ ایران کے حوالے سے مذہبی طبقے بہت بڑی سیاسی قوت تھے اور ان کا اثر نفوذ برصغیر کے مذہبی طبقوں کے مقابلے میں زیادہ بھی تھا اور مختلف بھی۔ ایران کے مذہبی طبقے خود بھی ترقی پسند تھے اور ایران کے جدید تعلیم یافتہ اور ترقی پسند نوجوان ان کی بات سنتے بھی تھے۔ اس کے برعکس برصغیر میں مذہبی طبقوں کے اندر ایسے لوگ موجود تھے جو سامراجیت کے ساتھ مل کر کام کررہے تھے اور اسے مضبوط بنا رہے تھے برصغیر میں لبریشن تھیالوجی کا وہ تصور نہ پہنچا تھا۔ نہ اسکا اثر مذہبی طبقوں میں پیدا ہوا تھا۔ جس کے تحت افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مذہبی طبقے حکمران اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دینے کی جگہ عوام الناس کی اکثریت کا ساتھ دینے کی رسم کو اپنا رہے تھے۔ برصغیر میں انگریزوں نے مذہبی طبقوں کو کبھی اپنے لئے سنجیدہ خطرہ نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ سیکولر قوتوں کے مقابلے میں ان کو اس طبقے سے سودے بازی کرنا آسان لگتا تھا۔ ایران میں بھی صورت حال مختلف تھی

شاہ کی ریاستی مشنری کو سب سے بڑا چیلنج روشن خیال مذہبی طبقوں کی طرف سے درپیش تھا۔ ان لوگوں میں جھکنے اور بکنے والے کم تھے۔ جہاں دینی مدرسہ تھا وہاں ایک بہت بڑا شاہ دشمنی کا اڈہ اور مورچہ تھا۔ ایران میں مذہبی طبقے اسلام کو ملوکیت سے پاک کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے تو شاہ اپنی بادشاہت خاندان اور جان بچانے کی فکر میں تھا۔ شاہ نے سسٹم کو بچانا تھا۔ وہ اس سسٹم کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹانے پر آمادہ تھا۔ علی شریعتی اسکے راستے کی ایک رکاوٹ بن گیا تھا۔ وہ مذہبی طبقوں سے تعلق رکھتا تھا اور مذہب کو گھر سے پڑھ کر آیا تھا۔ مذہبی طبقے اسکی اسلام شناسی کو اسطرح چیلنج نہیں کر سکتے

تھے جسطرح برصغیر میں اقبال کی مذہبیت کو علما نے چیلنج کر دیا تھا۔ مذہب کے بارے میں اقبال کی حیثیت کو وہ ماننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ علی شریعتی کا معاملہ دوسرا تھا۔

وہ علامہ تقی شریعتی کا بیٹا تھا۔ باپ کے زیر سایہ تربیت پائی تھی مذہبی امور و مسائل پر اسکی گہری گرفت تھی پھر وہ (علی شریعتی) جدید فکر و خیال سے بھی پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی تھا وہ بھی فرانس سے۔ فرانس کے بڑے بڑے فلسفیوں دانشوروں کا ذاتی دوست' عالمی تنظیموں سے وابستہ' عملی جدوجہد میں یقین رکھنے والا اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ سر پر کفن باندھے ہوئے شہادت کے لئے ہمہ وقت تیار۔ توپوں تلواروں اور طوفانوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے والا تنہا گلیڈی ایٹر۔ ایک طرف یہ بانکا سجیلا' کفن پوش' خوبصورت' جدید تعلیم یافتہ نوجوان دوسری طرف خون آشام اور خونخوار درندہ صفت ملوکیت جسکو قانون' آئین' اسلام سے کوئی غرض نہ تعلق۔ یہ ملوکیت صرف جبر پر اپنی عمارت اور امارت قائم کئے ہوئے تھی ہر مسئلے کا علاج اسکے نزدیک جیل اور پھانسی تھا علی شریعتی نے اس طاقت کو براہ راست چیلنج کرکے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا چنانچہ اس کے پروانہ موت پر شاہ اور علی شریعتی دونوں کے دستخط ثبت ہو چکے تھے۔

اسلام شناسی

اقبال اور علی شریعتی دونوں کی زندگی کا محور اسلام تھا۔ دونوں اسلام کو بہت بڑی حرکی قوت مانتے تھے۔ دونوں نے ادیان عالم کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ عصر قدیم اور عصر جدید کے تمام نظام ہائے فکر و حیات کے مقابلے میں اسلام ہی وہ لائحہ عمل ہے جو انسان کی داخلی و خارجی ساری آرزومندیوں کی تسلی کروا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام محض عبادات و رسومات کی مشقت نہیں جسے انسان محض شناخت کے طور پر اپنا لے اور مخصوص و معین اوقات اور طریقہ کار کے مطابق لفظوں کی جگالی کرے اور اپنے اوپر مذہب کا لیبل لگا کر سمجھ لے کہ وہ فریضہ مذہب ادا کر چکا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اسلام اور

دوسرے مذاھب میں زیادہ فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال و شریعتی پوری طرح یہ سمجھ چکے تھے کہ سچے اسلام کے ساتھ تاریخ کی چودہ صدیوں سے یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اور شاہوں اور پیشواؤں نے مل کر حرکت و حرارت سے معمور اس حیات آفریں اور انقلاب پرور پیغام انسانیت کر محض بے مغز و روح عبادات کا مجموعہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہوا ہے۔ یہی دوسری قسم کا اسلام ان کو وارا کھاتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ان کی مراعات کے محل بلند ہی ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی انانیت کو روغن قاز ملتا رہتا ہے اور وہ تمام تکبر تبختر اور ان استحصال کے باوصف مسلمان اور بڑے دین دار مسلمان کہلا سکتے ہیں اور یہی کچھ ان ملوکوں اور ملوکیت پسندوں نے کیا تھا۔

چودہ صدیوں سے سچے اسلام کو یرغمال بنا کر ان مستبد سیاہ کاروں نے اسلام کی قبا وعبا کو اپنا رکھا ہے۔ ان کے جبہ وکلہ دستار اسلام کے نام پر اسلام کو زک پہنچانے کی سعی تمام ہیں۔ اقبال اور شریعتی اس بات پر متفق تھے کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہو گی کہ سب سے پہلے اسلام کو اس طبقے کے قبضہ غاصبانہ سے واگزار کروایا جائے۔ ان لوگوں نے اپنی مراعات کی عمر دراز کرنے کے لئے قرآن کو اپنی تاویلات کے ذریعے بے اثر بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اقبال کا سارا کلام اس تاریک فکر اور فی سبیل اللہ فساد پھیلانے والی ملائیت کے خلاف ایک نعرہ جہاد و بغاوت ہے۔ اقبال کا کہنا تھا کہ ہمارا پہلا جہاد گھر سے ہی شروع ہو گا اسلام کا آغاز لا سے ہوتا ہے۔ اسکے بعد اللہ کی منزل آتی ہے۔ اس باب میں ہمارے جہاد کا مطلب ہو گا اسلامی فکر ودانش حیات و تاریخ کو ان غیر اسلامی بلکہ ضد اسلامی فکرو خیالات جھاڑ جھنکار سے پاک و منزہ کرنا جو اسلام اور خدا کے گھر میں بن بلائے نہیں بلکہ خاص ڈیزائن کے تحت داخل ہو چکے ہیں اور گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگانے کا باعث بنے ہیں۔

برصغیر کے تاریک خیال رجعت پسند مذہبی حلقوں نے کبھی اقبال کو پسند نہیں کیا۔ اسکے خلاف باقاعدہ کفر کے فتوے جاری ہوئے۔ بار بار یہی کہا جاتا رہا کہ اقبال کو مذھب کی

بات کرنے کا حق نہیں۔ اقبال کو خدا قرآن پیغمبراسلام اور اسلام کے بارے میں اظہار خیال کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ تو چند جبہ پوش خانقاہ نشین اور گھوٹے مار لوگوں کا استثنائی حق ہے۔ اقبال پر دوسرے روشن خیال لوگوں کی طرح مغرب زدگی کی چھاپ لگائی گئی۔ کہا جاتا کہ وہ کلین شیو ہے۔ داڑھی نہیں رکھتا کوٹ پتلون پہنتا ہے' ٹائی لگاتا ہے' انگریزی بولتا ہے' بیرسٹر ہے' انگریزی کتابیں پڑھتا ہے اور لکھتا ہے۔ وہ شاعر ہے اور محض شاعری ہی کر رہا ہے۔ اسکو مذھب اور اسکی باتوں سے کیا سروکار۔ دوسری طرف اقبال اسلام اور الہیات کی تشکیل جدید میں مصروف تھا اور کئی صدیوں کے بعد ایک سچے مجتہد کی طرح اجتہاد کی نئی راھیں کھول رہا تھا۔ اسکا تو اوڑھنا بچھونا یہ مشن تھا کہ کس طرح اسلام کو رجعت پسندانہ اور غیر اسلامی توجیہات اور مقلدانہ روشوں سے آزاد کروا کے دنیا کے سب سے بڑے سیاسی' سماجی اور معاشی انقلاب کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرے اس باب میں اسکا رویہ معذرت خواہانہ کی جگہ جارحانہ تھا۔

اسکے مخاطب بیک وقت دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک اپنے مسلمان بھائی بہنیں جو ایک غیر ترقی پسند سماج میں پھنسے اسلام کی حقیقی اساس سے بے بہرہ بے نیاز کردئے گئے تھے۔ جن کے لئے اسلام' ہندومت اور سکھ مت میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جو تقدیر پرستی کے چکر میں گرفتار ہونے کے بعد علم و عمل دونوں سے بیگانہ ہو کر ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھے انہونی باتوں کے منتظر تھے۔ تعویذ گنڈے مزاروں کے چکروں میں گرفتار تھے۔ ان کی کیسٹ ماضی کے اندر پھنسی ہوئی تھی اور وہ فکر امروز اور فکر فردا دونوں سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ اقبال نے ان گرے پڑے مسلمانوں کو اٹھاکر بٹھانا اور کھڑا کرکے متحرک کرنا تھا۔ دوسری طرف اقبال نے دنیا کے دوسرے مذاہب خاص طور پر دانش افرنگ و مغرب کے سامنے اسلام کی حقیقی روح کو اپنے پورے انقلاب آفرین جلووں' جذبوں اور فکری عظمتوں کے ساتھ تاریخ کی گرد ھٹا کر پیش کرنا تھا۔ دنیا میں اسلام کے بارے میں جو یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ اسلام بطورایک قوت کے ختم ہو چکا ہے۔ اسکا رس وہ طبقے پی کر تنومند ہو چکے

ہیں جو اس کے اوپر اس کے نام پر مسلط چکے ہیں۔ اس تاثر کو مٹا کر اسلام کا اصل چہرہ دکھانا ہی اقبال کا مشن تھا۔

مغرب نے اپنی پاپائیت کا یہی علاج کیا تھا کہ اسے اٹھا کر ایک کونے میں رکھ دیا تھا اور مذہب کو ریاست سے الگ کر کے ایک نئے قسم کے ریاستی فکری نظام کی بنا رکھی تھی۔ مغرب اہل مشرق اور اہل اسلام کو بھی یہی مشورہ دے رہا تھا کہ اگر دنیا میں ترقی کرنی ہے تو مذہب سے بے گانگی اختیار کرو۔ اس موقع پر جب جدید تعلیم یافتہ نوجوان اس مغربی سوچ سے متاثر ہو کر مذہب سے دور ہوتے جا رہے تھے اقبال جیسا مغربی تعلیم و فکر سے اچھ اچھ مزین مفکر نعرہ مستانہ لگا کر میدان میں اترتا ہے اور پیام مغرب کے مقابلے میں پیام مشرق کا پرچم اٹھا کر کہتا ہے۔ "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" اقبال قوم کو یاس مجہولیت اور مرعوبیت سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بنیادی سٹرٹیجی ہی اسلام قرآن نبی پاک کی حیات اور تاریخ اسلامی کے روشن ابواب کو بنایا اقبال نے دامن مصطفیٰ کو تھام لیا اور بغیر کسی جھجک کے اعلان کر دیا

بہ مصطفیٰ برسان خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کودے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

اقبال قرآن کا حافظ تھا۔ محض رٹنے کے حوالے سے نہیں بلکہ اسکو سمجھنے اور روح اسلام کو سمجھانے کے حوالے سے۔ یہی اسکا مشن تھا۔ اسکا کلام قرآن کی تفسیر نظر آتا ہے۔ قدرت نے اس کو شاعری کا بے پناہ ملکہ عطا کیا تھا۔ اس صلاحیت کو اس نے ذاتی خوشنودی یا شہرت کے لئے نہیں استعمال کیا۔ وہ چاہتا تو محض لفظوں اور رومانوں کا شاعر بن کر شاعرانہ طور پر شاید موجودہ مرتبے سے بڑھ کر مقام حاصل کر لیتا مگر اس نے کبھی بھی شاعری پر بطور شاعری ناز نہیں کیا۔ اس عطیہ زبانی کو ایک وسیلہ

جانا اپنے افکار کو دوسروں تک پہنچانے کا۔اس نے اپنے آپ کو ایک معلم، مبلغ اور نظریہ اسلام و قرآن کا پرچارک جانا۔ اسکی حیات کا ماٹو اسکا اپنا یہ شعر تھا۔

نواپیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اقبال نے اپنے لئے بلبل کا کردار منتخب کیا جسکا کام نغمے الاپ کر دوسرے پرندوں خاص طور پر کبوتروں کے اندر شاہین کا جگر پیدا کرنے کے لئے سعی پیہم کرنا ہے۔ قوم کبوترین چکی ہے۔ اگر اسے زندہ رہنا ہے تو اسے شاہین بننا ہو گا۔ اسے شاہین بنانے کے لئے باغ کے بلبلوں نے اپنی آواز کے جادو سے نازک جسموں میں انقلاب کی روح پھونکنی ہے۔ اقبال دانشوروں اور شاعروں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے آگے بڑھ کر چمن کی قیادت سنبھالنی ہے۔

جو کام اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے کیا۔ وہی کام علی شریعتی نے اپنی تقریروں تحریروں اور خطبات کے ذریعے سر انجام دیا۔ اقبال بہت بڑا شاعر تھا۔ علی شریعتی بہت بڑا خطیب اور نثر نگار تھا۔دونوں کو جو صلاحیتیں فطرت کی طرف سے عطا ہوئی تھیں ان کو انہوں نے قوم وطن اور دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف کیا۔ علی شریعتی بھی جدید تعلیم یافتہ روشن خیال مسلمان دانشور تھا۔ کلین شیو تھا۔ فرانسیسی سوٹ اور ٹائی پہنتا تھا۔ فرانسیسی زبان بولتا اور لکھتا تھا۔ مغربی دانش سے پوری طرح بہرہ مند تھا۔ قرآن، اسلام اور پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ کو اپنی فکر کی مشعل راہ بنائے ہوئے تھا۔ اگر اقبال کی شاعری کو سن کر لوگ مسحور ہو جاتے تھے تو علی شریعتی کے خطبات اور اسکی طلاقت لسانی کے بھی لوگ گرویدہ تھے۔ لوگ اسکی زبان میں اسکی باتیں سننا چاہتے تھے۔ جہاں اسکا لیکچر ہوتا لوگ جوق درجوق وہاں پہنچ جاتے۔ ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ کی ایجاد نے ان کے کام کو کافی آسان بنا دیا تھا۔ علی شریعتی کا پیغام اسکی اپنی زبان میں گھر گھر پہنچ رہا تھا۔ ان کے چاہنے والے کسی ایک گھر میں جمع ہو

جاتے اور پھر کیسٹ اپنا کام دکھاتی۔ علی شریعتی دلوں سے گھروں میں اور گھروں سے کیسٹوں میں منتقل ہو کر ایران کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔

علی شریعتی کی اسلام شناسی پورے ایران میں مشہور تھی لوگ اس سے مغرب کی باتیں سننے کے لئے نہیں آتے تھے۔ اگرچہ ان کو علم تھا کہ وہ مغربی تعلیم و فکر سے آراستہ بہت بڑا دانشور ہے۔ مگر لوگ اس نئی توجیہہ کو سننے آتے تھے جو اس نوجوان معلم نے اسلام و قرآن کے باب میں کر رکھی تھی۔ وہ حیران تھے کہ اتنے سالوں اور صدیوں سے علماء و مفکرین کی باتیں سنتے چلے آ رہے ہیں کسی نے ان کو وہ کچھ نہیں بتایا جو علی شریعتی بتا رہا ہے۔ کسی نے ان کو اسلام کے بطور سب سے بڑے انسانی انقلاب کے اسطرح دلنشین انداز میں متعارف نہیں کروایا۔ جنہوں نے بتایا بھی وہ صرف مشرقی علوم سے بہرہ مند تھے مغربی علوم و فکر کے بارے میں ان کی رائے محض سنی سنائی باتوں پر تھی۔

یہ علما اگر مغرب کو برا بھلا کہتے تھے تو ان سے پوچھا جاسکتا تھا کہ آپ نے مغرب کو پڑھا ہے۔ مغربی زبانوں سے تمہیں آگہی ہے۔ چنانچہ ان اصحاب فکر کی مغرب دشمنی محض ان دیکھی دشمنی تھی۔ علی شریعتی نے جب مغرب کو پڑھ کر' دیکھ کر اور اسکے اعلیٰ ترین علمی مراتب حاصل کرکے اپنی رائے کا اظہار کیا تو ایران کی جدید تعلیم یافتہ نسل کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ان سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کی بات غلط نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف جب علی شریعتی اسلام اور قرآن کی بات کرتا تو ان کو خوشگوار حیرت ہوتی ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایک مغرب زدہ شخص اسلام کی اتنی گہری بصیرت رکھتا ہو گا یا اسلام کو دنیا کا سب سے بڑا انقلاب قرار دیتا ہو گا وہ اسکی باتیں سننے کے لئے تیار تھے کیونکہ وہ ان میں سے ہی تھا۔

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے جدید تعلیم یافتہ ایرانی نوجوان سمجھتا تو تھا مگر کہنے کی جرات رکھتا اور نہ الفاظ اور پیرایہ اظہار۔ علی شریعتی نے مذہب کے بارے میں

معذرت خواہانہ رویوں کو ختم کیا اور نوجوان نسل کو باور کرایا کہ تمہارا مذہب ودین دنیا کا سب سے ارفع دین ہے۔ اسمیں تمہارے تمام دکھوں کا مداوا موجود ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم اسے ٹھیک طرح سمجھو۔ قرآن کو قبروں میں بیٹھ کر مردوں کو مت سناؤ بلکہ اسے زندوں میں لاکر زندوں کو سناؤ۔ صرف سناؤ ہی نہیں اس پر عمل کرکے دکھاؤ قرآن ایک کتاب ہے۔ جسمیں انسانوں کی راہ نمائی کے اصول لکھ کر انسانوں کو پیش کیے گئے ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کرنا ہے نہ کہ ان اصولوں کی صرف گردان کرنی ہے۔

علی شریعتی جب مذھب کی بات کرتا تو مذہبی طبقے اس پر ناک بھوں سکیڑتے اسکو برا بھلا بھی کہتے۔ اس کی مذہبی باتوں میں سے مین میخ نکالتے مگر وہ جانتے تھے کہ علی شریعتی کا مذہبی علم کسی طرح ان سے کم نہیں ہے۔ وہ تقی شریعتی کا بیٹا ہے جو بہت بڑا عالم دین ہے۔ قرآن احادیث اور سنت نبوی کی ساری کتابیں اسکے سامنے بچپن سے موجود رہی ہیں۔ عربی فارسی اسکے گھر کی زبانیں ہیں۔ اسکے سارے خاندان نے دین و مذھب کے لئے بے پناہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ پیچ و تاب تو کھاتے مگر اسکی اسلام شناسی کو کمتر نہیں دکھا سکتے تھے۔ وہ اسے بھولا اور بھٹکا ہوا قرار دیتے' اسکو مغرب کے تاثر کا مارا ہوا قرار دیتے۔ مگر علم کے میدان میں اسکا جواب بہم پہنچانے سے قاصر تھے۔

علی شریعتی نے اصلی اسلام اور سوڈو اسلام کی تفریق کرکے ظاہر کی تو اسکے ساتھ ساتھ اس نےاپنے مسلک کے حوالے سرخ شیعیت اور سیاہ شیعیت کا فرق بھی واضح کیا۔ اس نے اپنے مسلک کے لوگوں کو کہا کہ تمہارا ماتم اور رونا پیٹنا کسی کام کا نہیں اگر تم اسے خون شہادت سے رنگین کرنے کا حوصلہ و توفیق نہیں رکھتے تو صرف سیاہ پوش رہنا خدمت دین نہیں۔ یہ تو پھر وہی رسوم و قیود کی پاسداری ہو گئی۔ اگر تم شیعیت پر ایمان رکھتے ہو تو اس شیعیت کو اپناؤ جو علیؓ نے اپنائی حسن

ؓ نے اپنائی حسینؓ نے اپنائی زینبؓ نے اپنائی۔خون سے اپنے آپ کو رنگیں کرو مگر یہ خون وہ نہیں جو تم ماتم کے طور پر اپنے جسم سے خود بہاو بلکہ یہ وہ خون ہو جو ظلم وجبر آمریت واستحصال کی قوتوں کے سامنے ڈٹ جانے کی پاداش میں تمہارے جسم سے رسے۔ تم حق کی آواز بن کر جبروریا پر ٹوٹ پڑو۔

اقبال سنی تھاعلی شریعتی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر ان مسلکوں کی تفریق و امتیاز نے ان کے اندر پائی جانے والی اس آگ کی کمیت کیفیت میں کمی پیدا نہیں کی تھی۔دونوں درد مشترک کے حامل تھے۔ دونوں اسلام کی نشاہ ثانیہ چاہتے تھے۔ اور اسکی عظمت رفتہ کی باز یابی کے لئے کوشاں تھے۔ دونوں فرقہ بندی اور تفرقہ پردازی کے خلاف تھے۔ دونوں اسلام کو ایک بائنڈنگ فورس سمجھتے تھے۔ دونوں کا یہ خیال تھا کہ اصل حقیقت سے آگہی حاصل کرو۔ جو لوگ حقیت خفی و جلی سے آگاہ نہیں وہ ان کو خبردار کرتا ہے۔ اے گرفتار ابوبکرو علی ھوشیار باش۔

اقبال انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اپنی نظمیں سنا سناکر مسلمانوں کے دلوں کو برماتا۔ لوگ رو رو کر دیوانے ہو جاتے اور اپنی جیبوں اور تجوریوں کے منہ کھول دیتے۔ مسلمان قوم کو اپنی سیاسی جدوجہد کے اس مرحلے پر رقم کی ضرورت تھی اقبال کی یہ نظمیں جلتی پر تیل کا کام کرتی تھیں اور جذبہ جہاد اور آزادی دہ چند ہو جاتا تھا۔ علی شریعتی اس طرح حسینیہ ارشاد کے ادارے میں جا جاکر خطبے جاری کرتا تھا ہزاروں طلبہ' دانشور اور انقلابی وہاں آکر اسے سنتے' اسکی آواز' اسکے خطاب وہاں سے نکل کتابوں اور کیسٹوں کی صورت میں ہاتھوں ہاتھوں رضا کارانہ طور پر سارے ایران میں پھیل جاتے۔ یہ کام اتنی سرعت سے ہوتا کہ شاہ کی ساری خفیہ مشینری انگشت بدنداں رہ جاتی۔ دونوں مفکروں کے کلام نے قوم کے رگ وپے میں آگ لگا کر اسے انقلاب کے لئے تیار کر دیا۔

اقبال 1938ء میں فوت ہوا۔ اس وقت برصغیر کے مسلمان تصور پاکستان

کی عملی صورت دیکھنے کے متمنی ہو چکے تھے اس کی موت کے دوسال بعد 1940ء میں لاھور کے ہی مقام پر قرار دادا پاکستان پاس ہوئی اور سات سال کے عرصے میں اقبال کے دوست اور عظیم مسلم راہنما محمد علی جناح قائداعظم کی قیادت میں دنیا کی سب بڑی اسلامی مملکت منصہ شہود پر آ جاتی ہے۔ علی شریعتی 1977ء میں جام شہادت نوش کرتا ہے۔ 1978ء میں ٹھیک ایک سال بعد ایران کا اسلامی انقلاب آیتہ اللہ روح اللہ خومینی کی قیادت میں ڈھائی ہزار سالہ ملوکیت کے سر پر بجلی بن کر گرتا ہے۔ دونوں عظیم انسانوں کی مساعی ان کی زندگیوں کے بعد عملی روپ اختیار کرتی ہیں

اقبال اور علی شریعتی دونوں مشرق و مغرب کی کچھ دانشور ہستیوں سے متاثر تھے اور ان کی فکر سے انہوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اقبال چونکہ شاعر تھا اس لئے اس نے مولانا روم کو اپنا استاد مانا اور فکر رومی کو راہ نما بناکر تصوف، عشق، عقل روحانیات اور دوسرے مسائل دانش و حکمت کو سمجھانے اور ان کی توجیہہ کرنے کی سعی کی۔ مشرقی مفکرین میں اقبال عبدالکریم الجیلی، ابن عربی، شاہ ولی اللہ اور امام غزالی کے خیالات سے استفادہ کر چکا تھا۔ چونکہ اقبال کا فیلڈ سیاست سے بڑھ کر شعر و فلسفہ بھی تھا اور انہی موضوعات کے اندر سے اس نے انقلاب اسلامی کی راہ نکالی تھی اس لئے بڑے بڑے ادبا شعرا اور صوفیا ہی اس کے سامنے بطور ماڈل پیش ہوتے تھے۔

علی شریعتی کا فیلڈ سوشیالوجی تھا۔ ان کی زندگی مختصر تھی اور کام لمبا۔ اقبال کا زمانہ سائنسی و صنعتی ترقی کے لحاظ سے پسماندہ تھا۔ علی شریعتی کا دور وہ تھا جب انسان چاند پر قدم رکھ چکا تھا۔ راکٹ آسمانوں میں گردش کر رہے تھے۔ سرعت و عجلت بڑھ چکی تھی آگ اور گرمی بڑھ چکی تھی۔ اقبال کی شاعری پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان خاموش وقفے میں جوان ہوئی۔ علی شریعتی کو سرد جنگ کا بدترین زمانہ درپیش تھا۔ کوریا کی جنگ لڑی جا چکی تھی ویٹ نام کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ویٹ نام کے میدانوں میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت آمنے سامنے پنجہ آزما تھے۔ وارسا اور

ناٹو کی افواج لاکھوں ٹینکوں اور جہازوں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے صف آرا تھیں۔ الجزائر کی جنگ آزادی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ عرب اسرائیل جنگ ہو چکی تھی اور عرب شکست فاش کھانے کے بعد صاحب فراش ہو چکے تھے۔ افریقہ کے علاوہ لاطینی امریکہ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں عوامی انقلاب کے پھریرے لہلہا رہے تھے۔

ساٹھ اور ستر کی دہائیاں آتش بداماں اور شعلہ فشاں عرصے تھے۔ یہ فکری جہدوجہد سے بڑھ کر عملی کوششوں کا دور تھا۔ نو آبادتی نظام دم توڑ چکا تھا۔ مگر جاتے جاتے وہ نیو کولونیلزم کی صورت میں رنگ برنگے عفریت کاشت کر گیا تھا۔ تیسری دنیا کا تصور ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔ اس وقت براہ راست اور فوری فیصلے کی ضروت تھی۔ چنانچہ سارتر اس زمانے میں امریکی سپاہیوں کے جنگی جرائم کے خلاف عدالت لگائے بیٹھا نظر آتا ہے۔ علی شریعتی نے بھی اس مرحلے پر فی الفور فیصلہ کر کے میدان عمل میں کودنا تھا۔ علی شریعتی اس دور کے جن مفکروں سے متاثر ہوا ان میں سرفہرست فانان، سارتر اور اقبال تھے۔ اقبال نے نطشے اور برگسان کے خیالات سے استفادہ کیا کیونکہ نطشے مغربی استعمار کے بت کو اپنے ہی ہتھیاروں سے توڑنے کی نوید سناتا ہے۔

علی شریعتی اقبال کو اپنا استاد مان لیتا ہے۔ ایران میں اقبال کو بڑی دیر کے بعد پذیرائی حاصل ہوئی اگرچہ اسکا دوتہائی کلام فارسی میں ہے اور ظاہر ہے اس حوالے سے اسکے سب سے پہلے مخاطب ہی اہل ایرانی ٹھہرتے ہیں مگر ایران کے لسانی عصبیت اور عظمت کے پرستار کا ایسی سوچ رکھنے والے شعرا وادیب اقبال کے سبک ہندی کو اسکا مقام دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اقبال کو پنجاب کا ایک شاعر سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں بلکہ بقول سید علی خامنائی ایران کے لوگوں کو اقبال کی تصانیف کے نام تک معلوم نہ تھے۔ ظاہر ہے ان کے پاس اقبال کو پرکھنے کا پیمانہ ہی نہ تھا۔ وہ اسے صرف

زبان کے حوالے سے پرکھنا چاہتے اور جانتے تھے۔ اس کی سوچ کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ ان کے لئے یونانی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ ایران کے جدید مفکروں میں علی شریعتی وہ پہلے بڑے دانشور تھے۔ جس نے نہ صرف اقبال کو پڑھا' سمجھااور اسے اسکا مرتبہ و مقام دیا بلکہ اس کے خیالات کی ترویج و اشاعت کو اپنے مشن کا حصہ جانا۔ علی شرعتی نے اقبال کو وہ خراج تحسین پیش کیا جو شاید ہی کوئی مسلمان اور خاص طور پر مسلک شیعیت سے تعلق رکھنے والا فرد پیش کر سکتا ہو۔ وہ لکھتا ہے۔

> "میں جس وقت اقبال کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اس میں حضرت علی جیسی عظیم المرتبت شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ ایک ایسی شخصیت جو کیف و کم کے لحاظ سے بیسویں صدی کے انسان کی ضروریات و مقتضیات کو پورا کر سکتی ہو۔ علی وہ ہو سکتا ہے جو نہ صرف اپنے پندار و گفتار بلکہ کردار کے اعتبار سے بھی عصر حاضر تمام کو انسانی ضروریات اور احتیاجات فراہم کرنے کی استعداد سے بہرہ مند ہو۔ بے شک اقبال ایک مرد مسلمان کی کثیرالجہات روح کا درجہ رکھتا ہے۔"

اقبال و شریعتی ہم مزاج ہم خصال اور ہم خیال دانشور تھے۔ دونوں الگ الگ اوقات میں الگ الگ ملکوں میں الگ الگ حالات میں پیدا ہوئے مگر مشن دونوں کا ایک تھا۔ پیغام دونوں کا ایک تھا۔ دونوں اسلام سے سچا لگاؤ رکھتے تھے۔ دونوں روشن خیال' ترقی پسند اور غریب دوست تھے۔ دونوں اپنی اپنی مملکتوں میں فکری کامرانیوں سے ہم کنار ہوئے۔ دونوں نے کچلے مسلے انسانوں اپنی مستضعفین کا ساتھ دیا۔ دونوں نے غربت کی زندگی گزاری۔ دونوں شاہوں کے دربار سے دور رہے۔ دونوں کے ہتھیار ان کے قلم تھے۔ دونوں نے اپنے علم کو تجارت اور وسیلہ مال منال بنانے کی روش کو ترک

اقبال و علی شریعتی افکار و نظریات

اقبال و شریعتی کے فکر و خیال میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ اقبال کو ایران اور فارسی سے جو مناسبت اور تعلق خاطر تھا' وہ اظہر من الشمس ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ وہ کبھی ایران نہ جا سکا۔ ایران کے مذہبی پیشوا اور سابق صدر علی خامنائی اسکی یہ توجیہہ بیان کرتا ہے کہ اس کوتاہی میں اقبال کا قصور نہیں ہے۔ قصور ایران والوں کا ہے۔ انہوں نے اقبال جیسے بڑے ایران دوست کو کبھی اپنے ہاں مدعو ہی نہیں کیا۔ اقبال جس کے فارسی کلام کی دھوم سارے یورپ وایشیا میں مچی ہوئی تھی خود اہل ایران کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ اسکی اہمیت سے آگاہ ہی نہ تھے۔ اگر کچھ لوگ آگاہ تھے تو وہ اقبال جیسے انقلاب دوست کو ملوکیت کے چنگل میں گرفتار ایران میں مدعو کرنے کی جرآت نہیں رکھتے تھے۔

اقبال کے بارے میں مزید خوش اعتمادی کا اظہار کرتے ہوئے علی خامنائی اپنے ایک خطبے میں کہتے ہیں کہ اقبال کے ایران نہ آنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک غیر جمہوری اور آمر سوسائٹی میں آنا ہی نہ چاہتا ہو۔ اس کی ایران آمد کے لئے حالات ہی ساز گار نہ تھے۔ مگر اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اقبال خود ایک نوآبادیاتی دور میں غلامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس وقت چند ہی مسلمان ملک آزاد سمجھے جاتے تھے اور ایران ان میں سے ایک تھا۔ اقبال کی دوستی افغانستان کے بادشاہ نادر خان سے تھی اور وہ شاہ افغانستان کی دعوت پر افغانستان کا سرکاری دورہ بھی کر چکا تھا۔ ایران نہ جانے کی اصل وجہ یہی تھی کہ اقبال کو ایران والوں نے اس دور میں نہ سمجھا' نہ بڑا آدمی جانا اور نہ ہی اسے مدعو کیا ورنہ جو اقبال یہ نظریہ رکھتا ہو وہ کس طرح ایران سے غافل رہ سکتا ہے۔

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

دوسری طرف علی شریعتی کو اقبال سے جو وابستگی تھی اسکے اظہار سے اسکا کلام معمور ہے۔ وہ صاف طور پر کہتا ہے۔ کہ میں اقبال کے عہد میں رہ رہا ہوں

اقبال اور شریعتی دونوں کے نزدیک عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے تشخص و تفرد سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ نا آگہی بے حسی کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ جب کسی فرد کو اپنا وجود حقیر نظر آتا ہے تو وہ اپنے آپ اپنی تاریخ' روایات جغرافیے اپنے شخصیات اور ثقافت سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسکا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ عضو معطل ہو جاتا ہے۔ تقدیر کا بندہ اور بے عمل و بے سمت انسان ہو جاتا ہے۔ اسکی مثال کٹی پتنگ کی ہوتی ہے۔ جسکے ہاتھ میں آجائے اسی کے ساتھ اڑنے لگتا ہے۔ اسے اپنی حالت بدلنے کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ اسے یہ زندگی حقیر و بے معنی نظر آتی ہے۔ وہ بھاڑے کا ٹٹو بن کر زندگی گزارتا ہے۔ اس پر شاہی ملوکیت آمریت' نو آبادیاتی نظام' کفر و فسق و فجور جسکی حکمرانی ہو اسے بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ کیونکہ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی' کھوٹے کھرے کی پہچان نہیں ہوتی ہے سود و زیاں کے تصور سے وہ بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا دوسرا بڑا شاخسانہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پھر جدوجہد خلاقیت اور تخیل کی قوتوں سے بے بہرہ ہو جاتا ہے اور غیروں کی دریوزہ گری کو اپنا شعار مان لیتا ہے۔ دوسروں کی ہر چیز اچھی اور اپنی ہر چیز بری نظر آتی ہے۔ وہ مقلد بن جاتا ہے۔ اسکی اپنی سوچ اور ایج دم توڑ جاتی ہے۔ اقبال نے جس دور میں آنکھ کھولی اور علی شریعتی کو جو دور بعد میں ملا اسمیں مسلمان قوم بحیثیت مجموعی اور انفرادی اپنی خودی اور انا سے عاری ہو چکی تھی۔ ماضی پر مبنی فخر تو کرتی تھی مگر کوئی مثبت قدم اٹھانے کا یارانہ رکھتی تھی۔ اس پر ایک خوف سا طاری ہو چکا تھا۔ اقبال اور شریعتی

دونوں اسی ماحول میں پیدا ہوئے مگر دونوں نے اپنی سوچ اور ذھن کی خداداد استطاعت سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو اس مرعوبیت کے تصورات سے آزاد کر لیا تھا اور خود آگہی کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں حقیقت اپنے اصلی روپ میں نظر آجاتی ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر مسلمان قوم بلکہ کسی بھی انسانی گروہ کو گری پڑی حالت سے اٹھا کر بٹھانا اور اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا ضروری ہو۔ تواسکو خودی کی قوت سے متصف کر دیا جائے۔ انسان کے اندر ایک شعلہ جوالا ایک پاور ہاؤس موجود ہوتا ہے۔ انسان وہ شیر ہے جو اپنی قوت سے نا آگاہ ہے۔ اگر ایک مرتبہ وہ اپنی قوت سے واقف ہو جائے تو پھر کوئی طاقت اسکا راستہ نہیں روک سکتی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری اور فکر کا مرکزی نکتہ ہی اس فلسفہ خودی کو بنایا اور زندگی بھر اس مشن کی تکمیل کے لئے مصروف کار رہا۔ اسکا سارا کلام ہی اس نکتے کی تفسیر ہے۔

بندہ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہان دیگراں

مثل آئینہ مشو محو جمال دگراں
از دل دیدہ فروشوی خیال دگراں

آتش از نالہ مرغان حرم گیرو بسوز
کہ پریدن نتوان باپر و بال دگراں

اپنی ملت پر قیاس اہل مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

علی شریعتی کی فکر و دانش کا مرکزی نکتہ بھی بازگشت بہ خویش ہی تھا۔ اپنی طرف لوٹ جاؤ۔ اپنی جانب واپسی کا سفر اختیار کرکے ہم اپنے آپ کو پا سکتے ہیں اپنی طرف لوٹنے کا مطلب روایت پرستی ماضی پرستی' یا رجعت قہقہری نہیں بلکہ یہ انسان کی اپنی حشمت PRISTINE GLORY سے آگہی ہے۔ علی شریعتی کا کہنا تھا کہ ہم دوسروں سے مختلف ہیں ہم کورانہ تقلید نہیں کریں گے۔ ہم اپنا مختلف و ممتاز مذھب رکھتے ہیں' تاریخ و روایات رکھتے ہیں' زبان اور کلچر رکھتے ہیں۔ ہم تعداد میں کسی سے کم نہیں ہم زمین دریا پہاڑ اور افرادی قوت رکھتے ہیں۔ ھم ذہین ہیں' ھم جرآت مند ہیں۔ ھم میں کیا کمی ہے کہ کاسہ گدائی لے کر دوسروں کے دروازے پر بیٹھے رہیں۔ نہ صرف دولت و حکوت کے باب میں بلکہ علم و حکمت اور فراست وبصیرت بھی ھم دوسروں سے مانگتے نظر آتے ہیں۔اقبال نے اس بات کو ایک جگہ کہا ہے

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

علی شریعتی ایک جگہ لکھتا ہے۔

"ہم مسلمان تیسری دنیا اس معنوں میں میں کہ ہمارے افکار و نظریات پہلی اور دوسری دنیا سے مختلف وممتاز ہیں۔ ہم مشرق ہیں' ھم مسلم ہیں' ہم اپنا جداگانہ تشخص رکھتے ہیں' ہماری تاریخ جدا' ہمارے نظریات جدا' ہمارا نکتہ نظر جدا' ہم پیٹ کے پجاری نہ بلند و بالا عمارتوں لمبی سڑکوں چمکتی گاڑیوں کے رسیا۔ ہم رسول ہاشمی کی امت اور ان کے

پیروکار اور پرستار ہیں مساوات شکم ہمارا مسئلہ نہ بے لگام جمہوری
واقتصادی مادہ پرستی کا فروغ ہمارا درد سر۔ ہم چراغ مصطفوی کے جلانے
اور اسم محمد سے دہر میں اجالا پھیلانے والے لوگ ہیں ہمارا جہاں اور
ہے اوروں کا جہاں اور ہے۔"

اقبال اور شریعتی دونوں یہ سمجھتے تھے کہ صدیوں تک ملوکیت کے زیر اثر بے عمل اور بے مغز و روح حیوانی زندگی گزارنے کی وجہ سے مسلم عوام الناس کے ذھن جھاڑ جھنکار اور فرسودہ آسیبوں سے پٹ چکے ہیں۔ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہے کہ انسانی ذھن کو منفی سوچوں سے آزاد کروایا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام کا نکتہ آغاز بھی لا سے ہوتا ہے۔ اس سنگ میل کو عبور کئے بغیر اللہ کی منزل آتی ہی نہیں۔ فرزند آذر کی طرح سب سے پہلے ان بتوں کو توڑنا ضروری ہے۔ چنانچہ علی شریعتی اور اقبال دونوں نے اپنی تاباں و تابندہ سوچ کے ہتھوڑوں سے فرسودہ سوچوں کے کھوکھلے لات منات کو توڑنا پھوڑنا شروع کردیا۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی روشن خیال توجیہہ و تفسیر سے یہ ثابت کیا کہ ملوکیت، آمریت، سرمایہ داری، اجارہ داری، ملائیت کہانت، تقدیر پرستی، ماضی پرستی، رنگ، نسل اور خاندان پر فخر سب غیر اسلامی اور غیر انسانی جکڑ بندیاں ہیں جن میں گرفتار ہو کر انسان پا بہ گل ہو جاتا ہے۔ اسکی ترقی رک جاتی ہے۔ اس صورت حال سے فائدہ صرف چند مفاد پرست طبقوں کو پہنچتا ہے جو اقتدار و دولت پر قبضہ جما لیتے ہیں اور پھر انسان کو رعایا اور مزارع بناکر ان سے خدمت لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ انسان اپنے بنائے ہوئے ان زندانوں سے نکل آئے تو کھلا آسمان، کھلی ہوا اور فضا اسکا مقدر بن جاتی ہے۔ وہ ایک مرتبہ انکار تو کر کے دیکھے۔ ایک دفعہ کہہ کے تو دیکھے کہ ہاں میں نہیں مانتا سرمایہ داری جاگیرداری ملوکیت اور نسلی افتخار و انانیت کو۔ ایک اس قوت انکار سے ہی سارے مصنوعی محلات دھڑام سے نیچے آرہیں گے۔

یہ کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ جو لوگ خودی کی قوت سے متصف نہیں وہ انانیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور پہلی قید کو ختم کرنے کی جگہ انا پرستی کا ایک اور پنجرہ تعمیر کرکے مزید زنداں نصیب ہو جاتے ہیں جو فرزانے نعرمستانہ لگا کر میدان عمل میں کود پڑتے ہیں آگ ان کے لئے گلزار بن جاتی ہے۔ یہ معجزہ ہے خود آگہی کا۔ سر پہ کفن باندھنے والوں کو نہ کوئی ڈرا سکتا ہے نہ مار سکتا ہے۔ استحصال کی قوتیں بہت کمزور ہوتی ہیں مگر ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوت کا ایک طلسم تعمیر کر رکھا ہوتا ہے۔ قوت مند اکثریت کو یہ بڑے بڑے عفریت نظر آتے ہیں حالانکہ یہ کیڑے مکوڑے سے ہوتے ہیں۔ اقبال اور علی شریعتی لاکے ہتھوڑے سے مسلح کرکے اس کمزور اور ناتواں اکثریت کو بھوکے شیروں کی طرح ان استحصالی آمروں پر چھوڑنا چاہتے تھے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ عوام کی قوت کا شیر انسانیت کے قاتلوں کی منٹوں سیکنڈوں میں تکا بوٹی کرکے رکھ دے گا۔ اہل ایران نے بعد میں اس تصور کا عملی روپ پیش کرکے تاریخ عالم کو ایک کلاسیکی مثال پیش کی ہے۔

علی شریعتی اور اقبال کی اپروچ میں طریقہ کار کے متعلق کچھ فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ علی شریعتی کا ٹارگٹ زیادہ تر بھوکے ننگے، نہتے، نیم خواندہ، مفلس و نادار عوام الناس تھے۔ وہ فلسفیانہ موشگافیوں سے ہٹ کر ان کو عوامی سطح پہ مخاطب کرتا ہے اس کا تصور زیادہ عملی MUNDANE اور حقیقت کے قریب ہے۔ اور ان کی قوت کو ہی مجتمع کرنے والے populist تصور کے زیادہ قریب تھا۔

ان کی نگاہ میں عوامی جدوجہد ایک تاریخی تسلسل تھا۔ فرانس میں رہ کر اور فرانسیسی فکر و دانش سے متاثر ہو کر وہ انقلاب فرانس کے حالات و واقعات سے آگہی بھی رکھتا تھے اور ذہن کے کسی گوشے میں اسی ماڈل کی تصویر بھی سجائے ہوئے تھا۔

انقلاب فرانس عوام کی کھردری CRUDE قوت نے برپا کیا تھا۔ وحشیانہ

BRUTE فورس کا جواب کھردری قوت سے ہی دیا جاسکتا ہے۔ اس قوت کو ابھارنے کا کام بے شک روسو اور والٹیر جیسے دانشور ہی کرتے ہیں مگر برہنہ پا عوام کو ساتھ لئے بغیر کوئی دانشور ملوکیت کے چراغ گل نہیں کر سکتا تا آنکہ وہ پیغمبر نہ ہو۔ علی شریعتی انسان کا اسطرح کا اشرافیہ تصور نہیں رکھتا تھا جو افلاطون کے ذھن میں تھا۔ افلاطون انسانوں میں تفریق و تقسیم کرکے صرف سپر قسم کے فلسفیوں و دانشوروں کو سزاوار قیادت ٹھراتا ہے۔ علی شریعتی اس کے مقابلے میں عام انسانوں میں پیدا ہونے والے عام انسان کو سامنے لاتا ہے۔ اسکا انسان دوسروں سے صرف اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ سوچتا ہے۔ شعور سے بہرہ مند ہے۔ کسی سے مرعوب ہونے والا نہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس شعور کو عام کرنا چاھتا ہے۔ اس کو عام کرنے کے لئے دکھ اٹھاتا ہے اور موت سے نہیں ڈرتا۔

علی شریعتی کا انسان پولیٹکل سائنس کے مضمون کا شہری ہے۔ وہ اسی شہری کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے طاغوتی قوتوں کے ساتھ آمادہ پیکار کرتا ہے وہ کسی خیالی کبوتروں سے مخاطب نہیں۔ جن کو باز بنانے کے لئے وہ بلبل کی طرح ان کے سامنے نغمے الاپ رہا ہو۔ یہ لوگ زندہ تھے۔ بال بچے دار تھے۔ نوکر چاکر تھے۔ ان کو اپنے بال بچے عزیز تھے۔ نوکریاں عزیز تھیں۔ یہ شاہ اور اسکی فوجوں سے ڈرتے تھے۔ ظلم جبر اور آمریت کی چکی میں پسنے کے باوجود مصلحت کی چادر اوڑھ کر زندگی کے دن چپ چاپ گزارنا چاہتے تھے۔ علی شریعتی نے ان مزدوروں' کسانوں' کلرکوں' دکانداروں' بے روزگاروں' طالب علموں کے سامنے سے خوف کی چادر کو نوچ کر پھینکنا تھا۔ لانگ ٹرم پراجیکٹ کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے یہ شارٹ ٹرم کام بھی تھا۔ چند مہینوں یا زیادہ سے زیادہ چند سالوں میں اس نے انہی خوفزدہ انسانوں کو اٹھا کر بٹھانا اور اپنی طاقت وخودی سے آگاہ کرکے ایران میں برسراقتدار بادشاہ رضا شاہ پہلوی کا تختہ الٹنا تھا۔ اسے کسی مابعد الطبیعاتی بحثوں میں الجھ کر نا آفریدہ گلستانوں کے لئے بلبل نہیں تعمیر کرنے تھے۔ اس لئے اس کا انسان ماضی یا مستقبل کا نہیں حال کا بے حس' خوابیدہ اور اپنی قوت سے نا آگاہ سما ہوا انسان ہے۔

اس کے مقابلے میں اقبال جس قسم کے انسان کو سامنے لاتا ہے۔ وہ سپر ہیومن خصائص کا حامل ہے۔ وہ غفاری قہاری قدوسی جبروت کا مالک ہے۔ وہ ہمسایہ جبریل امین ہے۔ قاری نظر آتا ہے مگر حقیقت میں قرآن ہے۔ پلٹنا جھپٹنا اسکا شوق ہے۔ وہ شاہین صفت' فرشتہ شکار اور یزداں گیر ہے۔ وہ کسی ایک ملک کا باشندہ نہیں ہے۔ اسکا گھر بخارا ہے نہ صفاہاں۔ اسکا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔ وہ زمینوں آسمانوں کو کھینچ کر ایک جگہ اکٹھا کر سکتا ہے۔ اسکا ذھن اور مغز تلا ہوا ہوتا ہے۔ اقبال کا انسان نا قابل تسخیرو ناقابل شکست ہے۔ وہ وقت کا راکب ہے مرکب نہیں۔ جتنی صفات خدا میں ہو سکتی ہیں وہ بندے میں بھی پائی جاتی ہیں بلکہ اسکے نزدیک خداوند تعالیٰ تقدیر سے پہلے اس بندے کی رضا بھی ضرور معلوم کرنا چاھتا ہے۔ یہ مرد کامل کامیاب رہتا ہے۔ اقبال اس بندے کی آرزو کرتا ہے جو طائر گلشن نا آفریدہ ہے۔

اقبال نو آبادیاتی غلامی میں جکڑے ہوئے ہندوستانی انسان اور مسلمان کو اٹھا کر بٹھانے کے لئے اسکے سامنے جو آئیڈیل رکھتا ہے۔ وہ بہت شاندار اور قابل رشک ضرور ہے مگر وہ نا قابل حصول بھی نظر آتا ہے۔ یہ دل میں آگ تو بھر دیتا ہے اور آتش زیرپا بھی کرتا ہے۔ مگر باٹم لائن یہ ہے کہ انسان اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیتا ہے۔ اقبال کا یہ انسان پولٹیکل سائنس اور سوشیالوجی کا ووٹر شہری اور کسی ملک کا باشندہ نہیں بلکہ فلسفے مابعد اطبیعات کی ارفع سطح MACRO کا نابغہ مجاھد ہے۔ جو ایک کو لوسل کی طرح دھرتی پر سٹرائیڈ کرتا ہے۔ وہ کبوتروں کے بیچ میں باز ہے اور یہ باز سارے کبوتروں کو باز بنانے کا عزم بھی لئے ہوئے ہے۔

اس کے برعکس علی شریعتی کا انسان اسی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایرانی مسلمانوں سے مخاطب ہے۔ سودا سلف لاتے دکاندار' سائیکلوں پر سوار طالب علم' سوٹ پہنے مرد' سکرٹ پہنے خواتین اور نوکری تلاش میں سرگرداں بے زورگار ایرانی باشندے اس کے مخاطب ہیں۔ وہ ان عوام الناس کو کسی ایک نکتے پہ

اکٹھا کرنا چاہتا ہے۔ ان کی غلط فہمیاں دور کرنا چاہتا ہے۔ ان کو اپنی قوت سے آگاہ کرتا ہے۔ ان شہریوں کے نام پتے موجود ہیں۔ سی آئی ڈی اور ساوک والے ان کے گھروں کے آس پاس ہی پہرہ بھی دیتے ہیں۔ یہی انسان ہیں جو ملوکیت و آمریت کو ختم کرکے رہتے ہیں۔

علی شریعتی کے سامنے وہ انسان بھی موجود تھے جو ویٹ نام اور الجزائر کی عوامی و مسلح جدوجہد میں سروں پر کفن باندھے اور ہاتھوں میں بندوق اٹھائے استعمار کی قوتوں سے پنجہ آزما تھے۔ اقبال کا انسان کرشماتی انقلاب برپا کرنے والا مرد کامل والا ہے۔ اقبال کا تصور انسان فلسفیانہ' روحانی اور اشرافیاتی elitist تھا۔ اسکا پروگرام لانگ ٹرم اور لانگ رینج تھا۔ علی شریعتی کا لائحہ عمل اورفوری ہدف با الکل سامنے تھا۔ اقبال کا انسان پوری کائنات کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ ستاروں پہ کمند ڈالتا ہے۔ علی شریعتی کا انسان اسی زمین سے متعلق ہے اور اس نے شاہ ایران کے محل پر کمند ڈال کر اسکے برج نیچے گرانے ہیں۔

علی شریعتی موجود و معلوم انسانوں کو ہی چار خصوصیات یعنی آگہی' ارادے' آرزو اور تخلیق سے متصف کرکے اچھے انسانوں کی ایک فوج بنانا چاہتا ہے۔ تاکہ استحصال کرنے والی مضبوط اقلیت پر پل پڑیں اور اسکو مٹاکر دم لیں۔ تائیدایزدی کے بغیر اقبال کا انسان بننا ممکن نہیں جبکہ علی شریعتی کا انسان بنا بنایا موجود ہے مگر تھوڑ سا بزدل اور بے وفا ہے۔ علی شریعتی اسی تھوڑی سی بزدلی اور بے وفائی کو مٹا کے اسے شاہ کی فوجوں کی سامنے کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اسے اقبال کی طرح اس کے سامنے بلبل بن کر نغمہ سرا ہونا ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ تھوڑا سا باز بھی بننا پڑتا ہے۔

علی شریعتی خود بھی شاہین بن گیا تھا۔ ایسا شاہین جو نڈر اور جرات مند تو ہوتا ہے مگر شکار کرنے کی جگہ اپنے وجود کا شکار تھالی میں رکھ استحصالی قوتوں کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ چیلنج کرتا ہے کہ آؤ مار سکتے ہو تو مجھے مارو۔ میں مرکر بھی تمہیں

مہنگا پڑوں گا۔ استحصالی آمرپلیٹ میں پڑے اس بے دست وپا شکار کو ہاتھ لگانے سے بھی لرزاں ہوتے ہیں۔ علی شریعتی اپنے وجود کو مثال بناکر گرے پڑے کچلے مسلے انسانوں کو یہی دکھانا چاہتا تھا۔ ایک دیہاتی استاد کا استاد بیٹا' بے زمین بے جائداد غریب وفادار دانشور جب نئی سوچ کا سورج ہتھیلی پہ رکھ کر آتا ہے تو وہ قوت متدین جاتا ہے۔ انقلاب برپا کرنے کے لئے کسی معجزے کی نہیں بس یکجا ہونے کی ضرورت ہے۔ یک سمت ہونے کی حاجت ہے۔ بس ایک قیادت کا سامنے ہونا ضروری ہے۔

علی شریعتی نے سمت مہیا کی' قیادت کی طرف اشارہ کیا اور یکجا ہونے کا احساس دلایا باقی کام آسان تھا۔ اقبال نے ایک جگہ کہا تھا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

علی شریعتی نے اس شعر کے پہلے مصرے کا اتباع کرتے ہوئے شہادت طلب کی اور اسکے نتیجے میں کشور کشائی بھی اس کی فتح مند قوم کو میسر آگئی اور مال غنیمت بھی آگیا۔ یہ مال غنیمت ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کی کھوپڑیوں کے مینارے تھے جسے ایرانی قوم نے پائے استحقار سے کرا دیا۔ اقبال نطشے کا دوست ہے تو علی شریعتی سارتر اور فانان کا۔ علی شریعتی مقصد سے وابستگی کو عشق وجنوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال کا عشق مرد مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ وہ اپنے انسان کو جتنی صفات کا حامل قرار دیتا ہے۔ ان سب کا منبع و ماخذ عشق ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک جادوئی طاقت ہے جسکے حاصل ہوتے ہی مولہ شہباز بن جاتا ہے۔ عام سی چیونٹی ہدہد ش سلیمان بن جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق بھی خودی کی طرح ایسی چیز ہے جسے سعی پیہم سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اسکا راستہ عقل کی گلیوں میں سے ہوکر نہیں جاتا بلکہ وہ گلیوں والی عقل کو مسترد کرتا ہے۔ عقل کا کام عشق کی انگلی پکڑ کر اسے میدان جنگ میں اتارنا ہے۔ آگے جنگ لڑنا عشق کا کام ہے۔ عقل کا یہ میدان ہی نہیں۔

علی شریعتی کے ہاں عشق سیدھا سادا غیر فلسفیانہ اور نفسیاتی مفہوم رکھتا ہے۔ جسے نفسیات کی اصطلاح میں اپنے مقصد سے حد جنوں تک بڑھی ہوئی وابستگی OBSESSION اور انقلاب کی سیاسی ٹیکنالوجی میں کومٹ منٹ کہا جاتا ہے۔ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے باقی سارے مقاصد کو پس پشت ڈال کر اس ایک سیدھ میں بڑھنا اور اس راہ میں اپنے آپ کو خرچ کر دینا ہی عشق ہے۔ علی شریعتی عشق کے لئے صحیح علم کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اگر علم نہ ہو تو عشق بے کار ہو جاتا ہے۔ اور انسان ایسی دیوار کو گرانے میں لگ جاتا ہے۔ جو اسکے راستے میں ہے ہی نہیں۔ علی شریعتی کے ہاں علم اور عشق ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ادب و شعر اور علم و حکمت کے بارے میں بھی اقبال اور علی شریعتی دونوں کے نظریات میں کافی توافق پایا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خون جگر کے بغیر سچے شعر و ادب کا ظہور نا ممکن ہے۔ یہ دل پر خون کی گلابی سے عمر بھر شرابی رہنے کا فن ہے۔ اس کے نزدیک یہ لفظوں کا کھیل نہیں دل کا معاملہ اور سرکا سودا ہے۔ اقبال اس فن شریف کو عطیہ ربانی قرار دیتا ہے اور اس حوالے سے اسے کسی مقصد ارفع سے وابستہ سمجھتا ہے۔ عطیہ آسمانی کو سفلہ جذبات کے اظہار اور ذاتی خواہشات کی تکمیل و تسکین کے لئے استعمال کرنا کفران نعمت ہے۔ شاعر دیدہ بینائے قوم ہوتا ہے۔ اس پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ علم و حکمت کا حصول اور شعر و ادب کے ذریعے اسکا اظہار خاص سمت میں قوم و ملت کی راہنمائی کے لئے کرتا ہے۔ غیر شاعر اور غیر عالم کی زندگی اس کے اپنے لئے ہو سکتی ہے مگر صاحب علم و دانش اور صاحب قلم و کتاب کی زندگی دوسروں کے لئے وقف ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنے قول و عمل کے ذریعے ان نظریات کی تائید کی اور زندگی بھر اپنے قلم و علم کو اعلیٰ مقاصد کے لئے کام میں لاتے رہے۔ یہی حال علی شریعتی کا بھی تھا۔ اس نے قلم و علم کو مشن کے طور پر استعمال کیا۔ وہ ان اہل علم و قلم پر طنز کرتا ہے۔ جو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر صرف علمی بحثیں کرنے یا صرف دانشوروں کو اپنے علم و فضل سے متاثر کرنے کو ہی حاصل

علم جانتے ہیں اگر ایسی ہی بات ہے۔ تو پھر علم کا کتابوں میں رہنا ہی بہتر ہے۔

علم کے ساتھ عمل کا لازمی تعلق ہے۔ اور علم کا عمل اعلیٰ خیالات کی ترویج و اشاعت کے ساتھ اپنے نظریات کی حمایت میں مخالف قوتوں کے سامنے ڈٹ بھی جانا ہے۔ شریعتی کے نزدیک انقلاب برپا کرنے اور قومی شعور کی اصلاح کی ذمہ داری شعراء ادباء اور دانشوروں پر عائد ہوتی ہے۔ خاص طور پر روشن فکر اہل قلم پر۔ اس نے ان امور پر کافی غور و فکر کیا تھا۔ اسکا کہنا ہے جن علمائے مذہب نے علم دین کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیا ان سے تو یہ توقع ہی نہیں کرنی چاہئے کہ وہ کبھی انقلاب کی بات کرکے اپنے رزق پر لات ماریں گے لیکن دوسرے اہل علم جو محض کتابیں پڑھ اور ڈگریاں لے کر زندگی کے مختلف شعبوں میں نوکریاں کرنے میں مصروف کر مطمئن زندگی گزار رہے ہیں ان سے بھی گلہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ انہوں نے علم کی اس حیثیت کو سمجھا ہی نہیں۔ وہ یہ علم حاصل نہ کرتے تو کوئی اور پیشہ سیکھ لیتے۔

ان کے نزدیک علم محض کالے چٹے لفظوں حرفوں جملوں کا مجموعہ ہے۔ اسکی کوئی روح ہے نہ حرکت و حرارت۔ یہ مطمئن لوگ دراصل مردہ DEAD WOOD ہیں۔ یہ خود شعور سے بے بہرہ ہیں تو قوم کو کیا شعور دیں گے ان نام نہاد پڑھے لکھے لوگوں کا خیال ہے کہ انقلاب برپا کرنا اہل قلم کا نہیں اہل سیاست و حکومت کا کام ہے۔ اہل علم کا کام علم کا رٹا لگانا اور پھر آگے اس کو اسی طرح گھوٹ کر اپنے شاگردوں کو پلا دینا ہے۔ جسطرح ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ کو نہیں پتہ ہوتا کہ اسے کس مقصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یا اس پر کہے لفظوں کو چڑھایا اتارا جا رہا ہے۔ اسطرح شعور سے عاری ان خواندہ افراد کا حال ہوتا ہے۔ یہ روٹی پیدا کرنے والے روبوٹ ہیں۔ دانا میں نہ بینا۔ یہ لوگ علم کے مقاصد ارفع کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں۔ ارباب حکومت کی نظروں میں سرخرو ہو کر یہ بزدل اور خوشامدی طبقہ قلم و علم کو مشن سمجھنے والے افراد کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ اور حکمرانوں کو باور کراتا ہے کہ جناب عالی قلم و علم کا مقصد صرف کتابیں پڑھنا پڑھانا اور لکھنا

ہے۔ باقی رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔ ہم غلام ہمارا قلم و علم غلام۔ ہم سے جو چاہیں لکھوا پڑھوا لیں۔ ہم نے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنا ہے۔ علم و قلم کے اعلیٰ مقاصد دریافت کرنے والے چند لوگ سر پھرے اور از کار رفتہ ہیں۔ حکمران طبقے ان مجہول، مطمئن اور جامد علما کی گواہی پر سرفروش قلم کاروں کے سر قلم کرنے کا یارا پا لیتے ہیں۔

قوم و ملت کے لئے سوچی جانے والی بات کو سیاست سمجھ اور بنا کر عمل اور تبلیغ کا راستہ بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسے سیاست کوئی گناہ ہو جرم ہو۔ اگر ایک دانشور، سکالر، استاد، صحافی، مصنف، قلم کار اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اپنے قلم و علم کو استعمال میں لاکر تبدیلی و تغیر کی بات کرتا ہے قوم پر چھائی گھٹاؤں کی نشاندھی کرتا ہے ظلم کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرتا ہے اور استحصال کرنے والوں کی راستے کی دیوار بنتا ہے تو اسے ڈرایا دھمکایا اور خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ علی شریعتی کے نزدیک یہ سوڈو دانشور طبقہ انقلاب کا سب سے بڑا دشمن ہے اور برادر کش ہونے کے ساتھ قوم کے اجتماعی مفاد اور ضمیر کا غدار بھی ہے۔ اسکی غفلت خاموشی اور منقار زیر پر رہنا استحصالی طبقوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرنا ہے۔

علی شریعتی عوام الناس کو زیادہ مورد الزام نہیں ٹھہراتا۔ اسکا کہنا ہے کہ عوام الناس کی راہنمائی ہم لوگوں نے کرنی ہے۔ اگر ہم ان کے سامنے غلط مثالیں پیش کریں گے تو عوام الناس بے چارے تو مفت میں مارے جائیں گے۔ وہ بے پناہ قوت رکھنے کے باوجود راہنمائی کے طلبگار ہوتے ہیں حکومت انہیں بے چون وچرا اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ سوڈو علما و فضلا ان کو انجام سے ڈرا کر مطیع دیاج گزار بنتے ہیں۔ یہ ان کو اس دنیا سے بے زار کرتے ہیں اور اسی دنیا کی ساری امنگوں اور لذتوں کو استحصالی و مستبد طبقے کے گھروں میں پہنچانے اور اسمیں سے اپنا حصہ بقدر جثہ لینے کے بعد عوام الناس کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ان کے لئے ان نعمتوں کو آخرت تک ملتوی کرنے کی نوید سناتے ہیں۔

علی شریعتی نے ان تمام نظریات پر براہ راست حملہ کیا اور جھنجھوڑ کر اہل علم و قلم کی غیرت کو جگانے کی کوشش کی۔ وہ ان لوگوں کو قوم و ملت کا شعور قرار دیتا ہے۔ اگر

شعور غلط راہ پر ہو یا خوابیدہ حالت میں ہو تو بہتری کی توقع فضول ہے۔ یہاں ایک بہت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ادب و سخن کے میدانوں یہ بحث عام ہے۔ یعنی کیا شاعرو ادیب حقائق کو براہ راست پیش کریں اور جدوجہد حیات میں بلاواسطہ طور پر شریک ہو کر اپنے آپ کو دلؤ پہ لگائیں یا چپ چاپ بے ضرر طریقے پر اپنی غزلیں نظمیں افسانے ڈرامے ناول انشائیے لکھتے رہیں؟ ان اصناف سخن میں بالواسطہ طور پر اور ادبی رنگ میں مسائل حیات کا ذکر آتا رہے۔ سب کا خام مال یہی زندگی اور دنیا ہے۔ ہمارا کام براہ راست جدوجہد حیات میں حصہ لینا نہیں ہے۔ ہمارا کام بالواسطہ ہے کیونکہ بلاواسطہ اظہار حق و صداقت سے شعری حسن و جمال مجروح ہوتا ہے۔ بلکہ شعر شعر نہیں رہتا نصیحت اور لیکچر بن جاتا ہے۔ جب شعر خطبہ بن جائے تو اسکی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔

بدیہی طور پر ان باتوں میں بڑا وزن نظر آتا ہے۔ واقعی شعر کو شعر اور فن کو فن ہی رہنا چاہئے مگر کیا شعر صرف شعر کے لئے اور فن صرف فن کے لئے ہونا چاہئے شاعرو ادیب کی کوئی سوشل ریسپانسیبلٹی نہیں ہے۔ ادب برائے ادب کے حامی افراد کا کہنا ہے کہ شعر کو شعر ہی رہنے دینا چاہئے پہلے شعر اسکے بعد اگر مقصد اسمیں آسکتا ہے تو آجائے ورنہ جو کچھ قافیہ ردیف اور اوزان بحور اور صنائع بدائع کی گرفت و قید میں آئے وہی شعرو سخن ہو گا اگر اسکی قید سے نکلا تو پھر مضمون و مقصد کتنا ہی ارفع کیوں نہ ہو شعرو سخن کے درجے سے گر جائے گا۔ ان کے نزدیک مقصد کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اسکے اظہار کی ہے۔ علی شریعتی کا خیال اسکے برعکس ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ شعرو سخن کا ظاہری جمال کتنا ہی قابل رشک کیوں نہ ہو اگر اسمیں باطنی حسن نہیں ہے اسمیں فکر و خیال کی رفعت و پاکیزگی نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر اسمیں حرکت و حرارت نہیں ہے تو وہ بے مغز و معنی ہے۔ محض الفاظ کے طوطے مینا ہے۔ ڈکشنری سازی ہے۔ علی شریعتی اس باب میں قرآن کی مثال پیش کرتا ہے۔ آج دنیا مانتی ہے۔ کہ اس سے فصیح کتاب روئے زمین پر موجود نہیں۔ دنیا یہ بھی مانتی ہے کہ اسکا پیغام بھی رفیع الشان ہے اور اسکا اسلوب اظہار بھی نا قابل تقلید ہے

قرآن کے اسلوب کی قابل رشک خوبصورتیوں کو ہی دیکھ کر کچھ مخالفین اسلام پکار اٹھے تھے کہ یہ شاعری ہے۔ اور نبی پاک نعوذ باللہ محض شاعر ہیں۔ وہ ان معنوں میں یقیناً" شاعر ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو جب اپنی زبان میں بھی لوگوں کے سامنے پیش کیا تو وہ انکے جمال سخن سے مسحور ہو گئے اور قرآن تو ہے ہی کلام ربانی۔ اسکی تاثیر و جمال سے تو اسلام قرآن اور خدا کو نہ ماننے والے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ شعرو سخن دل کی بات خوبصورت اسلوب میں ہی تو دوسروں تک پہنچانے کا نام ہے۔ شعرو سخن دل کی آواز اور ضمیر کی صدا کو موثر ترین الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کا نام ہے۔

خوش تر آں باشد کہ سرد لبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

حدیث دیگراں اسلوب کا نام ہے مگر سردلبراں لازمی چیز ہے۔ غالب نے کہا ہے

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

بادہ و ساغر کا ذکر بیچ میں ضرور آجائے مگر مشاھدہ حق کی گفتگو تو بھتو بود نہ ہو ہمارے شعرا و ادباء کیا کرتے ہیں سردلبران اور مشاھدہ حق کی گفتگو کا باب بند کر کے لفظوں کے نیلام گھر سجا دیتے ہیں۔ علی شریعتی مولانا روم کی مثال دیتا ہے۔ مولانا نے کائنات کے اسرار و رموز اور قرآن کی فکر عالیہ کو شعروں کے قالب میں ڈھال کر پیام اسلام کو ہر قلب میں پہنچا دیا

مثنوئ مولوئ معنوی
هست قرآن در زباں پہلوی

علی شریعتی نے جب کلام اقبال کا مطالعہ کیا تو بے اختیار پکار اٹھا ہاں بے شک شاعری اسی چیز کا نام ہے۔ علی شریعتی ایک جگہ لکھتا ہے۔

"اقبال جمال الدین افغانی کو ابکی محمدؒ عبدہ کی طرح وہ عظیم

انسان تھا۔ جس نے بیسویں صدی کے مشرق کو ہلا کر رکھ دیا انہوں نے
اسلام کے انقلابی پیغام کو اپنے کلام معجز بیان کے ذریعے نہ صرف
مسلمانوں تک بلکہ پوری عالم انسانیت تک پہنچا کر ایک بہت بڑا کارنامہ
سرانجام دیا۔"

علی شریعتی کہتا ہے کہ اقبال کے کلام کو صرف اس لئے شاعری کے زمرے سے خارج نہیں کیا جانا چاہیئے کہ اسکا ہر شعر اور ہر صدا مقصدیت کی گہری چھاپ اور لہر لئے ہوئے ہے۔ کیا اسلام قرآن اور انقلاب سے وابستہ ہونے کے بعد اقبال کے شعری و فنی مرتبے پر کوئی حرف آیا؟ کیا وہ محض گل و بلبل کی باتیں کرتا یا رومان و افسانے کی باتیں ہی لکھتا تو بڑا شاعر یا اس سے بڑا فنکار بن سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکی بڑائی اسکی فکر کی بڑائی میں ہے۔ ورنہ الفاظ کے طوطے مینا اڑانے والے دوسرے شاعر اقبال سے بڑھ کر زبان کے ماہر اور صنائع بدائع کے فنکار تھے۔ زبان و بیان ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ اقبال قوم اور مقصد کے سامنے غلام بن کر کھڑا ہوا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ اس کے سامنے غلام بن کر کھڑا ہو گیا۔

اقبال اور شریعتی دونوں دور جدید کی مغربی فکر سے آگہی بھی رکھتے تھے اس سے متاثر بھی تھے اور اس پر تنقید بھی کرتے تھے اقبال نے کارل مارکس کا مطالعہ کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مارکس کی نیت تو ٹھیک تھی مگر اسکا علاج درست نہیں تھا نیست پیغمبرو لیکن در بغل دارد کتاب۔ وہ پیغمبر تو نہیں ہے مگر حق نا شناس ہے اور اس کی فکری اساس مکمل طور پر مساوات شکم کے تصور پر قائم ہے۔ اقتصادیات گو اہم عنصر ہے مگر یہ انسانی زندگی کی صرف ایک جہت DIMENSION ہے۔ اسے کل سمجھنا حیات اور تاریخ کی باقی جہتوں کی نفی کرنا ہے۔ اس لئے اقبال نے فیصلہ صادر کیا کہ فطرت کے گریبان کی رفوگری اشتراکی فلسفہ کے بس کی بات نہیں۔ علی شریعتی نے بھی اپنی تحریروں میں مارکسزم کے اسی عجز کی نشاندہی کی ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انسان کی زندگی ماورا الحیات

جہتوں کی بھی آئینہ دار ہے اور اشتراکیوں اور وجود پرستوں کی طرف سے انسانی زندگی کی اس مابعد الطبیعاتی جہت سے انکار انسان کے ادھورے پن کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔

مابعد الطبیعاتی وجود کے بغیر انسان مکمل ہی نہیں ہوتا۔ اسے محض گوشت پوست کا پتلا' جسمانی خواہشات کا غلام ماننا مرتبہ آدم کو حقیر بنانا ہے۔ اسے انسانی درجے سے اتار کر حیوان بنانا ہے۔ با ایں ہمہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شریعتی کی تحریروں میں مارکسزم کے فلسفے کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اگر وہ مذہبی اثرات سے آزاد ہوتا تو شاید کٹر کمیونسٹ ہوتا۔ ژاں پال سارتر کے تصور وجودیت کے تحت انسان کو پانچ عناصر کا زندانی قرار دیا گیا ہے۔ یہ پانچ عناصر جنہیں وہ حقیقت دواہ، Facticity کا نام دیتا ہے۔ کچھ اس طرح ہیں

1 جائے پیدائش (مقامیت)
2 انسان کا ماضی (تاریخی تسلسل)
3 گردوپیش کے معروضی حالات (ماحول)
4 دوست رشتہ دار ساتھی (سماجی سپورٹ)
5 تصور موت و حیات (بنیادی تصورات)

اقبال نے ان عناصر کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو ان سے آزاد ہونے کی تلقین کی ہے۔ اقبال کا مرد مومن تاریخ جغرافیے ماحول موروثیت اور مقامیت کے سارے بندھنوں کو توڑ کر آفاقی قدروں کا حامل ہو جاتا ہے۔ گھر اسکا بخارا رہتا ہے نہ صفاہاں۔ کشتی اسکی راوی دنیل و فرات سے نکل بحر بیکراں کی ہم نصیب بن جاتی ہے۔ اقبال اپنے مرد کامل کی تشکیل کے لئے سارتر کے پانچ عناصر Facticity کے مقابلے میں عناصر اربعہ کا ایک اور کمپوزیشن پیش کرتا ہے۔ اس کا انسان آفاقی ہے۔

غفاری و قہاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبریل امیں بندہ خاکی

ہے اسکا نشیمن نہ بخارا نہ صفاہاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

علی شریعتی نے بھی اپنی تصنیف چہار زندان میں حقیقت دوامی کے وجودی تصور کا تجزیہ کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ انسان اگر اکملیت کی راہ پر روانہ ہو اور آفاقی افکار و نظریات اور اقدار سے متصف و بہرہ مند ہو تو وہ ان چاروں پانچوں دیواروں کو توڑ کر عالمگیر بن سکتا ہے۔ اقبال کی طرح شریعتی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو انسان کامل کی اعلیٰ ترین مثال سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور والدین' تعلیم' رسوم و رواج' ماحول' مقامی فکر اور تاریخی تسلسل کے ان اثرات سے نکل کر ہی آفاق گیر فکر و عمل کے امین و پرچارک بنے۔ ان کی ذات کو ہی مثال بنا کر انسان مصنوعی دیواروں کو گرا کر وسعتوں سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔

علی شریعتی کا کہنا ہے کہ انسان کے لئے اسکا پہلا زنداں اسکی تاریخ اور جغرافیہ ہے۔ اس سے نجات وہ سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرا زندان موروثی سوچوں اور تاریخی قوتوں کے تسلسل کو قرار دیا گیا ہے۔ علی شریعتی کے نزدیک اس زندان کا توڑ ان سوچوں کو چیلنج کرنے میں ہے۔ تجزیہ و تنقید اسکا علاج ہیں۔ تیسرا قید خانہ طبقاتی فکر اور وجودیت کا ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انسان کو طبقاتی جدوجہد میں عملی طور پر شریک ہونا ہے اور محروم و مظلوم طبقوں کا ساتھ دے کر جابر طبقوں کو کمزور بنانا ہے۔ چوتھا قلعہ جس میں انسان مقید ہے وہ اس کی اپنی ذات کا ہے۔ انا پرستی انسان کو اپنا پرستار بنا کر انسانیت کا دشمن بنا دیتی ہے۔ اپنے نفس کی تہذیب کے ذریعے انسان اپنے رب تک جا پہنچتا ہے۔ ذات کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے ساتھ ہی زندگی' کائنات اور انسانوں سے انسان کے سارے رشتے ناطے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حیات و موت کی زندانی کیفیت سے گزرنا بھی

اقبال اور شریعتی کے انسان کے لئے مشکل نہیں کیونکہ یہ دونوں زندگی کو محض سانسوں کا تسلسل یا پیمانہ امروز و فردا نہیں گردانتے تھے۔ ان کے لئے زندگی ایک مشن کا نام تھا اور جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

دم زندگی، رم زندگی، نم زندگی، غم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

اقبال نے اپنی زندگی اور علی شریعتی نے اپنی موت کے ذریعے اس تصور کو ثابت کیا کہ انسان اگر چاہے تو اپنے فکر و خیال کی قوت سے ان سب زندانوں کو توڑ کر آگے نکل سکتا ہے۔ اقبال اور شریعتی مشرقی و مغربی علوم سے سیراب ہونے اور دونوں معاشروں کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے ان کی خامیوں خوبیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ دونوں غیر متعصب تھے۔ مشرق کی ہر چیز کو صرف اس لئے اچھا کہنے یا اس کا دفاع کرنے پر مصر نہ تھے کہ یہ چیز مشرقی ہے۔ اس قسم کی عصبیت سے وہ آزاد تھے۔ مشرق کی روح، روحانیت، مذہب اور دانش کے البتہ وہ قدردان بھی تھے اور ان کی مثبت قدروں کو وہ مغرب کی ظاہر پرستی پر فوقیت بھی دیتے تھے۔ وہ مغرب کو اس کے اندر رہ کر دیکھ چکے تھے اور اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ نہ ہی مغرب کی اندھی تقلید اور نہ ہی مشرق کی جاہلانہ پرستش ہماری منزل بن سکتی ہے۔ ہمیں تو صداقت کو ڈھونڈنا ہے۔

صداقت کا کوئی جغرافیہ اور وطن نہیں ہوتا۔ یہ جہاں اور جس سے ملے اسے لے لینا ہے۔ کیونکہ یہ مومن کی میراث ہے۔ علم نیکی اور سچائی کی کوئی زبان اور لباس نہیں ہوتا اسے مشرق و مغرب کے خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ انسان جہاں اور جب اور جتنا بھی حاصل کرے اپنی اور انسان کی اجتماعی بہتری کے لئے حاصل کرے البتہ انسان کی خودی اور خوداری ضرور قائم رہے۔ وہ کسی کا دریوزہ گر نہ بنے بلکہ اپنی شناخت اور اندر کی طمانیت کو قائم رکھے۔ علم، نیکی اور سچائی کو نہ صرف ہر جگہ سے حاصل کیا جائے بلکہ اسے ہر جگہ بانٹا جائے اقبال کہتا ہے۔

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

عصر حاضر کے طلسم میں گرفتاری سے بچو اور جو کچھ حکمت و دانش کی صورت میں ملتا ہے۔ اسے لے لو باقی کو ترک کردو

طلسم عصر حاضرا شکسم
ربودم دانہ و دامش گسسم

دونوں اس نظریے کے حامی تھے کہ زمانے کی زد میں بہنے کی جگہ اسکا مقابلہ کرنا چاہئے جو چیز فطرت مذہب اور خودی و خوداری کے برعکس ہو اسکو اپنانے سے گریز کرنا چاہئے بلکہ ایسے رویوں کی مزاحمت کرنی چاہئے۔ ان دونوں ہم مزاج و ہم خیال دانشوروں کی تحریروں کا مطالعہ بغور کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مزاحمت کا درس دیتے تھے اقبال کہتا ہے

اگر بتو زمانہ نسازد تو بہ زمانہ ستیز

اسی فکر کا پرتو شریعتی کے کلام میں جگہ جگہ جھلکتا ہے۔ ان دونوں کی تحریروں کو اعلی ترین مزاحمتی لٹریچر کے زمرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان کا کلام مزاحمتی نہیں تھا۔ محض رد عمل نہیں تھا۔ ان کی علمی ادبی اور تخلیقی اہمیت حیثیت

مسلمہ ہے۔ مزاحمتی تحریریں اکثر خاص تناظر سے ہٹ کر اپنی افادیت کھو دیتی ہیں مگر اقبال و علی شریعتی کی مزاحمت صرف نو آبادیاتی نظام یا ایرانی ملوکیت کے خلاف نہ تھی کیونکہ یہ تو ختم ہو جانے والی چیزیں تھیں ختم ہو گئیں۔ ان کے ختم ہوتے ہی ان کے کلام کی Relevance افادیت بھی دم توڑ جاتی مگر ایسا نہیں ہے۔ دونوں اس ابدی خیر کے پرچارک تھے جو ازل سے شر کی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ یہ شر کبھی برطانوی سامراج کی صورت میں سامنے آتا ہے تو کبھی شہنشاہ آریہ مہر کا روپ دھارتا ہے۔ یہ جس رنگ میں بھی آئے اس کے سامنے کوئی اقبال کوئی علی شریعتی موجود ہو گا یہی وجہ ہے کہ اقبال اور شریعتی کے کلام کی افادیت کم ہونے کی جگہ بڑھتی رہے گی

اقبال اور شریعتی دونوں بنیادی طور پر عالمگیر انسانیت "HUMANISM" کے گرویدہ تھے اور انٹرنیشلسٹ سوچ کے حامل تھے۔ ان پر مقامیت کی چھاپ لگانا اپنی کم علمی کا ثبوت دینا ہے۔ اقبال پر اسلام اور علی شریعتی پر ایران کے حوالے سے محدودیت و مقامیت کا الزام لگتا ہے۔ یہ الزام لگانے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اسلام کسی ایک جغرافیائی خطے تک محدود نہیں ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والوں کا مذہب نہیں ہے۔ کسی ایک رنگ نسل لباس اور تہذیب کے حامل لوگوں کا مسلک حیات نہیں ہے۔ جتنی وسعت اس دین میں ہے اور جہاں جہاں اس کے پیرو کار پائے جاتے ہیں اتنی پہنچ کسی زبان نسل اور رنگ کی بھی نہ ہو گی اقبال اور شریعتی دونوں محدود جغرافیائی وطنیت لایعنی مذہبی فرقہ بندی' اندھی لسانی عصبیت' انسان دشمن نسلی تفاخر اور ان بے شمار مصنوعی تفریقات وامتیازات کے خلاف تھے جو انسانوں کو انسانوں سے جدا کرتی ہیں جو دلوں کو توڑتی ہیں اقبال ان کو استعمار و سامراج کے ہتھکنڈے قرار دیتا ہے جنہیں انسانوں کو تقسیم کرنے کے لئے خاص مقصد کے تحت کمزور انسان گروہوں میں اپنے کارندوں کے ذریعے عام کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

ایک اور جگہ کہا ہے

رہے گا راوی ونیل وفرات میں کب تک
تیرا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے

ذات پات کے نظام اور فرقہ بندیوں کے متعلق اسکا کہنا ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

"علی شریعتی بھی اپنی انسان دوستی کا اظہار جگہ جگہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دو چیزیں آفاقی ہیں یعنی فطرت اور انسانیت اور یہی ہمارا مطمع نظر ہونا چاہئے میں چاہتا ہوں کہ ہم اصولاً اپنی فرقہ وارانہ حدود سے باہر قدم رکھیں اور اس دنیا کو جس میں ہم اب رہتے ہیں اور اس فطرت اور انسانیت کو جو اس دنیا کا حصہ ہے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لئے کسی مصنوعی خول میں گھسنا اپنی نفی کرنا ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے فطرت اور انسانیت ہی بنیادی موضوعات ہیں"

دونوں دانشور مذاہب عالم کے تقابلی جائزے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تسخیر فطرت اور تکمیل انسانیت صرف اسلام کے ابدی اور ازلی پیغام کو سمجھنے اور اس پر صحیح معنوں میں عمل کرنے میں ہے۔

اسلام ہی ایک ایسی ورلڈ فورس ہے جو جغرافیائی لکیروں سے آزاد ہے۔ جو لسانی نسلی اور دوسری عصبیتوں سے آزاد ہے اور آزاد کرواتا ہے۔ یہ تاریخی جدلیت کا نتیجہ بھی ہے۔ انسانی فکر اور سوچ ہزاروں سال کے سفر میں یہیں تک پہنچی ہے۔ فطرت سے اسکا کوئی تصادم نہیں ہے۔ یہ کائنات رب جلیل کا فعل ہے اور قرآن اسکا قول ہے۔ خالق کے قول

و فعل میں تضاد اور بعد کیوں کر ہو گا۔ وہ قرآن کو سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ جو شخص کائنات کو مسخر کرتا ہے۔ وہ قرآن کو بغیر پڑھے کائنات کو مسخر کر رہا ہے۔ وہ قرآن پر ہی عمل کر رہا ہے۔ صرف اسے قرآن پڑھنے اور اسی پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ ایمان لاتے ہی اسکی ساری جہتیں مکمل ہو جائیں گی جسطرح ھم قرآن پر ایمان لانے کے باوجود اس پر عمل کرکے کائنات کو مسخر نہیں کرتے نامکمل ہیں اس طرح دوسرے انسانی گروہ بھی اسلام اور قرآن کے بغیر ادھورے ہیں۔ دراصل عصر حاضر کا یہ بھی ایک المیہ ہے کہ فکر کے دھارے متوازی طور پر بہہ رہے ہیں۔ ان کو یکجا کرنے والی ہستیاں کم کم ہیں۔ اقبال اور شریعتی ان مسائل کو سمجھتے تھے اور اسی ملاپ SYNTHESIS کے لئے کوشاں تھے جس کے بغیر تہذیب حاضر اندھیاروں میں بھٹک رہی ہے۔ اقبال اپنے ایک لیکچر میں لکھتا ہے۔

"یہودیت نسلی مذھب ہے۔ عیسائیت ترک دنیا کی طرف مائل کرتی ہے۔ ہندومت مقامی ہے۔

اس عالم میں روح ارضی WORLD SOUL نے و جدانی طور پر ایک قالب کو تلاش کیا جس میں داخل ہو کر لوگ تخت و تاج سے وفاداری اور رنگ و نسل کے بندھنوں سے آزاد ہو جائیں۔ یہ روحانی اصول توحید کی صورت میں سرزمین عرب میں جلوہ گر ہوا اور اس نے گروہی لسانی قومی امتیازات کو مٹا کر تہذیب و تمدن کو افادیت بخشی تمام کرہ ارض کو مسلمانوں کے لئے مسجد قرار دے دیا"

علی شریعتی بھی اس کائنات کو آفاقی نکتہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ خود بھی ادیان عالم کے تقابلی مطالعے کا طالبعلم تھا۔ اس پر یہ حقیقت مغربی علم کے ذریعے بھی آشکارا ہو چکی تھی کہ اسلام ایک ورلڈ فورس ہے۔ اور یہ منتشرانسانی گروھوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بہت بڑا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہ عظیم دانشور سچے مذھب تک مغربی علوم کی راہ سے پہنچے۔ مشرق میں انہوں نے مذھب کا رسمی مطالعہ کیا تھا

اور عام مسلمانوں کی طرح روائتی اور وراثتی مسلمان تھے مگر مغربی علوم کا مطالعہ کرنے اور اسلام کو دوسرے مذاہب اور انسانوں کے بنائے ہوئے مصنوعی اقتصادی نظاموں کے مقابلے پر علمی طور پر پرکھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہوئے کہ یہی سچا مذہب انسان کے دکھوں کا مداوا اور اس کی راہ نجات ہے۔ میری نگاہ میں یہ دونوں حضرات شیخ تھے یعنی بار دگر مسلمان ہوئے تھے ایک مرتبہ ماں باپ کے گھر میں بغیر سوچے سمجھے لاکھوں کروڑوں دوسرے مسلمانوں کی طرح مسلمان ہوئے دوسری مرتبہ اس کو اچھی طرح پڑھ کر' سوچ سمجھ کر ایمان لائے۔ یہی دوسرا ایمان انکو کروڑوں دوسرے انسانوں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں حضرات ایک نئے انسان اور نئے مسلمان کی طرح ساری دنیا کو اپنا گھر اور ساری تہذیبی و تمدنی ترقی کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اور اسلام کو اس نئی دنیا کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ بہت کم لوگ یہ بصیرت حاصل کر پائے ہیں علی شریعتی ایک جگہ لکھتا ہے۔

> اگر ہم تہذیب و تمدن کو آفاقی نظر سے دیکھیں تو ظاہر ہو گا کہ یہ انسان کا مشترکہ اثاثہ ہیں یہ ان بچتوں اور تخلیقات کا بیلنس ہیں جو ہم بطور انسان صدیوں کے سفر' خرچ' توڑ پھوڑ' چوری چکاری اور دستبرد زمانہ سے انسان کی اگلی نسلوں کو منتقل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

> تہذیب انسانی تاریخ کی وہ واحد حقیقت ہے جو قوموں میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچتی چلی آئی ہے۔ کھانا پینا لباس پہنا رہنا سہنا گھر بسانا شادی بیاہ اولاد تعلیم علاج معالجہ ہنسنا بولنا رونا تفریح کرنا مرنا یہ سب انسانوں کی بنیادی ضروریات بھی ہیں اور ان کی زندگی کے بنیادی فرائض و حقائق بھی۔ اس لئے مختلف سماجی نظاموں نے مختلف اوقات اور خطوں میں اپنے پیرو کاروں کو اس باب میں ہدایات دی ہیں آج ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے کتنی عادات اطوار طریقے کھانے پینے کی اشیاء

سازو سامان طرز تعمیر دوسروں سے مستعار لے کر ایک یونیفارمٹی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان چیزوں کو ایک کل انسانی میراث سمجھ کر قبول کرنا چاہئے اس سے ہمارے نظریات و اخلاقی تصورات پر منفی اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ اصلی چیز ہے داخلی ارتقا سے آگہی اور اسکا حصول ہے اور یہ صرف دین اسلام کی سچی پیروی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسلام خدا کا بھیجا ہوا مکمل ترین ضابطہ حیات ہے جو انسان کو طبقاتی ولسانی و نسلی امتیازات سے بلند کرکے آدمیت کے درجے پہ فائز کرتا ہے۔"

اسی بات کو بڑھاتے ہوئے علی شریعتی ایک اور جگہ زیادہ وضاحت سے اسی بات کو بیان کرتا ہے۔

"میں بیک وقت ایک ایرانی اور مسلمان ہو سکتا ہوں۔ مشرقی انداز میں سوچتا ہوں ٹائی لگاتا ہوں' مغربی انداز کا سوٹ پہنتا ہوں' مغربی خوراک کھاتا ہوں' یورپی فیکٹری کی بنی ہوئی کاریں چلاتا ہوں اور ساتھ ہی مشرقی خیالات اور اسلامی اعتقادات بھی رکھتا ہوں چنانچہ یہ کہنا درست نہیں کہ کوئی محض یورپ کی بنی ہوئی کار چلاکر مشرقی نہیں رہ سکتا اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کار ایک مظہر ہے جو تمدن سے متعلق ہے۔ یہ عالمی شے ہے کیونکہ یہ رتھ کی ارتقائی شکل ہے اور اسکی افادیت نسلی اختلافات سے متعلق نہیں ہے۔ دوسری طرف تہذیب و ثقافت قبائلی اور اخلاقی پہلو رکھتی ہے اس لئے کوئی مشرقی فرد مغربی تہذیب ان معنوں میں اختیار نہیں کر سکتا۔"

علی شریعتی مغرب سے تمدن تو خریدنے کو تیار ہے مگر اپنی تہذیب کا سودا مغربی تہذیب کے بدلے کرنے کی حامی نہیں بھرتا۔ اسکا کہنا ہے کہ مغرب چونکہ ایک صارف سوسائٹی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی مصنوعات تمدن کو بیچنے کے ساتھ مصنوعات تہذیب (کلچر)

کو بھی ہم پر بیچنا شروع کر دیا۔ اس کارخیر کے لئے پہلے ضروری یہ تھا کہ اپنی تہذیب کی بڑائی اور ہماری تہذیب کی کم مائگی کو ثابت کیا جائے۔ اقبال اور شریعتی اس دو دھاری تلوار کے خطرے سے آگاہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمدن تو اپنایا جا سکتا ہے مگر تہذیب غرب کو اپنانے سے جسے ہم اپنا بھی نہیں سکتے ہماری داخلی دنیا متغیر ہو جائے گی تقلید ہم سے ہماری مذہبی اقدار بلکہ ہماری غیرت وانا بھی لے جائے گی ذائقوں تک کو تبدیل کر دیا جائے گا یہ تغیر ماں کے دودھ کی خصوصیات بھی چھین لے گا۔

اجتہاد اور اقبال علی شریعتی

اقبال اور علی شریعتی دونوں کے نزدیک اسلام ایک دائمی انقلاب کا نام ہے۔ اس انقلاب کے بنیادی ستون دو ہیں

(1) اجتہاد فکر و خیال کی مسلسل تجدید کا نام ہے۔ وقت لامحدود و مسلسل ہے۔ یہ ماحول اشیاء اورانسانوں میں تغیرات نمودار کرتا رہتا ہے۔ وقت کے اس بہتے دریا میں کوئی چیز ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہ ہوتی ہے نہ رہ سکتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی انسان یا گروہ اپنے افکار و نظریات کو منجمد کرکے ماضی میں بسنا شروع ہو جائے تو وہ خود فریبی کے علاوہ اور کسی چیز کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اسلام کو سب زمانوں' انسان اور جغرافیائی خطوں کے لئے ابدی پیغام اور لائحہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ اسکے پیرو کار پھر کس طرح اپنے خیالات کو ایک جگہ پہ منجمد کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات کے ذریعے اس اجتہادی عمل کو آگے بڑھایا جو اسلام اور وقت کا تقاضہ تھا۔ علی شریعتی نے بھی اپنی تحریروں خطبوں اور زندگی کے عمل کے ذریعے اس پیغام کو عام کیا۔ دونوں کی وابستگی اسلام سے مسلسل و مستقل رہی مگر دونوں نے چودہ سو سالوں میں وقوع پذیر ہونے والی فکری علمی سائنسی تبدیلیوں سے آگہی حاصل کرکے ان کو فکر اسلام کی روح سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور جو چیزیں صرف زمانی ضرورتوں کے طور پر انسانی گروہوں کی عادات و خصائل بن گئی

تھیں ان کے بارے میں اجتہادی اظہار خیال کیا۔ جو حرکت و عادت محض جغرافیائی و علاقائی مجبوری یا تمدن انسان کی سطح کے ایک خاص مقام پر ہونے کی وجہ سے اختیار کی جائے وہ مذہب کا لازمی حصہ قرار نہیں پا سکتی۔ بیل گاڑی کے سفر سے سپر سانک اور راکٹ کے سفر کے درمیان جو تبدیلیاں تمدن انسانی میں نمودار ہوئی ہیں یہ اولاد آدم کی مشترکہ میراث ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا یا اپنانا اسلام کے منافی ہرگز نہیں بشرطیکہ یہ اسلامی روح کی نفی نہ کرتی ہوں اور اس باب میں **خذما صفا ودع ماکدر** کا کلیدی اسلامی تصور روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہاتھ پر بیعت کرنے کی جگہ ووٹ کی پرچی کے ذریعے بیعت کرنے کا تصور اگر آگیا ہے تو اسے غیر اسلامی کیوں سمجھا جائے۔ علم سینہ بہ سینہ کی جگہ کیسٹ بہ کیسٹ ہو گیا تو اسے کیوں قبول نہ کیا جائے۔ اگر آمریت و ملوکیت کو اسلام کے فرزند اسلام کے ابتدائی سالوں کے بعد ہی چیلنج کرنے لگ گئے تھے تو آج ان کو کیوں چیلنج نہ کیا جائے۔ اگر چودہ سو سال قبل ہمیں چین جاکر علم حاصل کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ تو آج ہم کیوں جرمنی جاپان اور امریکہ جا کر علم حاصل نہ کریں صرف مقلد ہو کر زندگی گزارنا دونوں مفکرین کے نزدیک تصور اسلام کی نفی ہے۔

(2) اقبال اور شریعتی دونوں نے مسلسل انقلاب اسلامی کے لئے اجتہاد کے بعد عمل پیہم اور جہد مسلسل کو لازمی لائحہ عمل قرار دیا ہے۔ عمل وہ بھی صحیح سمت میں یعنی نیکی کی راہ میں اور بدی کے خلاف۔ اس بات میں دونوں مفکرین نبی پاک ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی عملی مثالوں کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے زندگی کے جہاد میں عملی حصہ لے کر بدی کی قوتوں کی شکست دی۔ اقبال اور شریعتی کے نزدیک بدی کے خلاف جہاد ہی سب سے بڑی نیکی ہے اور یہ جہاد محض کسی خیالی شیطان کو خیالی کنکریاں مارنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے چاروں طرف جو شیطان اور یزید موجود ہیں ان کو للکارنا ان سے بر سرپیکار ہونا اور ان کو زیر کرکے نیکی کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔ ہر دور میں فرعون ہامان بلعم باعور شداد اور نیرو موجود ہوتے ہیں۔ یہ بدی کی قوتوں کے سمبل ہیں۔

ہر دور میں فسطائیت' آمریت' استحصال ناانصافی فسق و فجور' جہالت' فکری رجعت پسندی فکری اور جسمانی دونوں لحاظ سے موجود ہوتی ہیں مسلسل انقلاب کے داعی ان قوتوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں ان کا مشن یہی ہوتا ہے کہ ان کو مٹا کر بھی انسانی قدروں یعنی محبت انصاف صداقت جمہوریت کو عام کریں۔

اقبال کا تعلق رسمی طور پر سنی مسلک سے تھا اور علی شریعتی شیعہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اپنے فرقے کا گرفتار نہیں تھا۔ ان میں سے کسی کو فرقہ پرست نہیں کہا جاسکتا۔ دونوں کے لئے مسلمان ہونا ہی سب سے بڑی شناخت تھی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ انسان بننے کہلوانے اور انسان سازی کے عمل میں مصروف رہے۔ دونوں کا نقطہ نظر تھا

آدمیت احترام آدمی باخبر شواز مقام آدمی

اسلام سے ان کی شیفتگی و وابستگی موروثیت سے بڑھ کر اس اکتسابی حوالے سے تھی کہ مذاہب عالم میں صرف یہی مذہب اولاد آدم کے دکھوں کا صحیح علاج بتاتا ہے۔ اقبال کے پورے کلام نظم ونثر کا مطالعہ کرلیں کسی بھی جگہ وہ فرقہ واریت یا تنگ نظر گروہی عصبیت کا شکار نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ تو ان تصورات کا سرے سے ہی مخالف تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اس کو جو والہانہ عشق تھا وہ ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کو بجا طور پر عاشق رسولؐ کہا جاتا ہے۔ حضورؐ کا نام نامی زبان پر آتے یا کانوں میں پڑتے ہی اس کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں۔ شاعروں نے نعت کے ہزاروں شعر لکھے ہیں مگر اقبال نے چند اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور بڑے بڑے شاعروں کے پورے پورے نعتیہ دیوان اور سیرت کی بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر
کن رسوا حضور خواجہ مارا
حساب من ز چشم او نہاں گیر

ایک مسلمان کے لئے ذات مصطفیٰ سے عقیدت و عشق شرط اولین ہے۔ اقبال کے کلام کے رگ وپے میں عشق مصطفیٰ خون کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے۔ علی شریعتی کے لیکچروں اور خطبات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اپنی تمام تر گفتگو کا مرکز محور اسوۂ رسولؐ کو ہی بناتا ہے۔ اپنے مسلک کی باتیں بھی اس وقت کرتا ہے جب وہ پیام نبوی کی تشریح و توضیح کر لیتا ہے۔ وہ اپنے مسلک کو اسی اسوۂ اور خانوادہ رسولؐ کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ نبی پاک کے خاندان سے عقیدت مسلک شیعیت کی بنیاد ہے۔ علی شریعتی کی فکر اسی شیعیت کی تشریح و تعبیر ہے جو سیرۂ رسول اور اسوۂ پنج تن کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں بھی پیغمبر اسلام کے خانوادے سے محبت کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے اور اس میں ایک سرشاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اقبال اور علی شریعتی دونوں حضرت علیؓ فاطمہؓ حسنؓ حسینؓ سے اس وجہ سے بھی عقیدت رکھتے ہیں کہ وہ نبی پاک سے خون کا رشتہ رکھتے تھے مگر اسکے ساتھ ساتھ وہ ان پاک ہستیوں کے ذاتی کمالات اور خوبیوں کے بھی گرویدہ تھے۔ ان کی قربانیوں سے بھی آگاہ تھے اور ان کی دین کے لئے خدمات کو دنیا کا سرمایہ اور بنیاد سمجھتے تھے۔ پاک نبیؐ کی رشتہ داری اپنی جگہ پر مگر اپنی ذات کو اسلام کے لئے وار کر مقصد

ارفع تک رسائی حاصل کرکے انہوں اپنے کردار کو تاریخ کی تابندہ ترین مثال بنا دیا تھا۔ یہ ہستیاں اپنی ذات میں بھی بڑائی رکھتی تھیں اس لئے اسلام اب ان کے وجود سے بھی عبارت ہو چکا ہے۔

علی شریعتی حضرت علیؓ کے بارے میں کہتا ہے۔ علیؓ وہ تھا جس کی شمشیر سے موت برستی تھی اور زبان سے وحی۔ وہ دل کے غنی علم کے باب اور قلم و تلوار دونوں کے دھنی تھے۔ اقبال حضرت علی کو سرمایہ ایمان و عشق قرار دیتا ہے۔

مسلم اول شہ مرداں علی
عشق را سرمایہ ایمان علی
از ولائے دود مانش زندہ ام
در جہاں مثل گہر تابندہ ام
از رخ او فال پیغمبر گرفت
ملت حق از شکوہش فر گرفت
قوت دین مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

علی شریعتی کو حضرت فاطمتہ زہراؓ سے گہری عقیدت تھی مگر یہ ارادت رسمی سے بڑھ کر کوئی اور چیز تھی۔ اس موضوع پر اس نے ایک پوری کتاب فاطمہؓ فاطمہؓ ہے کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں اس نے حیات فاطمہؓ کا جائزہ کسی اور زاویے سے لیا ہے۔ نبیؐ کی بیٹی ہونا بے شک بہت بڑی فضلیت ہے۔ مگر فاطمہؓ نے اپنے شخصی کردار کی عظمت سے اس رشتے کو وہ جلا بخشی کہ آج فاطمہؓ کا نام خود مذہب کا ایک حوالہ بن گیا ہے۔ اقبال کو بھی حضرت فاطمہؓ سے والہانہ ارادت تھی اور اسکا اظہار اس نے جگہ جگہ کیا ہے

نور چشم رحمت اللعالمین
آں امام اولیں و آخریں

آں کہ جاں در پیکر گیتی دمید
روزگار تازہ آئیں آفرید
مادر آں مرکز پرکار عشق
مادر آں کارواں سالار عشق
مرزعہ تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوہ کامل بتول

شہادت حسینؓ تو مسلک شیعت کا مرکزی نقطہ ہے۔ خون شہیداں سے ہی یہ مسلک لالہ رنگ ہے۔ علی شریعتی نے اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے کی رسم کو نبھایا اور جس طرح امام حسین نے اپنی آل اولاد کو کربلا کے تپتے ہوئے صحراؤں میں قربان کرکے اسلام کو حیات نو بخش دی اسطرح علی شریعتی نے یزیدی قوتوں کے ہاتھوں موت کا جام پی لیا۔ اقبال واقعہ کربلا کو یزیدیت کی موت اور اسلام کی زندگی سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس کے کلام میں حسینؓ اور یزید دو استعارے اور علامتیں بن کر ظاہر ہوئے ہیں ایک نیکی کی قوتوں کا سمبل تو دوسرا تاریکی اور جبر کی شرپسند قوتوں کی علامت۔ کربلا میں حسینؓ شہید ہوئے مگر یزید خود قتل ہو گیا ہمیشہ کے لئے۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک جگہ اقبال نے حسین کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

آں امام عاشقاں پور بتول
سرو آزادی زبستان رسول
سرخرو عشق غیور ازخون او
شوخی ایں مصرع از مضمون او

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت رازہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر امم
چوں صحاب باراں در قدم
بر زمین کربلا بارید ورفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
مریم ازیک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

اقبال اور علی شریعتی کے ہاں جتنی اقدار مشترک ہیں ان میں واقعہ کربلا' شہادت حسین اور خانوادہ رسول سے والہانہ ارادت و محبت خاص اہمیت کی حامل ہیں

اقبال اور شریعتی کے افکار میں ایسی فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ روح اقبال ایران کے اس خوبصورت دانشور میں پوری طرح حلول کر گئی ہے۔ جو کچھ اقبال نے شعر میں کہا علی شریعتی کے ہاں خوبصورت نثر میں ملتا ہے۔ اگر علی شریعتی کے پاکباز' دیانتدار اور طبع زاد دانشور قلم کار ہونے کا یقین نہ ہو تو صرف یہی بات دل و دماغ میں آتی ہے کہ شریعتی نے ہو بہو اقبال کو کاپی کیا ہے۔ دو باتیں تو اس باب میں بہت واضح ہیں۔ علی شریعتی کی ساری تحریروں کا مطالعہ کریں تو اس نتیجے کو اخذ کرنا مشکل کام نہیں کہ ان میں قرآن ہے' اسلام ہے' اہل بیت کرام ہیں یا پھر اقبال ہے۔

علی شریعتی اسلام اور اہل بیت کے بعد اگر کسی اور ہستی وتصور سے متاثر ہے تو اقبال ہے یا فانان ہے۔ اسکے علاوہ ایک اور بات جو مطالعہ شریعتی سے واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ایران میں سب سے پہلے تو نہیں البتہ سب سے زیادہ اور سب سے موثر انداز میں جس شخص نے اقبال کو متعارف کروایا وہ علی شریعتی ہی تھا۔ علی شریعتی نے اسلام پر لکھا ہے۔ اہل بیت پر لکھا ہے' یا اقبال پر لکھا ہے' اکبر جائیسی کی اس بات میں بھرپور صداقت ہے کہ

علی شریعتی کا کوئی مقالہ پڑھئے آپ کو کہیں نہ کہیں ایسا ضرور محسوس ہو گا کہ کوئی شخص اقبال کے فارسی اشعار کو پر زور' مدلل اور مربوط فارسی نثر میں بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور بات کرنے والے کو جو بھی ذہنی غذا حاصل ہو رہی ہے اسکا ماخذو منبع کلام اقبال اور صرف کلام اقبال ہے۔

اس بات کو اس تناظر میں دیکھئے کہ 1943ء میں جب اقبال کو فوت ہوئے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ایران سے ایک ثقافتی وفد ہندوستان آتا ہے اس وفد کے قائد ڈاکٹر علی اصغر تھے اور ایک رکن ابراھیم پور داؤ تھے۔ اقبال سے اس شخص کی بے اعتنائی کا یہ عالم تھا کہ اس نے لاہور میں ایک انٹرویو کے دوران اقبال کو "یک شاعر محلی بودہ است" قرار دیا اور کہا کہ "در ایران کسی او را نمی شناسد"۔ علی شریعتی نے 55-1954ء سے لکھنا شروع کیا اس وقت تک اقبال کا فارسی کلام ایران پہنچ چکا تھا مگر اسے بھرپور پذیرائی نہیں ملی تھی۔ علی شریعتی جس نے اپنی تعلیم کا آغاز ایک گاؤں سے کیا اور تعلیم کے بعد وہ اپنے علاقے کے ایک سکول میں مدرس بنا اقبال تک پہنچ گیا تھا۔ اسکی تحریروں پر اقبال کی چھاپ نظر آنے لگی تھی۔ بعد میں اس نے اقبال کے مشہور لیکچرز تشکیل جدید الہیات تک بھی رسائی حاصل کی۔ اقبال کی یہ تصنیف اس قدر مشکل انگریزی زبان میں ہے کہ آج بھی اسے پڑھنا اور سمجھنا کار دار ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ایران میں انگریزی نہیں فرانسیسی کا رواج تھا۔ علی شریعتی کو عبور فرانسیسی پر تھا انگریزی پر ہرگز نہ تھا۔ اقبال اور علی شریعتی کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد عجیب روحانی مسرت ملتی ہے۔ اسے توارد بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ کی دین تھی' روشن خیالی اور انسانیت سے بے پناہ محبت کا صلہ تھا کہ دونوں کے کلام و پیام میں حیرت انگیز مماثلت پیدا ہو گئی۔ یہ حقیقت اس بات کی بھی مظہر ہے کہ اسلام اور قرآن کو دل کی آنکھوں سے پڑھنے سمجھنے والے ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اقبال و علی شریعتی کی فکر و اسلوب کی اقدار مشترک کو دکھانے کے لئے دونوں کا سارا کلام ایک دوسرے کے مقابل بھی درج کر دیا جائے پھر بھی لفظی وظاہری توافق کی یہ بے مثل

یکسانیت ان کے قلبی قرب اور نظریاتی ہم قدمی کو بیان کرنے سے قاصر ہوگی۔

ذیل میں علی شریعتی کی تحریروں کے کچھ اقتباسات پیش ہیں جو یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ روح اقبال کس طرح علی شریعتی کے پور پور کے اندر سے گویا نظر آتی ہے۔

① "عشق کے ذریعے بڑے بڑے کام کئے جا سکتے ہیں عقل دیکھ بھال کر آگے چلتی ہے جب کہ عشق بے خطر آگ میں کود پڑتا ہے" (شریعتی)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

(اقبال)

② "سکوں ایک طرح کی موت ہے اور حرکت زندگی ہے۔ (شریعتی)

تو اسے پیمانہ امروز فردا سے نہ ناپ"
جاوداں پیہم رواں ہر دم جوان ہے زندگی

(اقبال)

③ کیا قرآن صرف استخارہ تبرک' توسل اور گلے میں تعویز ڈالنے نظربد سے بچنے' شگون لینے یا بازو پر باندھنے کے لئے اترا ہے کیا قرآن مقبروں میں مردوں کو سنانے کے لئے ہے۔

(شریعتی)

احکام اپنے تو بر حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا دیتے میں پاژند
نقش قرآن تادریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

(اقبال)

④ "سب اقتصادی سیاسی معاشرتی نظام سچے اسلام کے سامنے ہیچ ہیں۔ آج کے اسلام کو آج کی بصیرت سے دیکھا جائے نہ کہ قرون وسطی کی نظروں سے"

(شریعتی)

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(اقبال)

⑤ "اسلام جاہلوں اور رجعت کاروں کے ہاتھوں میں آکر اپنی راہ سے ہٹ چکا ہے۔ اس لئے اس ستم کا مذہب ارباب اقتدار کے ہاتھوں میں عوام الناس کے استحصال کا ہتھیار ہے"

(شریعتی)

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

(اقبال)

⑥ "مذہب منزل نہیں۔ نشان منزل ہے۔ مذہب خود آگہی سکھاتا ہے۔ خود آگہی اپنے آپ کو پالینے کا نام ہے۔ جس نے اپنے آپ کو پالیا اس نے رب کو پالیا۔ مذہب اگر اندر حرکت نہ پیدا کر سکے بلکہ جمود سکوت طاری کرے تو وہ مذہب نہیں کچھ اور ہے"

(شرحتی)

قطرہ چوں حرف خودی از بر کند
ہستی بے مایہ را گوہر کند

(اقبال)

⑦ "علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک کا تعلق معلومات سے ہے اور دوسرے کا تعلق احساس ہے۔ یہ احساس ہی ہے جو ایمان کہلاتا ہے"

(شرحتی)

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زبان تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گمان تو ہے

(اقبال)

⑧ ایک اور جگہ علی شرحتی مغربی تہذیب و تمدن کا جسطرح تجزیہ کرتا ہے۔ اسے پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم اقبال کے اشعار کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔

"اہل مغرب نے ہمارے مذہب ہماری زبان ہمارے ماضی ہمارے بزرگوں کی تحقیر کی۔ ہم کو بے شخصیت اور بے شناخت کیا۔ ہم کٹی پتنگ بن گئے۔ پھر ڈور جسکے ہاتھ میں آئی اسی کے ہو گئے۔ ہم ان کی آنکھوں سے دیکھنے ان کے کانوں سے سننے ان کے قدموں سے چلنے اور ان کے دماغ سے سوچنے لگے۔ اپنا آپ بننے کی جگہ ان جیسا بننا چاہتے ہیں۔ اس سے آگے ہماری منزل ہی نہیں ہے۔ جسکو اپنی زبان نہیں آتی وہ اس پر شرمندگی کی جگہ فخر کا اظہار کرتا ہے۔ اپنی کمزوری پر فخر کرنا صرف ہم نے ہی سیکھا ہے اور یہ معجزہ اہل مغرب نے کر دکھایا ہے۔ کسی قوم کو بحیثیت مجموعی اپنا غلام بنانے کے لئے یہ دیکھنا پڑتا ہے۔ کہ اسکی سب سے زیادہ جذباتی وابستگی کس چیز سے ہے۔ جب دانش مغرب نے تحقیق کے بعد یہ جان لیا کہ ہماری جان مذہب میں پھنسی ہوئی ہے تو انہوں نے اس مذہب کو بے حقیقت بنا دیا۔ پھر ہم خود بخود بے حقیقت ہو

گئے۔ پھر ہمارے ارباب اختیار نے مذہب فروشوں کے ساتھ مل کر مذہب کا ایک بے عمل، بے جہاد، بے کمال، بے ارتقا، اور پراز جمود و سکوت نسخہ ایجاد کرکے کرائے کے دانشوروں کے ذریعے ہمارے سروں پر تھوپ دیا۔ ان کا ایک کمال یہ تھا کہ انہوں نے مذہب کو جو ترقی پسندی کا مظہر تھا رجعت پسندی کی علامت بنا کر رکھ دیا۔ اسے آؤٹ آف فیشن قرار دے دیا چنانچہ نئی نسل کی اسی سے بے گانگی نے ان کا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ نہ مذہب رہا نہ مقابلہ۔ میدان خالی تھا۔ ہمارے ارباب مذہب زبردست سعی کرکے دین میں سے عوام الناس کے لئے غربت جہالت تقدیر پرستی اور ضعف نکالتے اور اپنے لئے انواع انواع نعمتوں کے خوان دریافت کرتے انہوں نے دنیاوی امور کو قابل فخر بنا کر زندگی بے زاری کا ڈول ڈال دیا۔

(شریعتی)

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

(اقبال)

سارتر کا کہنا ہے کہ فانان کو نہ پڑھنے والا خود اپنے تعلیمی کلچر کا مقروض ہے۔ اسی طرح علی شریعتی شہید کے مطالعے سے محروم رہ جانے والا خود اپنا قرض دار ہے۔ دور جدید میں لبریشن تھیالوجی اور مزاحمتی ادب کے سقراط ڈاکٹر علی شریعتی کا مطالعہ کیجئے اور اپنا قرضہ چکائیے

اقبال بیسویں صدی کا عظیم ریفارمر

مشہور دانشور شانڈل کا کہنا ہے کہ جب ہم کسی عظیم انسان کو پہچان لیتے ہیں اوراس کی عظمتوں اور رحمتوں سے آگاہ ہوجاتے ہیں تو ہم اس کی روح کو اپنے میں پھونک دیتے ہیں ہم اس کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اس کے ہمراہ زندگی گزارتے ہیں وہ شخص دائمی زندگی کا حامل ہوتا ہے چنانچہ ہمیں بھی حیات نو مل جاتی ہے۔

حسینیہ ارشاد کے نام سے جو ادارہ علم ودانش کے فروغ کے لئے کام کررہا ہے۔ وہ تحقیق و تبلیغ کے میدان میں فکر تازہ کا جھونکا ثابت ہورہا ہے۔ شاید اس ادارے کے ہی توسط سے ہم عالمی سطح پر اسلامی فکر' انسانی بصیرت اور بین الاقوامی تحقیق کا اہم فریضہ سرانجام دے رہے ہیں یہ اس عالمگیر اور آفاقی فکر وبصیرت کا مظہر ہے جو ہمارے عہد کے ایک عظیم دانشور علامہ اقبال اپنے کلام کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کرچکے ہیں۔

فکری انحطاط اور ذہنی سکوت کے اس زمانے میں قومی تنگ نظری اور ملی بے حسی کیوجہ سے اسلام کی روشن قندیل بجھتی جاتی ہے اور اس کے عالمگیر فکری نظام کو طاق نسیان پر رکھ دیا گیا ہے وحدت فکر وعمل جواسلام کا خاصہ ہے اور جسے کسی خاص قوم اور سرزمین تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ہاں بری طرح مجروح ہوئی ہے مسلمان اسیران کمند حرص ہونے لگے ہیں۔ بہت سوں نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔ اسطرح چند رویئے نمودار ہوتے ہیں۔

۱ غیرمذاہب اور غیر اسلامی افکار کی پیروی

۲ اسلام سے لاتعلقی اور بے گانگی

۳ اسلام کے مسخ شدہ تصور کو اسلام سمجھنا۔

مگر یہ مقام شکر ہے کہ اسلامی سماج کے روشن فکر نوجوان اور خصوصی طور پر ملت ایرانیہ سے وابستہ نوجوانوں نے اس حقیقت کا ادراک کرلیا ہے اور تنگ نظری اور تعصب

کی ان زنجیروں کو توڑنے کا عمل شروع کردیا ہے جس نے اسلام کو اور مسلم امہ کو جکڑ بندیوں میں گرفتار کررکھا تھا اور اس عظیم فکری نظام کو جاننے کی سعی شروع کردی ہے جسے وقت اور وقت کے غداروں نے بکھیر دیا تھا سچے اسلام کی بازیابی اور بحالی ہی ہمارا مشن ہے۔ اس اسلام کو دریافت کرکے ہم نے اس کو اپنی اصلی اور کلی صورت میں نافذ کرنا ہے۔ ہمارے لئے یہی سب سے بڑی تجدید اور انقلاب ہے۔

اسی تجدید یا انقلاب کو اپنی مشہور زمانہ تصنیف تشکیل جدید الہیات میں عصر حاضر کے عظیم دانشور اقبال نے واضح انداز میں بیان کیا ہے میرا بھی ایمان ہے کہ یہی انقلاب عصر حاضر کا سب سے بڑا انقلاب ہوگا اس کام کے حوالے سے اسلام کی شناخت تحقیقات اور اس کے روحانی اور فکری فروغ کا باعث بنے گا۔

میری یہ تمنا ہے کہ اسی قسم کا ایک پروگرام عظیم دانشور علامہ جمال الدین افغانی کے لئے بھی ترتیب دیا جائے۔ افغانی نے بھی مسلمانوں کے مردہ اجسام میں بیداری کی روح پھونکی تھی۔ مشرق جو غفلت کی گہری نیند سورہا تھا۔ جو متذبذب خیالات اور خوفزدہ حالات کا شکار تھا۔ علامہ کی نڈر سوچ نے ان خوف وہراس کے سایوں کو ملیا میٹ کیا۔ ہمیں چاہئے کہ مل کر بیٹھیں اور اس مرد عظیم کے بارے میں سوچیں۔ اس کی تحریر وتصنیف کا جائزہ لیں جس نے بقول فرانز فانان نہ صرف ایرانی واسلامی سماج بلکہ تمام مظلوم انسانوں پر اثر ڈالا ہے۔ میری نگاہ میں اقبال اور افغانی جیسے زعما سے آگاہی حاصل کرنا ایک فرد سے آگہی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ایک پورے سکول آف تھاٹ یا نظریئے سے آگہی کا نام ہے۔

اقبال ایک باب کانام ہے ہم اقبال جمال شناسی کے واسطے سے ایک ایسے متن میں داخل ہوجاتے ہیں۔ جن کے عنوان یہی شخصیتیں ہیں۔ یہ متن خود ہماری ذات ہمارے افکار اور ہماری مشکلات کا حل پیش کرتا ہے چنانچہ اقبال اور جمال کی پہچان درحقیقت اسلام کی پہچان ہے۔ اور اس پہچان کو ہم اپنے عہد حاضر اور آئندہ کی پہچان بھی کہہ سکتے ہیں۔

میں ان ہزاروں انسانوں میں سے ہوں جو مدتوں سے اس خطہ ارض میں اپنی تقدیر

اپنے مستقبل اور عصر حاضر کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ اور اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ کوئی نجات کی صورت نکالی جائے۔ میں عوام کے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور اس طبقے کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوں۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال اس بنجر زمین اور دشت بے پناہ میں ٹھنڈے پانی کی علامت ہے۔ ہمارا عہد پیاسا ہے اور اس تلاش میں ہے کہ کوئی ان آلام کے دشت سے نکال کر اس کو منزل مقصود تک پہنچائے ہم ہر کتب مذہب کی طرف بڑھتے ہیں مگر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگر کہیں سے کچھ دستیاب ہوتا بھی ہے تو وہ اس قدر کارآمد نہیں ہوتا جو انسان کے تمام دکھوں اور احتیاجات کو پورا کر سکے۔ میں جب اس تناظر میں اس دنیا کا جائزہ لیتا ہوں۔ تو اپنے آپ کو بالکل تنہا پاتا ہوں۔ میں انہی خیالات میں ڈوبا اپنے سماج اور تاریخ میں زندگی گزار رہا ہوں۔

میں ایک جانب سے بیسویں صدی سے وابستہ ہوں۔ حالانکہ میں اس صدی میں زندگی نہیں گزار رہا ہوں۔ مگر اس صدی میں ہونے والے تغیرات سے کسی طور پر آزاد نہیں ہو سکا ہوں۔ اس دور کے آلام میرے احساس، ضمیر اور معاشرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ایک صنعتی اژدہام کہ جسے تمدن مغرب کا ثقافتی نام دیا جا سکتا ہے۔ میں اس سے پیدا ہونے والے فساد کے مقابلے میں تنہا کھڑا ہوں۔ ہمیں چاہئے کہ اس طوفان عظیم کے اندر بیٹھے ہوئے اپنے مقام کا تعین کریں۔ دوسری جانب بطور ایک حیاتیاتی بشر کے میں فطرت کے جہاں میں سانسیں لے رہا ہوں۔ مجھے اس حیثیت سے بھی اپنے وجود کا تعین کرنا ہے کہ میں کیسی زندگی گزاروں۔ مجھے یہ بھی جاننا ہے کہ میں کون ہوں کہاں سے آیا ہوں۔ میرے جغرافیے کے علاوہ میری تاریخ کیا ہے۔ انسانی زندگی کی آفرینش، روح اور جسم اور تدبر و تقدیر کا آپس میں کیا رشتہ ہے میں کن چیزوں سے کا معتقد ہوں اور میری زندگی سماجی وجود اور عہد کا مقابلہ کس چیز سے ہوتا ہے۔ اپنے حیاتیاتی وجود کے ساتھ میرا معاشرتی وجود زمین کے اس خطے سے وابستہ ہے جسے مشرق کہتے ہیں۔ وہ مشرق جس کا ماضی، حال اور مستقبل۔ تینوں توہمات، وسوسوں اور دکھوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس وقت ایک ایسی امت جو اپنے آپ

کو اسلامی کہتی ہے اور جس سے میرا ماضی حال اور مستقبل وابستہ ہے طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہے۔ مجھ جیسا حساس شخص اس امت سے وابستگی کا دعویٰ کرنے کے بعد اپنی دانشورانہ ذمہ داریوں سے دست کش نہیں ہوسکتا۔ لیکن ابھی تک مجھے معلوم نہیں کہ میں اپنے جذبات اور احساسات کو کن بنیادوں پر استوار کروں۔ یا کس نگاہ سے اس جہاں کو دیکھوں۔ کس قسم کی فلسفیانہ توجیح کروں کس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کروں۔ وہ مذاہب جو انسانی غموں اور دکھوں کا مداوا نہیں کرتے۔ اور عصر جدید کے سوالوں کے جواب مہیا نہیں کرسکتے وہ ادھورے ہیں یہی وجہ کہ آج کا انسان مذہب سے بیگانہ ہوتا جارہا ہے۔

سائنس کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانی آلام کا مداوا پیش کرسکتی ہے مگر سائنس نے بھی اپنی مشینی ترقی اور بوژوا معیشت کے ذریعے تجارت اور کاروبار کو ہی آگے بڑھایا ہے اندر کی دنیا کا علاج اس کے پاس بھی نہیں۔ بلکہ اس نے نئی نسل اور اس کے دانشوروں کے ایمان کو ہی متزلزل کردیا ہے۔اندریں حالات انسانی سوچ غموں میں ڈوبی ہوئی ہے کہ جائے تو کہاں جائے اور حقیقت کلی کا راز کہاں سے دریافت ہو کیونکہ جس شعبے کے پاس جائیں وہ صرف جزو کا علاج پیش کرتا ہے ایک مرض کا علاج ہوتا تو کئی دوسرے امراض پیدا ہوجاتے ہیں۔چنانچہ بیسویں صدی کے ایک سوچنے والے انسان کے جو مسائل ہوسکتے ہیں وہ میرے مسئلے بھی ہیں۔ میرا المیہ بھی ہے کہ میں مغرب تمدن کی لائی ہوئی نعمتوں سے تو متمتع نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس کی تمام **بدنصیبی** بھی مجھے سہنی پڑتی ہیں۔

مشرقی ممالک کا یہ بھی المیہ ہے کہ وہ ابھی نہ مشینی دور میں داخل ہوئے ہیں نہ سرمایہ داری دور میں لیکن ان ادوار کی تمام تر بیماریاں آکر ان کو چمٹ گئی ہیں۔ مادی ترقی ہمارے گھروں میں داخل ہی نہیں ہوئی مگر ہماری روحانی قدروں کا جنازہ نکلنا شروع ہوگیا ہے۔

بیسویں صدی میں رہتے ہوئے ہم پسماندگی کا شکار ہیں۔ دور جدید کا انسان طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہے مثلاً" بھوک' بیماری اور جہالت۔ میں بھی ان تمام مصائب

کا اسی طرح ادراک رکھتا ہوں جس طرح ایک پسماندہ سماج میں رہنے والا کوئی فرد۔ اس لحاظ سے میں دو دنیاؤں کا باشندہ ہوں۔

بطور مشرقی انسان میرے دکھ یہ ہیں

۱ پسماندگی
۲ انحطاط
۳ غربت بھوک
۴ علمی فقر

بحیثیت دور جدید کے انسان کے میرے دکھ یہ ہیں

۱ فکری انتشار
۲ تنہائی
۳ روحانی افلاس
۴ فلسفیانہ یاس
۵ اخلاقی انحطاط

اندریں حالات میں نہیں جانتا کہ کیا کروں' کون ہے جو میرے سوالوں کا جواب دے گا۔ دراصل میرے سوال کا جواب مغربی انسان کے بس کی بات نہیں۔ میرے سوالوں کا جواب ایک مشرقی انسان ہی دے گا جو مسلمان بھی ہوگا۔ درد مندوخود آگاہ بھی ہوگا ور عصر قدیم وجدید کے تصورات سے آگاہ ہوگا۔ اس پس منظر میں جب میں ملت اسلامیہ کی فکری تاریخ کے دور کا جائزہ لیتا ہوں۔ تو مجھے سید جمال الدین افغانی اسلامی انقلاب کے سب سے بڑے علمبردار نظر آتے ہیں۔ جس جدید فکر اسلامی کا آغاز جمال الدین افغانی نے کیا۔ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فریضہ ڈاکٹر محمد اقبال نے ادا کیا اور درحقیقت اقبال ہی میرے سارے سوالوں کا جواب دے سکتا ہے۔ جوبات میں نے بعد میں عرض کرنی ہے۔ وہ میں آغاز میں ہی کہہ دیتا ہوں۔

میں جب علامہ اقبال کے متعلق سوچتا ہوں "علیؓ گونہ ای رای یعنم" یعنی وہ علی نما ہے۔ علی کی راہوں پر چلنے والا انسان۔ بیسویں صدی کے انسان کی صلاحیتوں کے مطابق تناسب کمیت وکیفیت کے ساتھ اقبال انہی راہوں کا مسافر تھا اس لئے بھی کہ علیؓ ہی وہ ہستی ہے۔ وہ نہ صرف قول بلکہ عمل حیات سے تمام انسانی دکھوں اور ضروریات کا ہر دور میں تسلی بخش جواب دیتا ہے۔ یہ علیؓ جیسے لوگوں کا ہی کرشمہ ہے کہ اسلام آج زندہ ہے۔ اسلام مٹ بھی نہیں سکتا۔ اور نہ ہی علیؓ کا نام دنیا سے مٹ سکتا ہے جب تک اسلام زندہ ہے علیؓ کا نام زندہ رہے گا۔ مگر یہ وقت اس موضوع کو چھیڑنے کا نہیں۔

اسلامی فکر کو جس چیز نے انقلابی قوت اور شعور حیات عطا کیا ہے۔ وہ جستجوئے حیات ہے پہلی بار تاریخ عالم میں اسلام ایک ایسے انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا جو انسان کی داخلی پاکیزگی پر زور دیتا تھا۔ جو مذہبی احساس اور اس سے حاصل ہونے والی معجزانہ قوتوں کو فرد کے اندر مرتکز کرتا ہے۔ اسلام داخلی زندگی کے ساتھ ساتھ خارجی اور اجتماعی زندگی کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ انسان خارجی زندگی کی تشکیل میں عصر حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آگے بڑھ سکتا ہے اسلامی انسان کی دنیا خانوں میں نہیں بٹی ہوئی ہے جیسا کہ عیسائی دنیا کا دستور ہے۔ جہاں اخلاقی دنیا کی راہنمائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے کی جاتی ہے اور سیاسی راہنمائی کا فریضہ قیصر کو سونپا جاتا ہے۔ ہم زندگی بعد الموت کے امور کو دیں کی راہنمائی اور دنیاوی امور کو محض عقل کے ذریعے حل کرنے کی روایت کے تابع نہیں ہیں۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے کہ داخلی سیروسیاحت کے لئے تو عشق' ایمان' عرفان کو کام میں لاویں۔ اور خارجی دنیا کے لئے مادیت وحکمت کا راستہ اپنائیں۔

اسلامی نکتہ نگاہ سے فرد اور معاشرہ' مادیت اور روحانیت سب کی بنیاد نظریہ توحید پر استوار ہوتی ہے اور یہ نظریہ محض فلسفیوں' کلامیوں اور صوفیوں کے افکار تک محدود نہیں ہے۔ توحید اور اس پر اعتقاد ایسی زندگی میں وحدت کا نام ہے جو انسان حیات فطری کے اندر رہ کر حاصل کرتا ہے۔ اسلامی توحید کا یہی مفہوم ہے۔ اس کی بنیاد فلسفہ اور مذہب پر ہی

نہیں۔ بلکہ فلسفہ' تاریخ' نفسیات اور سماجیات پر ہے اس دین توحید میں "علی" اور دوسری تمام ہستیاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے سچے اسلام کے مکتب سے براہ راست تربیت یافتہ تھیں۔ علیؓ اپنے باطنی کمالات کی وجہ سے روح کامل رکھتے تھے۔ وہ اس حوالے سے آسمانی راستوں کو ارضی راہوں سے بہتر جانتے تھے۔ ان کی روح اس وقت مضطرب ہوجاتی تھی جب مسلم ریاست کے کسی کونے میں ایک انسان بھی رات کو بھوکا سوتا تھا۔ وہ ایک ایسا ضمیر تھا جو ہمہ وقت وفور احساس سے پر تھا۔ خطہ زمین کے کسی حصے کی بھوک اسے بے قرار کردیتی تھی۔

علیؓ عوام کا سچا دوست تھا جو مادی دنیا میں رہتے ہوئے مادی دنیا کے مسئلوں پر سوچتا بھی ہے۔ یہ خلوت وسکوت باطنی کا سوختہ ایک حکیم ہے جو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتا ہے۔ یہ مرد صاحب سیف وقلم ہے یہ ایک ایسا انسان ہے جو تلوار سے ہلاک کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے اور زبان سے روحانی پیغام بھی دے سکتا ہے یہ مرد انسانیت کا آئیڈیل ہے یہ پیغمبر اسلامؐ کے سکول آف تھاٹ کی برگزیدہ ہستی ہے اور مثالی انسان ہے جس کو دیکھ کر دوسرے انسان اپنی زندگیاں سنوار سکتے ہیں۔ یہ کامل انسان سوشیالوجی کے میدان میں (lehomme total) لاہومے ٹوٹل کہلاتا ہے۔

علیؓ کی شخصیت اور اس کا سکول اگرچہ باقی ہے مگر اس میں حد سے زیادہ تحریف ہوچکی ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے زندہ انسان کے ہاتھ پاؤں' دل دماغ' سر اور آنکھیں کاٹ کر اسے اعضائے بریدہ لاش بنا دیا جائے۔ توقیر تو اس انسان عظیم کی ہوتی ہے بلکہ مبالغہ آمیز حد تک ہوتی ہے مگر اس توقیر میں زندگی اور اس کی حرارت شامل نہیں ہوتی۔ ٹکڑا جزو ہوتا ہے کل نہیں۔ عرفان علی تصوف کی دنیا میں کئی خوبصورتیوں کے ساتھ ترقی کرگیا ہے مگر جرات وجوانمردی' تجلی وحسن اور جگرداری کے عمل کسی دوسری سوسائٹی میں کمال تک پہنچے۔ حکمت وعلم قرآن شناسی سے متعلق ان کا سرچشمہ کہیں اور جاری ہوگیا ہے۔ تفسیر' معارف اسلامی اقدار اور ایمانی کے مناہج ترقی کرنے لگے۔ نئے نئے افکار ونظریات

تفکر، تدبر اور تعلم کے عنوان سے پھل پھول نکالنے اور خوب بہار دکھلانے لگے۔

اسی کل کے کسی جزو نے سرحد الوحیت کو چھولیا مظلوم انسانوں کے درمیان یہی تصور کسی اور عنوان سے پرورش پانے لگا یہ سب کچھ تو ہوا مگر علی اپنی کلیت میں جلوہ گر نہ ہوسکا۔ وہ قاش قاش ہے۔ اسلام بھی موجود ہے مگر شق دار اور جدا جدا۔ قرآن بھی موجود ہے اور دوسری ہستیاں بھی موجود ہیں جو آغوش رسالت کی پروردہ ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم ان تمام بکھرے موتیوں کو یکجا کریں اور اسلام کو کلیت کی صورت میں نمودار کرکے اپنا آئیڈیل بنائیں۔

فکراور روح انسانی وجود کی اکائی میں یکجا ہوتے ہیں مگر جب ان کو الگ الگ کردیں تو ان کی تاثیر ختم ہوجاتی ہے۔ فرد فرد جزو کی شان کتنی ہی کیوں نہ بڑھائی جائے۔ حسن کامل ظاہر نہیں ہوسکتا۔ شے کی روح کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے تمام اجزاء کو اکٹھا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ آج کا اسلام ہم کو قوت وحرکت نہیں بخشتا۔ بلکہ سکوت وسکون اور جمود دیتا ہے یہ ہمیں قناعت اور صبر سکھاتا ہے۔مگر منفی معنوں میں جس سے قوت عمل کند ہو جاتی ہے اور انسان جمود کا شکار ہوکر رہ جاتا ہے اب دیکھنا ہے کہ یہ صورت حال کیسے پیدا ہوئی۔ وہ نظام کدھر گیا جو پچیس سال کے عرصے میں انسان کو تاریخ وتمدن کا پروردگار بنا گیا تھااور قرون اولی کے مسلمان کو اس قدر قوت عطا کردی تھی کہ اس نے تاریخی جبر کا منہ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ مکتب کدھر گیا جس میں جندب بن جنادہ جیسے ان پڑھ نیم وحشی داخل ہوتے تھے تو ابوذر غفاریؓ بن کر نکلتے تھے اور محروم ومظلوم انسانوں کی امید بن جاتے تھے۔ کیا آج کا مکتب اسلام یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے؟

ہم پر یہ لازم ہے کہ اس تاریخ کے تسلسل کو دوبارہ قائم کریں۔ اس شکستہ ڈھانچے کی مرمت کریں۔ بکھرے ہوئے موتیوں کو مالا میں پروئیں۔ اپنی تجدید نوکریں۔ قوم کی تالیف نو کریں مردہ اجسام میں حرکت وقوت پیدا کریں اور پھر وہی سماں پیدا کریں جو چودہ صدیاں قبل پیدا ہوا تھا۔ ان ٹکڑوں کو جوڑنے کے خواب دیکھنے اور اس کے لئے سعی کرنے

والا ایک شخص بیسویں صدی میں ہمارے سامنے تجلی کرچکا ہے۔ اس عظیم شخص کا نام محمد اقبال ہے۔

اقبال امام غزالی' ابن عربی' مولانا روم کی طرح صرف حکمت وعرفان کی ماورائی وسعتوں اور رفعتوں کے بارے میں نہیں سوچتے رہے۔ ان کا زور صرف باطنی پاکیزگی کے حصول پر ہی نہیں لگا رہا۔ خارجہ حالات وواقعات سے انہوں نے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ اقبال حکومتی جبرواستبداد اور مستضعف عوام کے مسائل سے کبھی غافل نہیں رہے۔ نہ ہی اقبال ابو مسلم' حسن بن صباح' صلاح الدین ایوبی اور ان جیسی دوسری ہستیوں کی طرف صرف سیف وشمشیر کو اپنا وظیفہ حیات بنائے رہے اور قدرت و زور کو ہی روابط اجتماعی تربیت بشری' غلبہ ذات تغیروانقلاب اور اصلاح معاشرہ کا ذریعہ گردانتے رہے۔ اقبال سرسید احمد خان کی طرح بھی نہ تھے جو اسلامی معاشرے کو تبدیل کرنے کے لئے ہر حربہ کام میں لانا چاہتے تھے اور اسی کے لئے علمی ومنطقی تاویلات کے ذخیرے جمع کرتے رہے۔ اقبال نے صرف پاکیزگی باطن اور داخل دنیا کی شست وشو کو اپنے علمی جہاد کا محور ومرکز نہیں بنایا۔

اقبال کا پیغام کل انسانیت کے لئے ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب' سقراط کی دانش اور قیصروکسریٰ کی قوت کو ایک ہی انسان کے اندر یکجا کرنا چاہتے تھے اس کا ہدف جسم انسانی اور روح دونوں تھے اقبال وہ عظیم ہستی تھا۔ جس نے سیاسی بیداری کے مشن کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ علم وفلسفہ کے لحاظ سے وہ بڑی حیثیت کا حامل تھا اہل مغرب اسے برگساں کے برابر کا فلسفی اور تاریخ اسلام اسے غزالی کے پائے کا دانشور سمجھتی ہے۔ ہم اسے مصلح قوم اور اپنے معاشرے کا ایک ریفارمر سمجھتے ہیں۔ وہ جس سوسائٹی میں رہتا تھا اس کے متعلق سوچتا تھا۔ اس کی آزادی نجات اور بیداری کے لئے مسلسل جہاد کرتا تھا اور یہ کام وہ سارتر کی طرح اور صرف فن وفکر کے لحاظ سے نہیں کرتا تھا۔ سارتر سیاسی روشن خیالی کا ایک خوبصورت مظہر تھا۔ اس کے مقابلے میں اقبال ایک عزم بالجزم کے ساتھ مسلسل کوشش بھی کرتا رہا۔ تلاش پیہم اس کا وطیرہ تھا۔ وہ مولوی معنوی کا عاشق بھی ہے

اس کی روحانی دنیا کا سفر بھی اور اس درد عشق کی آگ میں پگھلا ہوا گداز انسان بھی۔ مقام شکر ہے کہ اقبال کرچی کرچی ہونے سے بچ گیا خانوں میں نہ بٹا۔ عشق کیا مگر اس میں گم نہیں ہوا ثابت وسالم کندن بن کر نکلا

اقبال یورپ گیا۔ وہاں کے فلسفیانہ مکتبوں کا مطالعہ کیا۔ سب نے جانا کہ بیسویں صدی کا فلسفی ہے پر مغرب کا غلام نہ ہوا۔ بلکہ فکری لحاظ سے یورپ کو تسخیر کیا۔ آنکھیں کھلی رکھ کر وہاں وقت گزارا۔ پوری طاقت وتوانائی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ساتھ ساتھ مولانا روم کی روحانیت کا قائل بھی رہا اور مرید باصفا بھی۔ تصوف کا قول ہے

جو قسمت ازلی بی حضور ماکردند
گراند کی نہ بوفق رضا است خوردہ مگر

عام تصور یہ ہے کہ اگر زمانہ تیرے حال کے موافق نہیں ہے تو تو زمانے کے حال کے موافق بن جا۔

زمانہ باتو نسازد تو بہ زمانہ بساز

اقبال اس تصور کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔

زمانہ باتو نسازد تو بہ زمانہ ستیز

اقبال کے نزدیک زمانہ یا وقت سرنوشت وسرگزشت انسان ہے۔ انسان موج ہے ساحل نہیں۔ انسان کا وجود اثبات حرکت وعمل سے ہے۔ اقبال کی نگاہ میں انسان تصوف ہندی کا مجہول فرد ہے نہ مذہبی جنون انگیزی کا شوریدہ سر بندہ بلکہ وہ سراسر عرفان قرآنی ہے۔ جو وقت کو تبدیل کرسکتا ہے (قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن)۔ سچا اسلام تقدیر انسانی کو تقدیر آسمانی بنا دیتا ہے کیونکہ اس میں انسان کا بنیادی نقش اپنی اصلیت میں نمودار ہوتا ہے۔ اسلام میں بشری زندگی کو کمال تک پہنچانے کا نظام موجود ہے۔

روشن خیال اور جدید روحانی طرز فکر کے حامی افراد مذہب کے باب میں جو تنقیدی کرتے ہیں وہ فلسفہ جبروقدر سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی مشیت الٰہی کے سامنے انسان محض

ایک بے ارادہ مخلوق منطقی طور پر انسان کو مقدر کا کھلونا اور غیبی طاقت کے حضور ایک کمزور وناتواں چیز تصور کیا جاتا ہے۔ مگر یہ سوچ خود عبودیت کی تذلیل ہے۔ جب قدرت و آزادی اور اختیار کا فلسفہ ختم ہوجائے تو پھر جو ابدی یا احتساب کا مسئلہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ راضی بہ رضااور جو بھی تقدیر دکھائے اس کے آگے سرجھکانا ہے۔ اس تقدیر پرستی کی روش کی موجودگی میں تدبیر اور سعی و عمل لایعنی ہوجاتے ہیں اصلاح اور تبدیلی کا جذبہ فضول ہوجاتا ہے۔ فلسفہ اسلام کے مطابق خدائے واحد سلطنت کائنات کا مالک مطلق ہے کارآفریں ہے' ہدایت کار ہے اور حکومت واقتدار کی باگ ڈور رکھتا ہے مگر اس تمام انتظام کے اندر انسان کو اس طرح رکھا گیا کہ باوجود یہ کہ وہ اس عظیم شہنشاہیت اور جابر دنیا اور اس میں قائم حکومت الٰہی سے باہر نہیں جاسکتا مگر اس کی حدود کے اندر آزادانہ زندگی گزارنے کا اسے کافی اختیار دیا گیا ہے انسان کو ربانی صلاحیتوں اور الوہی توانائی کا حامل قرار دیا گیا ہے' جو سب استعدادو کا سرچشمہ ہے۔

انسان صاحب ارادہ اختیار ہونے کے سبب سرکشی کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یعنی چاہے تو تسلیم اختیار کرے اور مرضی ہو تو روگردانی پر اتر آئے۔ اسی بنیاد پر اسے اختیار دے کر مسئول اور مستوجب جزا وسزا بنایا گیا ہے۔ انسان خود ہی کارساز وکارگر بھی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

لیس للانسان الا ما سعی

اقبال اسی نکتے کی صراحت قرآنی بصیرت کی روشنی میں کرتا ہے۔ یعنی ایک طرف انسان کا بااختیار ہونا۔ دوسری طرف اسے اسی مناسبت سے جزا وسزا کا حقدار ٹھہرانا۔ اسی تناظر میں دور حاضر کے مختلف نظریات مثلاً" وحدت اور ترقی پسند انتہا پسندی انسان کو مذہب اور خدا سے دور لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ موجودہ مذاہب کو دانشور حلقوں میں انسانی آزادیوں' توقیر اور ارتقا کا حریف سمجھا جاتا ہے اور مذاہب کو ترقی کی راہ کی بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انقلابی نظریہ اسلام یہ ہے کہ

انسان کی تقدیر وہی ہے جو وہ اپنے ہاتھوں سے خود بناتا ہے۔

یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ (النساء۔ ۴۵)

اقبال نے اس عہد کی تمام روحانی فلسفیانہ منازل کو اپنی بصیرت اور ایمان کے ذریعے طے کرلیا تھا۔ اقبال ایک ایسا مسلمان مہاجر تھا۔ جو ہند کی پراسرار اور دقیانوسی پستیوں سے ابھرا اور یورپی دانش وحکمت کی بلند ترین چوٹیوں پر جاکر متمکن ہوگیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے وہاں جاکر قیام نہیں کیا۔ بلکہ واپس ہماری دنیا (اسلام کی دنیا) میں لوٹ آیا تاکہ اپنی قوم کو صحیح راستے پر ڈالے۔ ان کی شخصیت کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اسلام کے وابستگان کو آتش زیرپا اور خود آگاہ کیا ہے دلوں میں درد کی فصلیں بوئی ہیں اور بیسویں صدی کے جدید انسان کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کردیا ہے مشرق کی پراسرار روحانی قلبی دنیا کا ناطہ مغربی سائنس وحکمت اور قوت وتوانائی سے اس طرح جوڑا ہے کہ سارے عالم سے سرمایہ اسلام کی گرانقدری کو تسلیم کروالیا ہے اور اسلام کی بطور ایک ابدی انقلاب کے شناخت کروائی ہے۔

اقبال نے اپنی فکری زیرکی کی اساس پر اپنی دانش کو ایک انسٹی ٹیوشن بنا ڈالا اور انسان کو مشرق کے دل اور مغرب کے دماغ سے مزین کردیا تاکہ انسان عقل وخرد کا مالک بھی بنے اور قوت عشق سے بھی بہرہ مند ہو۔ انسان موجودہ زندگی اور آخرت دونوں کو متوازن رکھے۔ دونوں کی ضروریات کو پورا کرے۔ خلق اور خالق کو اچھی طرح پہچانے۔ انسان عالمگیر سماج کا فرد ہے۔ معاشرے سے الگ اور دور ہوکر وہ کوئی انقلاب نہیں لاسکتا۔ کوئی اصلاح نہیں کرسکتا۔ اس طرح علم خشک ہوجاتا ہے۔ اور علم کی آنکھوں کا پانی خشک ہوجائے تو وہ جنت کا ادراک نہیں کرسکتا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا نظام ہو جو ہماری فلسفیانہ ضرورتوں کا جواب مہیا کرے۔ فی الحال تو یہ صورت ہے کہ اب تک تمام فلسفے اور ادارے عصر حاضر کے انسان کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ کوئی ایسا نظام ہو جو آج کے دانشور انسان کے اندر کا حال جانے۔ آج کے تمدن کو جانے اور آج کے پرثروت

علم سے آگاہ ہو فکری اور مذہبی سرمایہ دانش سے بخوبی واقف ہو۔ وقت اور اس کے تسلسل وارتقا کی نزاکتوں کو جانتا ہو۔ وہ کسی گزری صدی میں سانسیں نہ لے رہا ہو۔ وہ آج کے اندر رہ رہا ہو اور آج کے غم و آلام سے آگاہ ہو جب ہم کسی ایسے فرد کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو مشرق و مغرب کا راز دار ہو۔ تو ہمیں یہ پرتو اقبال جیسے شخص میں نظر آتا ہے جو قدیم وجدید فکر و نظر کا حسین سنگم بن کر منصہ شہود پر آیا۔ اقبال اس مکمل انسانی شخصیت کی تلاش میں رہے۔ جو دونوں دنیاؤں کا احاطہ کرتی ہو۔ روشن فکر مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بھی اسی راہ پر چلیں۔ جس پر علامہ اقبال جیسے لوگ چل چکے ہیں۔

بیداری ملت کے فریضے کو پہلے جمال الدین افغانی نے پورا کیا۔ علامہ اقبال اس فصل کا پہلا پھل تھا۔ اقبال اصلاح کرنے والا بھی تھا اور سوال کرنے والا بھی تھا۔ اس کی دور بین نگاہ ہی دراصل مسلمانوں کے لئے سرمایہ حیات بھی تھی۔ اور ملت اسلامیہ کو رنج اور بدنصیبی سے نجات دلانے کا سامان بھی ہے۔ اقبال تدریجی اور ارتقائی اصلاح سے زیادہ کلی اصلاح یا سالم انقلاب کے حامی تھے۔ فکر و نظر احساس وجذبات' علم ودانش' نظریات' نصب العین میں مکمل انقلاب لانا چاہتے تھے۔

اقبال' جمال الدین افغانی' کواکبی' محمدؐ عبدہ' بن ابراہیم وہ عظیم انسان تھے۔ جنہوں نے بیسویں صدی کے مشرق کو ہلا کر رکھ دیا انہوں نے اسی انقلاب کی بنیاد رکھی جو اسلام کے نور سے روشن تھا۔ انسان سماج سے ضرور اثر قبول کرتا ہے۔ ماحول دراصل تاریخ' فطرت سماج' انسانی تعلقات' خاندان اور موروثی تسلسل کا مجموعہ ہے یہ ماحول فرد کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح فرد بھی ماحول کو ایک خاص حد تک متاثر کرتا ہے اور یہ اثر انگیزی انسان کی ترقی' خود آگاہی اور ارادے کو پڑے میں اپنا وزن ڈالتی ہے۔ خاص طور پر انیسویں صدی میں شروع ہونے والی علمی وتکنیکی ترقی کا اس اثر انگیزی میں بڑا حصہ ہے اور اس صدی سے شروع ہونے والی بحث کا مجموعی نکتہ یہ تھا کہ آیا فرد سوسائٹی کی پیداوار ہے یا سوسائٹی افراد کو وجود بخشتی ہے۔ انیسویں صدی میں انسان پرستوں اور ترقی

پسندوں کا یہ نظریہ تھا کہ انسانی ارادے اور افکار ہی معاشرے کی تخلیق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ سوشلسٹ نیچری اور مادہ پرست کہتے ہیں کہ انسان درختوں اور جانوروں کی طرح جبر کا شکار اور مجبور محض ہے۔ آج جامعہ شناسی نے "رواں شناسی" کے لئے جگہ خالی کردی ہے۔ ایک اور نظریہ انسان کو علت و معلول کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ عوامل کی کثرت پر بھی یقین رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی رونما ہونے والا واقعہ مختلف تاریخی' اجتماعی' اقتصادی اور طبعی عوامل کا مرہون منت ہوتا ہے۔

اس بحث سے قطع نظر کہ سوسائٹی انسانی شخصیت کی پرداخت میں کس قدر دخیل ہے یا سماج خود انسان سے کس قدر اثر قبول کرتا ہے۔ ایک تیسرا عامل فرد کو بھی قرار دیا جاتا ہے فرد سے مراد شخص نہیں بلکہ شخصیت ہے یہاں اس کی روح ارادہ ہے۔ فطرت' تاریخ وراثت کے مقابل فرد اپنی تکمیل سماج ہی کے ذریعے کرتا ہے۔

انسانی ارادہ ہر دور اور ہر عہد میں مختلف مراحل طے کرتا ہے مثلاً" قبائلی معاشرے میں ایک شخص (فرد) ابتدائی مرحلے پر زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ بلکہ معاشرہ اور ماحول بحیثیت مجموعی اس کی تربیت کرتا ہے۔ یہ تربیت تاریخ' تمدن اور فرہنگ کی بھٹی میں ڈال کر کی جاتی ہے۔ اس طرح وہ خود آگہی کی دولت حاصل کرتا ہے وہ فکر کرتا ہے۔ تجزیہ کرتا ہے اور بڑے فیصلے کرتا ہے اس طرح اس کے اندر تنقیدی نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ علم اور تکنیک سے آگاہ ہوتا ہے۔ تو پھر تغیر' تکمیل اور اصلاح کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اس رابطے کو ہم انسان اور فطرت کے درمیان ایک تسلسل مانتے ہیں۔

آج کا انسان تغیر پسند ہے۔ وہ حکومت' مذہب اور زندگی کی مشکل اور اجتماعی روایات کو بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ انسان جو خود آگہی سے بہرہ مند ہو۔ وہ اپنے ماحول کو بدلنے کی سکت رکھتا ہے۔ سچا مسلمان فلسفہ جہاد پر عمل درآمد سے بنتا ہے۔ پیغمبراسلام کی حیات طیبہ مختلف مراحل میں منقسم تھی۔ مکی زندگی کے بارہ سال انسان سازی کا دور کہلا سکتا ہے جبکہ مدنی زندگی کے دس سال معاشرہ کی تشکیل سے مشابہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے جو سب سے بڑا انقلابی کارنامہ انجام دیا۔ وہ یہ ہے کہ انسان کی توقیر اور عظمت کو تمدن پر ثبت کردیا ہے۔ انہوں نے مذہب کو عشق کی طاقت سے عرفان ذات کا تصور بخشا اور ملت اسلامیہ کو سرفروشانہ استقلال کا راستہ دکھایا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مذہبی تعصبات' عبادت خانوں کے تحفظ کے لیے تشریفات و مظاہر اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کشت و خون کا بازار گرم کیا گیا۔ اس کے برعکس ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عددی اقلیت کے باوصف پیش پا افتادہ سماج کو ترقی یافتہ معاشرے میں تبدیل کردیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ انقلاب عظیم تاریخ کی کوکھ سے کیسے پیدا ہو گیا۔

اس باب میں پہلی وجہ تو مذہب کی لازوال قوت ہے جس کی تجلی دلوں کے نہاں خانوں' عبادت گھروں کے زاویوں اور دیر و حرم کے کونوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں آئی۔ اور اس قوت نے سماج کے اندر پہنچ کر اقتدار کو پالیا۔ اس نے پرانی رسموں کو گھروں اور بتوں کو قربان گاہوں نے نکال باہر کیا۔ پرانے قلعے مسمار کیے۔ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج سرنگوں کئے۔ آزادی' حریت انسان کا پھریرا لہرایا اور استغنا اور صبر کی فضیلتوں کو عام کیا۔ اسلام کی حقیقی قوت نے انسان کو یہ سکھایا کہ تزکیہ نفس معابد اور خانقاہوں کی زینت بننے میں نہیں ہے۔ تزکیہ نفس دراصل حالات و واقعات کو بدلنے اور معاشرے کی منجمد رسومات کو تہس نہس کرنے میں ہے دشمنان اسلام جو ہمارے پیغمبرؐ کو پیغمبر مسلح کہتے اور اسلام کو مذہب شمشیر قرار دیتے نہیں تھکتے۔ اس بات کے معترف ہیں کہ اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے۔

آتش کدہ فارس کے بجھنے کا کا مفہوم علامتی ہے۔ اسلام نے تین آتش کدوں کو ٹھنڈا کیا۔

(۱) ملوکیت کی آگ

(یہ آگ آذربائیجان میں گشتاسپ بادشاہ' شہزادگان فارس اور اشراف فارس کے حرص کی آگ تھی)

(۲) دھقانان کی آگ۔ یعنی فیوڈل ازم کا خاتمہ۔

(۴) زرتشتی پیشوائی کی آگ۔ یہ آگ سب سے بدتر تھی آتش مال وزر ایک طرف اور آتش مکروفریب اور جھوٹ دوسری طرف دین کے نام پر لوٹ کھسوٹ اور مکرو فریب کی آگ اسلام نے آکر ہی ٹھنڈی کی۔ جو آگ مذہب کے نام پر جلائی گئی تھی اس سے یزداں کے نام پر اہرمن کا چراغاں کیا گیا تھا۔

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

ہمارا جدید اور روشن خیال طبقہ اسلام کو آج کے تناظر میں سمجھنا چاہتا ہے اور روح عصر کے تقاضوں کے مطابق امن' آزادی' احترام انسانیت اور نسلی منافرت کے مسائل کو سمجھنا چاہتا ہے آج کے دور کے دانشور مصلحت کا بھی شکار ہوجاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ جب انسان اپنے نصب العین کا پرچار کرتا ہے تو وہ دوسروں کے نظریات کو مجروح کرتا ہے اس لئے بعض حکمائے جدید اسلام پر مصلحت اندیشی کا غلاف بھی چڑھا دیتے ہیں اور عقائد وافکار کے باب میں سے صلح کل مذہب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ لیکن میرے دوستو اسلام صلح نہیں ہے جنگ ہے دفاع اور جہاد میں فرق ہے۔دفاع کے الگ احکامات ہیں اور جہاد کے الگ اسلام حق وباطل کی جنگ کا نام ہے۔ س طرح جنگ میں نیوٹرل اور رہنا منافقت کا ساتھ دینا ہے یہ جنگ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی بقول شخصے (آدم سے آدم جی تک)

اسلام سے متعلق آخری صدی کے مصلحین کی تحاریک

چین سے خلیج فارس اور وہاں سے شمالی افریقہ تک پھیلی ان تحاریک کا سرچشمہ ادیان براھیمی ہی ہے۔ فکر اسلام محض فلسفوں کی بھول بھلیوں میں محصور نہیں یہ تاریخ اور حیات اور عوام کا مقتدر فلسفہ ہے۔ افریقہ کے نقشے کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ کس طرح فلسفہ اسلام حرکت وعمل کی راہوں پر گامزن ہے۔ شاعر اسے قطرہ اشک گرم کہتا ہے

واقعی زمین کا آنسو' دھڑکتا ہوا دل اور لہو لہان ٹکڑا ہے۔ یہ خطہ ارض ظلم کی چکی میں پستا رہا استعمار واستبداد کے پاٹوں میں کچلا گیا۔ استبداد تبلیغ اور تجارت کا لبادہ اوڑھ کر آیا۔ ترقی کے نام پر لوٹتا رہا اس نے مصنوعات کا جال بچھایا یہ لوگ تاجر بن کر آئے اور تاجدار بن کر گئے مظلوم افریقہ پر کونسا حربہ نہیں آزمایا گیا۔ یہ خرانٹ انگریز چالاک فرانسیسی کچھ جواہرات اور مصنوعی آبگینے اور الماس کے چمکتے ٹکڑے لائے انہوں نے افریقہ کے صاحب اختیار لوگوں کو تقریبات اور شادی بیاہ کی رسومات میں بطور تحفے تحائف نذر کیئے اوران کے بدلے بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ ہتھیالئے پسماندہ اقوام کے لوگ جھوٹی شان وشوکت کے دلدادہ تھے۔ جس سے روح اور فکر کی حقیقی توانائیاں چھن جاتی ہیں اس حقیقت کو ادراک کرنے کے لئے صاحب فکر اور باشعور لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ اور ضروری ہے

جتنا جتنا انسان اندر سے خالی ہوتا جاتا ہے اتنا اتنا وہ باہر ہے رنگوں میں مسحور ہو جاتا ہے افریقہ ایشیاء سے اور یورپ امریکہ سے زیادہ ان چیزوں کا شوقین ہے ہماری دیہاتی عورتیں ماڈرن عورتوں سے زیادہ زیورات کی دلدادہ اور جاہ پرست ہوتی ہیں ہماری فضیلت مآب خواتین کاسمیٹک کے رنگ وبو میں ڈوب جاتی ہیں اور اپنے آپ کو ایک بت طناز اور ایک مجسّمے کی صورت بنا لیتی ہیں ایسی مست اور مسحور کن خوشبو کی پسند ہوتی ہے کہ سارا ماحول اشک آور بن جاتاہے نتھنوں کو کھجلی ہونے لگتی ہے زیورات سے بدن بوجھل ہونے لگتا ہے زیورات کی کھنک اور خوشبو سے فضا درہم برہم ہو جاتی ہے وجود ظاہری تو گراں قدر اور قیمتی ہوجاتا ہے مگر اندرو سے روح کھوکھلی رہ جاتی ہے

امیر لوگ دولت کے زور پر سارے کھیل کھیلتے ہیں سرمایہ دار اپنی صنعت قدرت اور چالاکی سے ماحول پر چھائے رہتے ہیں روح انسانی ان محرومیوں پر پیچ و تاب کھاتی ہے جب اسے فطری اور طبعی ترقی کی راہیں نہیں ملتیں تو وہ منفی راستوں' بیمار ذہنیت اور مفاد انگیزی کے کاروبار میں مشغول ہوجاتی ہے وہ بھی نمود ونمائش کی راہ ڈھونڈتی ہے تاکہ خود بھی فریب کھائے اور دوسروں کو بھی فریب دیتی رہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ وہ بچہ

جو مجمع میں نظرانداز کردیا جائے اور وہ محسوس کرے کہ مجھے اہمیت نہیں دی جارہی تو وہ غصے ہوجاتا ہے۔ وہ اگر دیکھے کہ دوسرے ساتھی اسے بلیک آؤٹ کررہے ہیں۔ تو وہ بے قرار ہوجاتا ہے۔ جب اسے یقین ہوجاتا ہے کہ وہ فضول اور بے کار ہے اور کسی صلاحیت کا مالک نہیں تو وہ شرارت پر اتر آتا ہے۔ برہم ہوجاتا ہے اور محفل کو بھی برہم کردیتا ہے وہ کوئی قابل تعریف کارنامہ سرانجام نہ دے سکے تو وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے جس سے اسے پھٹکار ملے۔ وہ کچھ کرکے اظہار نمود چاہتا ہے اور اپنے وجود کے ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ پھر سب لوگ متوجہ ہوجاتے ہیں کہ واقعی وہ موجود ہے ہر چند کہ برا ہے پر ہے تو سہی۔ جس طرح حافظ شیراز مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے معشوق کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

طاعت از دست نیاید گناہ ای باید کرد
درد دل دوست بہ ہر حیلہ رہی باید کرد

اس مقام پر امارت اور غربت کا فرق کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ طبقاتی سماج کے سلسلے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ فیشن ایبل خواتین جواہر پاروں اور نمائش گاہوں سے اپنی توقیر بڑھانے کی سعی کرتی ہیں تاکہ تصنع کے بناوٹی پھولوں سے روحانی تنگ دامنی چھپ جائے۔ دلنواز اور دلربا خواتین سامنے آجاتی ہیں اور علم وفضل اور شعور وآگہی رکھنے والی خواتین یا تو پس منظر میں چلی جاتی ہے یا مجبوراً" اس قسم کی مصنوعی اور آرائشی چیزوں کے ذریعے اپنی نمائش کرتی ہیں اور کہتی دکھائی دیتی ہیں کہ میں بھی ہوں اے لوگو میری طرف متوجہ ہوجاؤ کہ میرا بھی وجود ہے۔ البتہ ذاتی اور روحانی کمالات سے لبریز خواتین اس قسم کی تزئین ونمائش سے بے نیاز ہوتی ہیں۔

مجھ پر تنگ نظری کا الزام نہ لگے کہ میں جدید فیشن پرست خواتین کو برداشت نہیں کرتا یا ان کو پردے میں بٹھانا چاہتا ہوں۔ یا پھر میں یورپ میں رہنے والوں کو لمبی لمبی داڑھیاں رکھنے پر مجبور کرتا ہوں۔ ایک بات تسلیم شدہ ہے کہ عریانیت اور غربت ساتھ

ساتھ جنم لیتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جدید عورت اور روایتی عورت دونوں اس وقت بیمار ہیں۔دونوں نمائش کی گرویدہ ہیں۔ شخصی حسن کو باہر کے خول میں ڈھونڈتی ہیں اور ظاہری دلکشی کے پانے کی سعی کرتی ہیں۔ جدید اور قدیم میں فرق صرف ظاہر اور آرائش کا ہے۔ وگرنہ دونوں فکری اور عقلی اعتبار سے یکساں ہیں۔

آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان تعصب اور جہالت دونوں کی زنجیروں سے آزاد ہو۔ لیکن فکری آزادی اور محض قید سے رہائی میں واضح فرق ہے۔۔ رہائی منفی پہلو ہے مگر آزادی بجائے خود وجودی معاملہ ہے رہائی ایک حالت ہے جبکہ آزادی خصلت ہے۔ انسانی کاملیت اور ارتقا کا درجہ ہے۔ جو محنت لگن اور شعور سے حاصل ہوتا ہے۔ صرف قید سے رہا ہونے والا شخص چور بھی ہوسکتا ہے اور عادی مجرم بھی لیکن ایک مرد خود آگاہ آزاد ہوتا ہے چاہے وہ جیل میں ہی کیوں نہ ہو۔ اب ملاحظہ کیجئے جدید خواتین کا حال۔ ماضی سے تو رہا ہوئی مگر کہاں گئی۔ کیا پایا اس نے روایتی زندگی سے پیچھا چھڑانے کے بعد؟ یہ ایک سازش تھی۔ اس کے ہاتھ آزاد کرکے اسے خون میں نہلا دیا گیا اور بالکل اس طرح جس طرح لومبا کو جیل سے تو رہا کیا گیا۔ مگر نام نہاد آزاد فضا میں اسے تیر ستم سے ہلاک کردیا گیا۔

کون رہا کرتا ہے اور کیوں۔ ہم صرف رہائی کو زیر بحث نہیں لاتے۔ آزادی کی پہچان یہ ہے کہ ہم آزاد ہونے کا انتخاب از خود کرتے ہیں (یا کسی مقصد کے تحت کوئی اور ہمیں آزاد کرتا ہے یہ بھی ایک طرح کی غلامی ہے)۔ انسانی عظمت اور تکریم کے اعتبار سے آزاد ہونا کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ دور جدید کی عورت روایات کے حصار سے تو نکل آئی ہے مگر انسان تکریم کے اعتبار سے قعرِ ذلت میں گر گئی ہے اس نے رہائی تو پائی مگر اس کا یہ انحراف اس کے لئے فساد اور سقوط کا باعث بن چکا ہے۔ زنجیروں کو توڑنے کے بعد وہ لبرل یا روشن خیال خاتون رہائی پاکر ذمہ دار بن جاتی ہے اور محض جدیدیت کی پرستار عورت لاابالی اور بے لگام ہوجاتی ہے۔ دور جدید کی نام نہاد لڑکی دراصل وہی پرانی مالدار عورت ہے۔ جو

ماضی میں دین کی آڑ لے کر چھپی رہی۔ اور موجودہ دور میں عریانیت کی سچائی میں نمایاں ہوگئی ہے۔ روشن فکر خاتون نے روایات کو چھوڑ کر آزادی کی نعمت کو پایا مگر اندر سے کھوکھلی رہی صرف مادیت پرست خواتین اس مقام ارفع سے محرومی کے بعد اپنی بےنصیبی کا اظہار مصنوعی انداز میں کرتی ہیں یعنی آلات' زیورات' اعضائے جسمانی اور عریانیت کے بل بوتے پر۔ روشن خیال عورت جو صحیح معنوں میں ترقی یافتہ اور باکمال عورت ہے۔ اپنے مقصد' مصرف اور شخصیت سے اپنے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ یہ خاتون تجمل پرستی کا میلان نہیں رکھتی۔

پرانی عورتیں مذہب اور تمدن کو بطور غلاف اور پناہگاہ استعمال کرتی ہیں یہ ہر دو عورتیں (یعنی روائتی اور ماڈرن) روشن فکر خاتون کے سامنے ہیچ اور حقیر ہیں کیونکہ وہ حقیقی اوصاف سے خالی ہیں ان کی ساری کوشش اس بات کے لئے ہوتی ہے کہ وہ اپنی داخلی کمیوں کو خارجی نمائش کے ذریعے پورا کریں۔

ایک دھوکہ باز اور فریبی فرانسیسی نے انیسویں صدی میں خشک دودھ ایجاد کرکے اس کے ساتھ مذہب کا پیوند لگا دیا۔ جب تازہ خشک دودھ اختراع ہوگیا تو کچھ فریب کار کچھ سیر دودھ اٹھا کر افریقہ لے گئے۔ اور کہا اے لوگو! ہمیں آپ کی غربت اور افلاس کو دور کرنے یہاں بھیجا گیا ہے۔ اب تمہیں اس ویرانی اسے نجات ملے گی۔ ہمارے پاس نبیوں سے بڑا معجزہ ہے۔ جاؤ اور پانی لاؤ اور دودھ حاصل کرو۔ پانی لایا گیا۔ تعارف اور تذکرہ کے مراحل طے ہوئے۔ اور پھر آنکھیں بچا کر خشک دودھ پانی میں حل کردیا گیا سب کو یقین آگیا کہ دودھ ہی ہے چنانچہ سب ایمان لے آئے ابھی تک دعائیں مناجات اور کلمات اس پیمبر کے لئے وقف تھیں جس کی رسالت شیر خشک کے محور پر گھومتی تھی۔ جب اچھا خاصہ اعتبار بٹھالیا۔ تو دعویٰ کیا کہ میں "باب" ہوں۔ مہدی موعود' پیغمبر کا بشیر ہوں۔ میں اٹھوں گا تو اس کا ظہور ہوگا۔ اس کے بعد واقعتاً" وہ آگیا یعنی جنرل گیوم' افریقہ کا فاتح گیوم (قیام کے مادے سے قیام اور قائم باللہ)۔ یہ کل کا افریقہ تھا جہاں استعمار خاموش بلی کی طرح

گھس گیا۔ معلوم نہ ہوا کہ کہاں سے گھسا۔ مگر اس وقت سمجھے جب ہزاروں بچے میاؤں میاؤں کر اٹھے۔ پانچ چھ نسلیں گزر گئیں سارا عالم اس سوچ میں ڈوب گیا۔ کہ افریقہ پر افریقی باشندوں کا اپنا حق حکومت بھی ہے یا نہیں؟

آج کا دن ہے کہ افریقہ کے عظیم رہنما جو موکنیاٹا' نومبا' نائیرے وغیرہ بھنا اٹھے کہ یہ نیلی آنکھوں والے جنات کہاں سے آ ٹپکے۔ جو موکنیاٹا رہبر کنیا نے کیا خوبصورت بات کہی۔ جب انگریز آئے تو ہمارے پاس علاقہ اور زمین تھی۔ اور ان کے پاس "انجیل" اب ان کے پاس زمین ہے اور ہمارے پاس "انجیل"۔

۱۸۱۲ سے ۱۸۴۱ تک یہ کشمکش زور شور سے جاری رہی۔ باہر کی نسلوں نے اس عرصے میں افریقی جنگلوں' پانیوں' سبزہ زاروں پر قبضہ جمالیا مگر بالآخر حوصلہ مندوں کی جوانمردیاں رنگ لائیں اور یورپ شکست نصیب ہوا۔ افریقہ نے یہ جنگ قومی آزادی' انسانیت' قومیت' مذہب' کلچر زبان' قومی' معاشرتی' اقتصادی اور اسلامی اقدار کے لئے لڑی اور جیت گئے۔ یہ شعلے ۱۳۵ سال تک لپکتے رہے۔ کوئی چار پانچ نسلیں آئیں اور گئیں۔ فرانسیسیوں نے اعلان کیا۔ جس طرح دریائے سین پیرس میں سے بہہ رہا ہے۔ اسی طرح بحراوقیانوس بھی فرانس میں سے گزرے گا۔ بحراوقیانوس کے اس جانب الجزائر' تیونس اور مراکش ہے اور دوسری جانب فرانس۔ اس لئے یہ پانی فرانس کے دونوں حصوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔

جب ہم افریقہ کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں۔ تو ایک بورڈ پر نظر پڑتی ہے۔ جس پر رقم ہے۔ اس مقام سے فرانس کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ جب آپ خود کو فرانسیسی سمجھیں گے تو مسئلہ حل ہوجائے گا۔ استعمار چاہتا ہے کہ افریقی بربر اور عرب جس کی وہ تحقیر کرتا ہے کو فرانسیسی نام دے کر اپنی نسل بنالے۔ بلند وبالا قوم کا فرد اور جزو مگر خود مسلمان بننے سے گریزاں ہے اگر یہ خود کو مسلمان تصور کرلیتا اور تیرہ سو سال کی پرانی تاریخ' فکر کلچر اور تمدن اور شجاعت کو سینے سے لگا لیتا۔ تو پھر کوئی طاقت اس پر غالب نہ

آتی۔ افریقی مسلمان جو جاندار روایات کے مالک تھے اس استعمار سے مغلوب نہیں ہوئے۔ انہوں نے معرکہ آرائیاں کیں۔ گو ان کی اسلامی اور فرہنگی دولت انتشار کا شکار تھی مگر ان کی بیداری کا سفر مصر میں محمد عبدہ کی آمد کے ساتھ شروع ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی توپ تفنگ نہ تھی۔ (بس علم و قلم کی تلوار تھی) اس نے شمالی افریقہ کے اہل دانش کو جھنجھوڑا۔ جو منجمد کھڑے تھے ان کے افکار میں تہلکہ پیدا کیا۔ وہ علماء جو فرسودہ عقائد کے گورکھ دھندوں میں گرفتار تھے اور ضابطہ حیات کے اصولوں سے ناواقف تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ کہ جو نظام ان کے پاس ہے اس میں حرکت وحرارت کی بجلیاں بھری ہیں محمدؒ عبدہ علمائے دانش کو یکجا کرتا ہے۔ ازکار رفتہ سوچوں کے چراغ بجھاتا ہے اور وقت اور زمانے کے مطابق قرآن کی عملی تفسیر کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

سارتر کا کہنا ہے کہ فانان کو نہ پڑھنے والا خود اپنے تعلیمی کلچر کا مقروض ہے۔ اسی طرح علی شریعتی شہید کے مطالعے سے محروم رہ جانے والا خود اپنا قرض دار ہے۔ دور جدید میں لبریشن تھیالوجی اور مزاحمتی ادب کے سقراط ڈاکٹر علی شریعتی کا مطالعہ کیجئے اور اپنا قرضہ چکائیے

قرآن کی یہ فکر جدید انیسویں صدی کے اواخر میں روشن فکر دانشوروں کے ہاں پہلی بار نمودار ہوئی۔ قرآن کو اگر صرف قرات اور تلاوت کے مقاصد کے لئے استعمال کیاجائے۔ جیسا کہ عام رواج ہے تو پھر اس کا حقیقی مفہوم اور مذہب آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ کیا قرآن استخارہ کے لئے ہے یا تبرک کے طور پر استعمال ہونے کے لئے' سر پر رکھنے' مسافرت پر جانے' توسل اور نظر اتارنے' نکاح اور عروسی کی تقریبات میں لئے جانے' امام ضامن باندھنے' عدالتوں میں استعمال ہونے' تحقیقی علمی اداروں کے اندر مفاہمت وبلاغت کا اندازہ لگانے کے لئے' فقہی اور فروعی اختلافات کی آگ لگانے کے لئے یا صنائع بدائع کے گل بوٹے کھلانے کے لئے ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

محمد عبدہ کی آمد سے قرآن کا اصلی مفہوم سامنے آیا۔ فہم دین مبین پیدا ہوا۔ عصری آگہی کا شعور جاگا سیاسی اور معاشرتی آگہی کے چراغ جلے۔ سب سے بڑھ کر خود آگہی کی راہیں متعین ہوئیں۔ افکار تازہ کے جھونکے آنے لگے۔ انقلابی سوچ نے انگڑائی لی۔ قرآن کی یہ نئی پرتیں کھلنے کے بعد ملت اسلامیہ میں روشن فکر علمائے اسلام کا طبقہ وجود میں آنے لگا۔ محمد عبدہ جمال الدین افغانی کی فکری تحریک کا ہی پرجوش شبع تھا۔ اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ شمالی افریقہ کے ذہبی حلقوں میں ایک نئے شعور آگہی کی تو پھوٹی۔ ستارہ شمالی افریقہ کے نام سے پہلی بار ایک سیاسی جماعت ابھری جس نے مسلمانوں کو فکری' عسکری اور سیاسی تسلط سے چھٹکارا دلانے کے لئے کام شروع کیا۔ اس کے بعد یہ طبقہ مختلف جماعتوں اور پارٹیوں میں منقسم ہوا۔ عملی جدوجہد کا آغاز ہوا اور پورے افریقہ کے مسلمانوں کو نجات ملی۔

فکری رہائی کے بعد افریقہ کی سیاہ فام نسل بیداری اور رہائی کے مفہوم سے آشنا ہوئی۔ اس کے بعد یورپ کا کئی سو سالہ غلامی سے آزاد ہونا مشکل نہ تھا۔ مسلمان فرنگی تہذیب کے خلاف اٹھے تو ان کی اپنی بنیادیں مضبوط کلچر اور تمدن پر استوار تھیں۔ اسلامی تہذیب واقعی مضبوط بنیاد رکھتی ہے جو تنومند بھی ہے کردار ساز بھی اور سب سے بڑھ کر یہ

کہ اندر کی دنیا کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ اسلامی فکر عیسائی زر شتی مانوی یا بدھ فکر کی طرح صرف مابعد الطبیعاتی' اخلاقی اور روحانی نہیں ہے بلکہ عملی' اجتماعی' دنیاوی' معاملاتی اور جنگی ہے۔

قرآن جہاد کی تلقین کرتا ہے۔ اس کی مثال پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ آپ عمر عزیز کو دشمنوں کے مقابلے میں ایک اسلامی معاشرے کی صحیح تشکیل کے لئے جدوجہد میں گزارتے ہیں اور ریاست مدینہ میں عملی جدوجہد کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔اسلامی تاریخ 'جہاد' حماسہ اور قدرت کی مظہر ہے۔ مسلمان کس طرح گوارا کرسکتا ہے کہ اس کا نظریہ بربادی اور بے چارگی کی تصویر بنے۔ عظمت و سربلندی کا داعی اسلام اس سلوک کا سزا وار نہیں ہے۔

سرزمین ایران میں تمباکو کی تحریک اٹھی۔ جس کے دور رس نتائج ظاہر ہوئے۔ اس کے محرک پر مرزا حسن شیرازی ہیں جو اپنے پیشوا سید جمال الدین افغانی کا پر تولئے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں یہ مسئلہ صرف تمباکو کا نہیں۔ یہ ملت ایرانیہ کو دھوئیں میں تحلیل کرنے کا ہے۔ یہ ہماری ہستی کو نیست ونابود کرنے کا ہے۔ جو کمپنیاں تہران میں اس مقصد کے لئے قائم کی گئی ہیں ان کا طول وعرض تو ناپئے۔ برج اور درو دیوار پر نگاہ کیجئے۔ تمباکو قلعوں کا متمنی نہیں ہوتا۔ یہ تو سیاسی اور فوجی اڈے ہیں۔ مرزا نے پوری ذمہ داری سے اعلان کیا۔ اسلام کی رو سے دین اور دنیا میں کوئی جدائی نہیں ہے۔(جدا دیں سیاست سے تو رہجاتی ہے چنگیزی) یہ راگ استعمار نے الاپنا شروع کیا ہے کہ مذہب کا عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اس کی لے کو اپنانا شروع کردیا ہے مرزا فتویٰ صادر کرتا ہے کہ آج سے تمباکو کی ہر شکل اور صورت امام زماں کے ساتھ جنگڑا ہوگا۔ وزیر جنگ نائب السلطنت شہزادہ کامران مرزا ملازم کو حکم دیتا ہے کہ چلم اٹھا لاؤ۔ نوکر باغی ہوجاتا ہے بیوی چلم بھرتی ہے۔ اندر سب یہ کام کرتے رہے۔ پھر ایک دن سب نے چلموں کو باہر لاکر توڑ دیا۔

گاندھی کی تحریک عدم تشدد (مقاومت منفی) کے ساتھ اسکی مشابہت بدیہی طور پر نظر آتی ہے کیونکہ اس کے تھوڑے سے عرصے کے بعد یہ تمباکو کی تحریک اٹھی۔ مگر درحقیقت یہ اس کے زیر اثر نہ تھی۔ (کچھ بھی ہو) کوئی ہتھیار اٹھانہ کسی کو للکارا گیا۔ بس لوگ چپ ہوگئے۔ لوگوں نے عدم تشدد کے ذریعے استعمار کی بیخ کنی کی۔ اور اس کی ہری بھری شاخوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ استعمار نے لاکھوں ڈالر خرچ کرکے ادارے' مارکیٹیں پیداواری مراکز' معدنیات اور حتیٰ کہ عوام تک کو خرید رکھا تھا مگر اس نے تاڑ لیا کہ سر پھرے لوگوں کا مقابلہ آسان کام نہیں۔ جو فقط ایک آواز پر لبیک کہتے ہوئے دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ گاندھی نے پھر عدم تشدد کے فلسفے کو کمپنی کے خلاف استعمال کیا اور اعلان کیاکہ بدیسی سامان اور ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کردیا جائے۔ اس نے انگریز کا ناطقہ خالی ہاتھوں سے بند کردیا اور یورپ اپنی تمام قوت کے باوجود کوچ کرنے پر مجبور ہوگیا۔

استعمار اس وقت ترقی کرتا ہے۔ جب مقامی باشندے اس کے آلہ کار بن جائیں۔ مزدور اس کے لئے محنت کریں اور عوام خریداری کے ذریعے اس کی تجوریاں بھریں۔ استعمار اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے اگر ذرا سی مقاومت کی جائے تو استعمار مٹ جاتا ہے مرگھٹ کی آگ بن کر بجھ جاتا ہے استعمار نے ایک اور چالاکی کی یعنی پہلے ہمیں اپنا ہم خیال یعنی نام نہاد ترقی پسند بنایا۔ اس کے بعد ہماری سواری شروع کردی جمہوریت کی بیداری کی تحاریک کو انیسویں صدی کے اواخر میں تلاش کرنا چاہئے۔ ہر تبدیلی کے عقب میں ذہنی اور فکری پیشواؤں کا ہاتھ ہوتا ہے پہلے دل ودماغ میں بیج بویا جاتا ہے۔ اس کے بعد جسموں کے لئے راستہ کھلتا ہے۔ افریقی مسلمان انیسویں صدی کے نصف میں اپنے ثقافتی تشخص کے جھنڈے تلے یکجا ہوکر یورپ پر پل پڑے۔ اگرچہ کچھ دیر لگی مگر برصغیر میں بھی اس عمل کو دہرایا گیا۔ یہی عہد تھا جب فکر ودانش میں انقلاب کی روح پھونکی گئی۔اس انقلاب کے داعی وہ دانشور ہیں۔ جنہوں نے اسلامی دانش کو تجدید کے عنوان سے روشناس کرایا۔ زمانے اور حالات کے تقاضوں کے برخلاف۔ جسے اقبال کی اصطلاح میں "تجدید بہ تعبیر عصر جدید" کہا

جاسکتا ہے۔ ان دانشوروں عظام نے اسلام کے بکھرے ہوئے اجزاء کو اکھٹا کرکے ارتقائے جدید کی طرف قدم بڑھائے۔ اور اسلام کی صحیح روح کو متعارف کروایا۔

ماضی کی خوبیوں کو اپنانے کی تحریک بازگشت کو رجعت پسندی نہیں کہا جاسکتا۔ مسلمان قوم وہ پہلی ملت ہے۔ جو استعماری کلچر اور تمدن کے خلاف صف آراء ہوئی۔ اس ملت نے اپنے اقداری نظام کی طرف پلٹ کر یورپی قدروں کو ٹھوکر ماردی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد افریقہ ولاطینی امریکہ میں بھی اس ثقافتی یلغار کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ امہ مسزر' علیون ودیبا' سنگور' فرانز فانان' ٹیگور' رادھا کرشن سنیات سن مغربی کلچر کو لتاڑا اور ان کے مقابلے میں اپنے فکری نظام کو پیش کیا۔ لوگوں میں اس احساس کو جگایا کہ مغربی تمدن اور فکر ہی سب کچھ نہیں ہے ہمارے اپنے ہاں ان سے بہتر فکری سرمایہ موجود ہے۔ مسلمان دانشور اور ترقی پسند علما بے خوفی کے ساتھ ان استعماری قوتوں سے ٹکرا گئے اس کے علاوہ نیریرے' سنگور وغیرہ نے بھی سیاہ فام کانگریس کے عنوان سے سیاسی جدوجہد کے عمل کو جاری رکھا اور یورپ کے نو آبادیاتی تسلط کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

یورپ کا سب سے خطرناک چہرہ امپیریلزم ہے جو انسان سے اس کی سوچ آگہی اور قومی عصبیت کو چھین لیتا ہے۔ فہم دیں کو بدل دیتا ہے اثر نفوذ بڑھاتا ہے اور اقتصادی اور فوجی امداد کا جال بچھا دیتا ہے سب سے پہلے روشن خیال مسلمان دانشوروں نے استعمار کے بھیانک چہرے پر سے پردہ سرکایا اور اس کا وہ روپ دکھایا جو دوسری اقوام کی اخلاقی وروحانی اقدار کے قلع قمع کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ ان عظیم انسانوں نے سب سے پہلے یورپی فرہنگ کا تعاقب کیا۔ الجزائر کے دانشوروں نے یہ نعرہ لگایا کہ اسلام ہمارا دین' عربی ہماری زبان اور الجزائر ہمارا وطن ہے اس کا مقصد فرانس کو یہ احساس دلانا تھا کہ ہماری ثقافت بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ فرانس الجزائر میں اس لئے آیا ہے کہ جدید کلچر لائے' اقتصادیات کے منافع حاصل کرے۔ پیداواری ذرائع پر قابض ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مقامی قوم کے تشخص کو مسخ کرے۔ تاریخ کا حلیہ بگاڑے۔ انسانی قدروں کا قتل عام کرے

اہل الجزائر کو یہ شدید احساس تھا کہ فرانس نے چال چل کر ملک کو اپنی ملکیت بنایا اور کہا کہ ہم آپ کو زبان اور کلچر کو اپنانا چاہتے ہیں مگر مقصد دراصل یہ تھا۔ کہ پورے ملک کو ہی عیسائی بنادیں۔

روشن خیالی کا مطلب سیاسی شعور اور اجتماعی آگہی حاصل کرنا ہے اور اس سے کام لے کر استعمار کے بتوں کو توڑنا ہے۔ روشن خیالی کا یہ مفہوم نہیں کہ یورپ کی مالا جپنا اور ہر وقت طوطی کی طرح رٹ لگانا ہے افریقی روشن ضمیری اس بات کی تہہ تک پہنچ چکی ہے کہ استعمار کے فکری نظام کو ختم کیا جائے۔

نائیریرے افریقہ کا ہوشمند مفکر ہے۔ اس نے کیمبرج میں تعلیم پائی۔ اسے انگریزی پر قدرت حاصل تھی لیکن اس کی قوم اور ساحلی علاقوں میں آباد لوگوں کی زبان ساحلی ہے چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ گو سواحلی نیم ترقی یافتہ اور زوال آمادہ زبان ہے مگر ہم اسے آج سے سکولوں' کالجوں' دفتروں اور مجلسوں میں رائج کرتے ہیں اس میں سیاسی' تحقیقی اور علمی کام ہوگا اور تبادلہ افکار بھی۔ یہ اس ترقی پسند شخص کی دین ہے وہ ایک انقلابی تھا۔ تیسری دنیا کے انقلابیوں نے اس کے بعد اس کے قدم پر چل کر سب سے پہلے اپنی زبان کو متعارف کرایا۔ اور تمام مغربی اقدار کے قلعے کو ڈھاکر اپنی دانش اور اقدار کی طرف رجوع کیا۔

ہمارے حقیقی راہنماؤں نے مذہبی' روحانی اور علمی زبان میں عوام کو سمجھایا۔ اور کہا کہ یورپ صرف اس لئے نہیں آیا کہ ہمارے مال ومتاع' سونا چاندی' تیل' کپاس' ریشم' یا معدنی وسائل کو لوٹ لے بلکہ اس کا اصلی ٹارگٹ انسانی سرمایہ افکار یعنی علمی ثروت' اخلاقی عظمت' روایات' مذہب وروح اور تاریخ و شخصیت جو ہمارے قومی وجود کے عناصر ترکیبی ہیں۔ ان پر شبخون مارے' یہ کوئی سطحی یا سرسری مقصد لے کر نہیں آئے تھے۔ بلکہ ایک خاص مقصد اور آئیڈیالوجی کو لے کر نبرد آزما ہوئے تھے۔ ان کے مقابلے پر پھر اقبال جیسا دانشور آیا۔

اقبال ایشیاء افریقہ کے علمی میدانوں میں یکہ وتنہا قوم پرست بن کے سامنے آیا

ہے۔ وہ تہذیب مغرب کو دعوت مبارزت دیتا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ مغربی اقتصادیات اور سیاسیات کے شکنجے سے اپنے قومی وجود کو چھڑائے۔ وہ ایک مشرقی اور مفکر راہبر کی طرح مغرب کی ہر شے پر دھاوا بولتا ہے۔ وہ کسی قیدی کی طرح صرف سیاسی رہائی کا طلبگار نہیں ہے۔ بلکہ وہ مغرب کے انسان دشمن تمدن ثقافت اور علمی نظام سے دستکاری چاہتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں استعمار دشمنی محدود سیاسی اور ہنگامی منافع پروری کے لئے نہیں ہوتی بلکہ یہ آئیڈیالوجی کا تصادم بن کر سامنے آتی ہے یہ دو نظاموں کا ٹکراؤ ہے۔ آج کے مفکروں مثلاً" اوزغان' کاتب یاسین' امہ سزر' علیہون دیپ' نیریرے' سنگور نے اس حقیقت کو پالیا ہے۔ ہمارے روشن فکر دانشوروں نے ان کے افکار سے حرارت حاصل کی ہے۔ اس فکر کی بنیادیں سید جمال الدین افغانی' کواکبی اور اقبال نے رکھی تھی۔ یہ لوگ ہمارے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ انہی کو تاڑتے بھی ہیں اسلامی فکرودانش نے سامراجی قوتوں کے ہاتھوں دوسری اقوام ومذاہب کے مقابلے میں زیادہ نقصان اٹھایا ہے بلکہ ہر مسلک ومکتب سے زیادہ سامراجی تسلط کا مقابلہ کیا ہے۔

الجزائر کی جنگ کے دنوں میں میں فرانس میں تھا۔ الیف ایل این کے ساتھ براہ راست رابطہ تھا۔ آزادی پسندوں کے مسائل سے آگاہ تھا۔ انقلاب کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ اور مفکرین سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ مختلف احتجاجی اور سیاسی جلسے جلوسوں میں بھی شرکت کرتا تھا۔ لاکھوں لوگ اس قومی جدوجہد میں شریک تھے سات سال کی انتھک محنت کے بعد یہ جنگ حریت پسندوں نے جیت لی۔ میں نے یہ دیکھا کہ مذہبی عناصر پر مشتمل حریت پسند گروہ ناراض ہوکر ترقی پسندوں کو ہدف ملامت بناتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جدوجہد ساری قوم اور طبقوں نے مل کر کی ہے۔ جبکہ پارلیمنٹ میں جو لوگ آئے ہیں۔ وہ بالکل کافر اور بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں پارلیمان نے ایک قرار داد کے ذریعے ریاست کے بنیادی اصول جمہوریت' آزادی اور لبرزم متعین کئے یعنی سیکولر سوچ کو اپنایا گیا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر ریاست اور حکومت کسی خاص مذہب کے پیروکار ہونے کا دعویدار ہوگی تو وہ رجعت پسند

ملائے گی۔

ریاست کا کام سب فرقوں اور جماعتوں کا یکساں احترام کرنا ہے۔ اگر سرکار خود ب خاص نکتہ نظر کی حامی بن جائے تو اس سے جمہوری اصولوں کی نفی ہوتی ہے۔ ان شلسٹ حریت پسندوں نے ریاست کا نام اسلامک سوشلسٹ ری پبلک رکھا۔ انتہا پسند یں باند والوں نے بھی جنگ آزادی پامردی سے لڑی تھی۔(مگر جدیدیت کے حامی لوگ کافی سوں میں لفظوں کی بندوقیں چلا رہے ہوتے ہیں) یہ طلبہ تھے۔ جنہوں نے ۱۹۵۴ء میں نظیم آزادی کی دعوت پر کلاسوں کو ترک کرکے اور نگار خانوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لی تھی۔ کتابوں کی جگہ ہتھیار اٹھا لئے تھے اور فرانس کے خلاف عملی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ طلبہ وہی تھے جنہوں نے صحیح سوشلسٹ نظریات کی گود میں پرورش پائی تھی۔ ان کا تعلق نجمن دانش جویان مسلمان الجزائری تنظیم سے رہا تھا۔ مجلس قانون ساز میں انہی سرپھرے وشلسٹوں نے قرار داد منظور کروائی کہ الجزائر ریاست اسلامی معاشرے کا حصہ ہے اسلام ں شراب بالکل حرام ہے اس لئے اسے بند کیا جائے۔ صرف کچھ غیر ملکی ہوٹلوں میں غیر لکیوں کے لئے اجازت ہونی چاہئے۔ اس سے قبل استعمار نے نو آبادیات میں زراعت کو بھی مشرف بہ شراب کردیا تھا اور صرف ایک فصل "یک کشتہ کردن" کا رواج عام کیا تھا۔ س پالیسی کے تحت مصر کو روئی ویٹنام کو کاٹوچو کا علاقہ قرار دیا۔ تو کسی جگہ صرف زیرہ اگانے کو حاصل زراعت گردانا۔ اس مونو کلچر(MONO CULTURE) کے ذریعے زیر تسلط علاقوں کے کھیتوں اور کھلیانوں کو بھی اپنا تابع مہمل بنادیتے ہیں اسی کلچر کے تحت الجزائر کی تمام زمینوں کو انگورستان میں تبدیل کردیا گیا۔یعنی الجزائر کی قسمت میں فرانس کو نشہ فراہم کرنا لکھا گیا۔

الجزائر کے لوگ شراب نہیں پیتے۔ اس کو حرام سمجھتے ہیں۔ مگر شراب ان کا سب سے بڑا ذریعہ معاش ہوگئی۔ چنانچہ سرپھرے سرفروش سوشلسٹوں نے حکومت کو منع کیا کہ اس کاروبار کو بند اور انگوروں کے شجے کو ملیامیٹ کردے۔ اور ہر قسم کی فصلوں کو اگانے کی

اجازت دے۔ اس کام کا بیڑہ ان لوگوں نے اٹھایا۔ جو معروف معنوں میں مذہبی لوگ نہ گردانے جاتے تھے۔ یہ استعمار شکن روشن خیال لوگ تھے۔ اس وقت فضیلت ومقد ماب رجعت پسند کہاں تھے۔ ایسے موقعوں پر سرپھرے ہی کام آتے ہیں جنہوں نے سر پر رکھ کر شراب کو اپنی سرزمین پر ممنوع قرار دیا۔انہوں نے اسلام کا پرچم لہرایا۔ یہ اسلامی شعور رکھتے تھے۔ وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ روائتی ملا نہیں تھے اور قومی اور جمہوریت کے علمبردار (عام مسلمان) تھے۔ علمائے کرام ہماری باتوں کو ہمارے لباس کی تراخراش کی وجہ سے اہمیت نہیں دیتے اور صرف ایک بالشت ریش کی وجہ سے ہمیں معیوب گردان کر دائرہ کفر میں داخل کرتے ہیں

وہ یہ نہیں سوچتے کہ اسلام ایک بھرپور حیات آفریں اور شعور وادراک سے معمو دین فطرت ہے۔ اگر اس کی صحیح روح کو اجاگر کردیا جائے تو پھر دیکھیں کہ ہم کس طر انسانی تحریک، روحانی حرمت اور اخلاقی بالیدگی کا پرچم لہراتے ہیں۔ ہم مغربی ہنگامہ آرائی ا غوغا گیری کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مسلمان قوت ایمانی سے کام لے کر کس طرح آگے بڑھ ہیں۔ اسلام ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ۔ کہ ہم ایک دنیا کو اسلام کا اصلی چہرہ دکھائیں مگر رونمائی کا کام اس قدر الجھ گیا ہے اور اصل اسلام میں اس قدر ملاوٹ آگئی ہے کہ اس کا اصلی روپ پہچاننا مشکل ہوگیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملاوٹ شدہ نسخے کو ہٹا کر صحیح منزل کی طرف مسلمانوں کی راہنمائی کریں اور یہ بتائیں کہ راہ ایں وچاہ آن (یہ راستہ ہے اور وہ کھڈ ہے) ہم اس کام کو مشکل کہہ کر جان نہیں چھڑا سکتے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلام فکر ارجمند کا حامل ہے اور ترقی کی طرف لے جانے والا مذہب ہے۔ تو اسے راہ پرگامزن ہوجانا چاہئے یہ صرف میری رائے نہیں ہے یہ ایک حقیقت ہے جس کا جھٹلانا آسان نہیں ہے لیکن اس کو ٹھکرایا جارہا ہے۔ قبول نہیں کیا جارہا اس خیال سے کہ آج کے معاشرے میں اس کا نفاذ مشکل بھی اور طول طویل پراسس کا طلبگار ہے۔ ہم اغیار کے پیروکار اس لئے بن رہے ہیں کہ یہ ہمیں آسان

ر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے بیسویں صدی لادینیت سے عبارت ہے۔ لیکن اس سیکولرزم سے
ی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ معاشرے کی اصلاح ممکن ہے اور ہمہ گیر انقلاب برپا ہوسکتا
(عجیب معاملہ اور حیرت کی بات ہے۔ کیا اشتباہ اور غلطی ہے۔ بیسویں صدی کا مجھ سے
تعلق ؟)

ہمارے روشن خیال حضرات زمان تقویمی کو زمان اجتماعی کے برابر سمجھتے ہیں۔ تقویم
رو سے جو انسان اس وقت زندہ ہیں ہم عصر ہیں۔ بیسویں صدی میں زندہ ہیں مگر تمام
ا صدی میں زندہ نہیں ہیں۔ سب سے پہلے اصلی روشن خیال لوگوں پر لازم ہے کہ وہ
ہ اجتماعی کو تبدیل کریں اس میں ہر نوعی انقلاب بپا کریں اور اس بات کا تعین کریں کہ
ماعی نے تاریخ کے کس مرحلے اور کس زمانے میں زندگی گزارنی ہے۔ ہمارے عہد میں
ں سے سماج ایسے ہیں جو اس صدی میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ وہ اب تک زمانہ قبل از
یخ ہی میں زندگی گزار رہے ہیں یہ ہماری سادہ لوحی ہوگی کہ اگر ہم اس کے برعکس تصور
یں۔

جس سماج میں جاگیر دارانہ نظام موجود ہو وہاں جہالت ہوگی۔ علم اور قانون کی
بت ثانوی ہوگی ایرانی دانشور جانتے ہیں کہ انیسویں صدی ہیگل، نیطشے، مارکس، اینگلز،
یلزم کے ارتقا کی صدی تھی۔ سترھویں صدی انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کی صدی
۔ اسی صدی میں روشن خیالی کی تحریک اٹھی۔ چودھویں اور پندررھویں صدی میں یورپی
ثانیہ ہوتی ہے۔ گلیلو اور کوپرنیکس سائنس کی دنیا میں تلاطم برپاکرتے ہیں جبر و جمود
ظلم واستحصال کا خاتمہ ہورہا تھا۔ آمریت اور کے متعلقہ افکار وعقائد ڈھے رہے تھے
پی جاگیرداری نظام زوال پذیر ہورہا تھا۔ موروثی نوابوں، خوانین اور بیگوں کی حکومت
ل ہورہی تھی جب مغرب میں ہیگل، نطشے مارکس، سرگرم عمل تھے کیپٹلزم، سوشلزم،
لابی آئیڈیالوجی فلسفہ تاریخ اور محنت کشوں کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس وقت ایران
مرزا بہاؤ اللہ اور باب شیرازی کی تحریریں پڑھی اور پڑھائی جارہی تھیں۔ الفاظ کے معنا

بازار گلے ہوگئے تھے۔ فروعی اختلافات کی آگ جل رہی تھی۔ فرقے اور مذہبی مناظر
عروج پر تھے۔ امام کے متعلق ظہور اور پیغمبر بازی کی داستانیں رقم ہورہی تھیں۔ عالم
قلیائی کی توضیحات اور تشریحات میں عقل اور علم کی گھسائی ہورہی تھی۔ سترھویں صدی
مذہبی اور قومی تحریک جو صفوی عہد میں بپا تھی۔ اگر اس کو ہم صدی بہ صدی پیچھے
جائیں۔ تو انسان کی حقیقی روشن خیال اور فکری اصلیت تک پہنچ جائیں۔ اس وقت یورپ
جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ہماری فکر پر اس وقت جمود یا اندھیرا نہ تھا
حریت فکر، علمی سربلندی اور عقلی آزادی کا عہد کہلا سکتا ہے (تیسری، چھٹی اور ساتو
صدی ہجری)

سماجی تاریخ اس فرد کے عنوان سے جو اس سماج سے وابستہ ہے مغربی سماج
تاریخ کے حساب سے ترقی معکوس کہلاسکتی ہے وہ قرون وسطیٰ کی تاریکیوں سے پیچھا چ
کے تمدن اور فکر کے سنہری دور میں داخل ہوگیا ہے عقل سائنس، تحقیق کے اوج کی طر
رواں ہوچکا ہے جبکہ ہم اپنے سنہری عہد سے اتر کر زوال آمادہ ہوگئے ہیں اور جہالت
تاریکیاں اب ہماری قسمت میں لکھی جاچکی ہیں۔ میں بیسویں صدی کے سماج میں رہنے
انسان ہوں مجھ ایسے روشن فکر انسان کو اس صدی کا تجزیہ کرنا ہے میں نہ تو جرمنی
انیسویں صدی میں ہوں۔ نہ ہی بیسویں صدی کے فرانس میں اور نہ ہی پندرھویں صدی
اٹلی میں سانسیں لے رہا ہوں۔ میں تہران، مشہد اصفہان، تبریز، قم اور خوزستان میں
ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے یہی میری زندگی کا اصلی روپ ہے میں ایک حقیقت پسند ہوں
مجھے اپنے اجتماعی مسائل کا احساس ہے مجھے ان کو حل کرنا ہے یہ مسائل دانشوروں کی طر
صوفے پر بیٹھ کر یا کتابوں کے متن کے حوالے نہیں بلکہ جیتے جاتے انسانوں کے چہرے پ
کر حل کرنا ہوں گے مذہبی فکر میں میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں مذہب کی کس توجیح کو اپناؤں
ہمارے بہت سے روشن خیال حضرات چونکہ خود بھی مذہب کے خلاف ہیں۔ معاشرتی ا
سیاسی معاملہ میں سماج کو ہی مذہب کا مخالف سمجھتے ہیں۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری قوم کی اجتماعی روح مذہبی ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی تو وہ استعمار اور اس کے متعلقین پر بھروسہ کرتے ہیں اور کبھی ان کے خلاف شدت سے برسرپیکار ہوجاتے ہیں فرنگی استعمار پسندوں نے قرآن کے بارے میں کہا کہ اگر یہ کتاب درمیان میں نہ ہوتی تو ہم مسلمانوں کے دلوں کو کب کا پھیر چکے ہوتے۔ مسلمان ان فیض کے سرچشموں سے سیراب ہوکر اپنی تحریک کا آغاز کریں اسلام معاشرتی سیاسی اور غیرطبقاتی سوچ کا حامل ضابطہ حیات ہے۔ وہ دینوی بصیرت بھی رکھتا ہے۔ اور جدوجہد کا پرچم بھی ہے۔ ہمارے سماج میں اسلام عوام کا مذہب ہے اور یہی طاقت کا سرچشمہ بھی ہے۔ یہ تاریخ ہے۔ فرہنگ ہے ملت کا ذات کا" یہ کردار ساز' خوش بخت' آگہی بخش' اور عدل وانصاف کا داعی ہے۔ ظلم کے خلاف اور تکریم آدمیت کا علمبردار ہے۔ اگر ہم روشن خیال مسلمان اس علم' حیات اور سرشاری کے سرمائے کو کام میں لائیں اور عوام کی قوت کو یکجا کریں اور ان کے دلوں کی حرارت کو فعال بنائیں تو روشن خیال ہونے کا قرض بھی ادا ہوجائے اور خدمت رسالت کا فریضہ بھی پورا ہوجائے۔

تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے کس طرح طبقاتی سماج اور سرمایہ داری کے خلاف تحریک شروع کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہی قوت' فریب' جہل اور مذہب کی غلط تفسیر کے خلاف استعمال کی اور آزادی' حریت' جدوجہد اور انصاف کا درس دیا۔ انقلابی احساس جدید روشن خیال لوگوں کو حقیقی معنوں میں اندر سے ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ مگر ہم کو رسمی اور ازدواجی سوچوں کے بت کدوں سے نکلنا پڑے گا۔ ان باتوں کو چھوڑنا پڑے گا جن پر ہم آج تک مناظرے کرتے چلے آرہے ہیں۔ مثلاً" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیشاب پاک ہے یا ناپاک۔ یا پھر جب داستان آرش کمان گیر کو شروع کرتے ہیں کہ جب اس نے تیر پھینکا تو ایران کی سرزمین سے نکلا اور غائب ہوگیا۔ رستم زماں سیمرغ' دیوسفید' ہفت خواں کی داستانیں اب تک بیان ہورہی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو ختم کرکے روح جہاد اور قومی بیداری کا درس شروع کیا جائے۔

کیا ہم ظلم کے خلاف جنگ برپا کرکے ابوذر غفاریؓ جیسے لوگ پیدا کرسکتے ہیں کیا ہم حضرت علیؓ جیسی انصاف پسندی جوانمردی لاسکتے ہیں۔ یا حضرت زینبؓ جیسی حریت واستقلال اور جگرداری پیدا کرسکتے ہیں۔ کیاہم ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا درس دے سکتے ہیں۔ میں اساطیر کی قدر وقیمت کا منکر نہیں ہوں۔ لیکن مقصد یہ ہے کہ جب آپ اساطیرالاولین اور ازکار رفتہ افسانوں' توہمات اور ماضی میں مدفون حکایتوں سے پنڈا چھڑاتے ہیں تو زمین پر بیداری خودی' معاشرتی آگہی کاشعور پیدا ہوتا ہے۔ اس بارے میں تاریخ کافیصلہ بڑا روشن' دو ٹوک اور غیر مبہم ہے۔ مگر عوام توہمات کے کارن اس سے منکر ہیں ہم سبکو سعی کرنی چاہئے کہ ہم اس زور آور اور جرات آزما حقیقت کو متعارف کروائیں۔

ہم حق وباطل کو فلسفیانہ انداز میں ایک نہیں سمجھتے۔مذہب صلیب اور مذہب اسلام میں بڑا فرق ہے۔ ہمارا مذہب جہاد اور جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہم نے صرف اسقدر کرنا ہے کہ اس منجمد مذہب میں حرارت ڈال کر اسے رواں کرنا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ جھوٹا استعمار تو ہمارے ملکوں میں آکر کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ اور ہمارا سچا نظام کامران نہیں ہوتا۔ کیا ہم اس طریقہ واردات کو نہیں اپناسکتے۔ ان راستوں سے داخل نہیں ہوسکتے جن سے استعمار ہمارے گھروں میں داخل ہوا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم نے اپنے ہتھیار اپنے ہی خلاف استعمال کرڈالے۔ جہاد جو دشمن کے خلاف تھا اسے بدھ مت اور عیسائیت کی طرح خود ملامتی پر صرف کردیا۔ جو باہر کے لئے تھا اسے اندر لے گئے۔ حتیٰ کہ امام حسین کی قربانیوں' ایثار پیشگی اور خون گرم کو منجمد کردیا۔روشن خیال لوگوں کو سوچنا ہے کہ استعمار' استبداد اور رجعت پسندی کے تینوں عوام دشمن ہتھیاروں کو کس طرح عوام دوست بنایا جاسکتا ہے۔ یہ ہتھیار ہم نے دشمنوں کے ہاتھوں سے لے کر دوست کے ہاتھ میں دینا ہے۔

مذہب اسلام کو سب سے زیادہ نقصان فریبی' مکار' رجعت پسند اور بدکردار عناصر نے پہنچایا ہے۔ ان کا منشا یہ ہے کہ لوگ دین سے بہرمند نہ ہوں۔ یہ لوگ دھوکا اس لئے دے لیتے ہیں کہ یہ دین کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی کے روشن خیال افراد ان

حقیقتوں کو جانتے ہیں۔ کہ اولاً ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر اسلام سے دور نہیں ہٹ سکتا۔ ثانیاً اسلام ایک سعی پیہم اور مسلسل جدوجہد کا قوت مند مذہب ہے۔ اگر انقلاب ان دو سطحوں سے بپا کیا جائے تو کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔بیداری آگہی اور معاشرتی بہبود عوامی فکر کے سلسلے ہی ہیں۔

جمال الدین افغانی کی مثال ملاحظہ کیجئے۔ ایک گمنام' دیہاتی سا مسلمان ہمدان کے شہراسد آباد سے وارد ہوتا ہے۔ کسی جماعت یا گروہ سے وابستہ بھی نہیں۔ کسی بڑے خاندان' پارٹی' تنظیم کا تعلق وپیوند بھی نہیں رکھتا۔ فٹ بال کی طرح کبھی ایک تو کبھی دوسری سرزمین کو پھینکا جاتا ہے۔ وہ بھی ایسے دور میں جب استعمار مغرب کی حکومت واقتدار بام عروج پر ہے۔ اور مشرق ابھی خواب غفلت میں پڑا ہے۔ناصرالدین شاہ جیسے لوگ حکومت کررہے ہیں۔ یہ شخص اٹھتا ہے۔ اور تنہا داد فریاد کرتا ہے۔ صور اسرافیل پھونکتا ہے۔ مسلمان قبروں سے کفن پھاڑ کر نکل آتے ہیں۔اور شہر خموشاں گونج اٹھتا ہے۔ یہ قدرت اور تاثیر کیسے پیدا ہوئی۔ کہ فرد واحد کی للکار قلب وجگر میں اتر گئی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک احاطہ کرگئی۔ یہ آواز دوست تھی۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ یہ آواز اجنبی ہے۔ نہ کسی اجنبی آواز کا چربہ۔ یہ وہی صدائے دلنشین ہے۔ جو ہمارے سفر کے آغاز میں حرا' مکہ' مدینہ' احد' قادسیہ' بیت المقدس' جبل الطارق اور صلیبی معرکوں میں ہمارے کانوں میں پڑی تھی۔ وہی پکار' وہی دعوت حیات بخش جو جہاد کا درس دیتی ہے۔جو قدرت اور توقیر سے ہم آہنگ ہے۔ جو تاریخ اسلام کے ماتھے کا جھومر ہے یہ یادگار آواز جو مسلمانوں کے فکراحساس کا سرمایہ ہے۔ اس لئے جس نے سنی اپنے قلب میں اتارلی۔ یہ آواز روشن خیالی کی صدا ہے۔ جو تاریخ' علم اور زبان کا احساس وادراک رکھتی ہے۔

ہمارا فلسفہ حیات داخلیت کا نہیں فرد کی انفرادی نجات کا نہیں سعی پیہم اور جہد مسلسل کا ہے اسلام کا تصور انصاف انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ آخرت کا تصور سب مذاہب کا مشن ہے۔ لیکن اسلام میں آخرت اس زندگی کا عکس ہے۔ اور جزائے دنیا آخرت کے

تصور سے منسلک ہے۔ اسلام کی رو سے آخرت کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ وہ اس دنیا کی علت و معلول کا درجہ رکھتی ہے۔ (اگر یہ ہے تو وہ بھی ہے)

اقتصاد حقیقت کبریٰ ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ معاد اس معاشرہ کی ہے کہ جو معاش رکھتا ہے۔ ابوذر غفاریؓ کا قول ہے کہ جو روٹی حاصل نہیں کرسکتا۔ اسے ننگی تلوار لے کر حملہ آور ہوجانا چاہئے۔ کیونکہ وہ ماحول و معاشرہ اس کی گداگری اور غربت کے ذمہ دار ہیں۔ اسلام "الناس" "THE PEOPLE" کا مذہب ہے صرف اشراف اور طبقہ بالا کا نہیں۔ مراعات یافتہ طبقے سے اس کا ازلی بیر ہے۔ ملا' صوفیا' روحانی پیشواؤں' پیروں اور دوسرے اعلیٰ طبقات سے اس کا تصادم یقینی ہے۔ اسلام کا مقصد وحید مساوات انسانی کا قیام ہے ایک ایسا عادلانہ نظام جس میں کوئی کسی سے کم تر نہ ہو لیقوم الناس بالقسط اسلام کا فلسفہ اساسی ہے۔ جو مظلوم عوام کی طاقت' بے سہارا اور کمزور عوام کی سربلندی میں یقین رکھتا ہے۔

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمه ونجعلهم الوارثین (سورہ القصص) کا منشور حقانی اسلام کے ماتھے پر جھومر ہے جن ہستیوں نے جنگ کے میدانوں اور جیل کی کوٹھریوں میں جانیں دی ہوں۔ ان کے دین اور ان مذہبی راہنماؤں کے ادیان میں فرق ہے۔ جو معبدوں اور غاروں میں ذکر و اذکار کرتے اللہ کو پیارے ہوئے۔ افسوس کہ ان باتوں کو ہمارے روشن خیال لوگ سمجھتے ہیں نہ بہت سے مذہبی راہنما۔ پیغمبر کا فرمان ہے کہ جو آدمی مادی زندگی نہیں رکھتا وہ اخروی عالم بھی نہیں رکھتا۔

ارشاد گرامی ہوتا ہے۔ ہمسایہ کا افلاس کفر ہے۔ ابوذرؓ کا کہنا ہے کہ جب فقر (عسرت) ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے تو دوسرے دروازے سے دین رخصت ہوجاتا ہے۔ بھوک اور فقر دین کو کمزور کرتے ہیں۔

سعدی کہتے ہیں کہ اندرون از طعام خالی دار۔ معلوم نہیں خالی پیٹ سے کیا کچھ برآمد ہو جائے۔ اقبال کی عظمت اسلام کی بصیرت پر استوار ہوتی ہے اس نے مغربی افکار کلچر تمدن کے ہر پہلو کو بڑے غور و خوض سے دیکھا۔ مغرب زندگی سے نجات کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے مغرب کی حقیقت کو پہچانا جائے۔ افرنگ زدہ طبقے جو مغربی اطوار و افکار اپناتے ہیں۔ ان کو معلوم ہی ہیں کہ مغرب ہے کیا۔ اقبال نے مغربی علوم میں انتہائی دسترس حاصل کی اور علوم جدید کی تکنیک سے کماحقہ واقفیت حاصل کی۔ اقبال ایران اور ایرانی فکر سے بھی آگاہ تھا۔ اس نے اس کی ادبی لطافتوں اور علمی فضیلتوں کو اخذ کیا۔ اس سے ہٹ کر اس کا سرمایہ فکر ملت کی متاع عزیز ہے۔ جس کی پوری ہیت احساس کی شدت علوئے تخیل پاکیزگی افکار اور روحانی بالیدگی سے مملو ہے۔

اقبال نے برصغیر ہند میں اس روحانی اور معنوی سرمایے عرفان اور فیضان کو دوبارہ تجدید دے کر یکجا کیا۔ قوت حاصل کی۔ اقبال نے نہ صرف اسلامی نظام کو جو تاریخ کی گزر گا ہوں۔ سیاسی مکاریوں فلسفیانہ چالاکیوں اور دیگر حربوں سے ٹکڑے ٹکڑے سے ہو گیا تھا۔ اور جس کے ہر ٹکڑے پر الگ الگ گروہ قابض تھا یکجا کیا۔ تالیف کیا اور تجدید کا فریضہ ادا کیا۔ اس کی شاہکار تصنیف تو تشکیل الٰہیات جدید ہے مگر اس کا اس سے بھی بڑھ کر کارنامہ اپنی شخصیت کی تکمیل اور تزئیں ہے۔ ایک شخصیت میں تمام ٹکڑوں کا اجتماع۔ اور ایک جدید انسان اور عام مسلمان کی تعمیر جدید چنانچہ اقبال ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔ جو خداساختہ کے ساتھ خود ساختہ بھی ہے اور خود ساختگی دل پذیر معنوں میں ہے۔

اقبال ایک انقلابی مسلمان تھا۔ ہندوستان کا باشندہ تھا۔ فلسفے کا ڈاکٹر لندن کا پڑھا ہوا جوان فرنگی مآب برصغیر کا فارسی گو شاعر جواں روشن فکر استعمار دشمن ایک نو آبادیاتی سلطنت میں رہنے بسنے کے باوجود منقلب ہو جاتا ہے۔ ایک "مسلمان عام اور بیسویں صدی کا "علی گونہ ای" بن جاتا ہے۔

یہ علی گونہ کیا معنی رکھتا ہے۔ یعنی ایسا انسان جس میں وہ تمام انسانی تضادات و العباد

جمع ہو جاتے ہیں جو معمولاً ایک شخص میں نہیں سما سکتے۔ مشکل ہے اگر اقبال کا ہمسر دوسرا لائیں۔ اقبال نے یورپ سے جدید عمیق تفلسف اور منطقی تبحر حاصل کیا۔ اپنے ہندوستان نہاد ہونے کے ناطے ذاتی اور قومی فطرت کے ساتھ روح شرق کو ملایا۔ اسلامی ایران سے حرکت و حرارت۔ مولانا روم سے عشق و مستی دیوان شمس سے معرفت واردات عربی زبان سے فرہنگ ادب کی سوغات پائی چنانچہ اسلام کی وسیع شناخت جو اس کے اسلامی اور تاریخی فلسفہ کا حصہ تھا اسے حاصل ہوئی۔ اقبال نے تحولات فکری سے فیض پایا۔ اپنی قرآن فہمی اور کتاب ربانی کے اسلوب سے آشنائی کے سبب فلسفہ خودی کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔ اس تناظر میں کائنات اور عصر حاضر کے فلسفے کی گہرائیوں سے باخبر اقبال کے روپ میں ایک مسلم دانشور منصہ شہود پر طلوع ہوتا ہے اور تیسری دنیا کے گرے پڑے اقتصادی معاشرتی تنزل میں گرفتار پریشان حال مسلمانوں کو سہارا دیتا ہے۔ یاس انگیز رویوں اور متذبذب اعتقادات کی بھول بھلیوں میں مقید انسانوں کو قوت اور حرارت ایمانی عطا کرتا ہے۔ ان کے سوالوں کے جوابات فراہم کرتا ہے۔

ہم اقبال کے فلسفہ اسلام کا دو جہات یعنی عرفانی اور صوفیانہ سے ادراک کر سکتے ہیں۔ اقبال اسلام شناس ہے۔ بعض دانشور جو اسلام کو محض مذہب (مجموعہ عبادات) کے عنوان سے جانتے ہیں وہ حقیقی اسلام کی شناخت سے آگاہ نہیں۔ اسلام کو مروجہ رسومات کے چوکھٹے میں فٹ کرنے والے بھی اسلام کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ ان لوگوں کا اسلام محرابوں اور رسالوں میں مقید ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک اسلام کو ماننے والے کچھ تو پارسا کہلاتے ہیں اور کچھ دوسرے کافر۔ لیکن وہ لوگ بھی پارسائی کے دعویدار ہیں۔ جب تک ادارہ اسلام کو اچھی طرح سمجھ نہ پائیں۔ اس کے بارے میں کوئی فیصلے نہ صادر کریں۔ وہ حضرات جو مذہب کے بارے میں غور اور اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنے لباس سامان آرائش رقص اور دوسرے اسباب خانگی کی طروح مغربی طرز پر فیشن نہیں کر سکتے۔ وہ بھی جدیدیت اور روشن خیالی سے دور ہیں اور ان کے لئے بھی جو موروثی اور مذہبی

نہیں ہیں اور نہ ہی روایتی مذہب کے ترجموں اور چربوں کی نقالی کرتے ہیں۔ آخر کار حقیقی روشن خیال دانشور (اقبال جیسے) جو اپنے معاشرے عوام اور فکر کو جانتے ہیں۔ میدان میں اترتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اپنی قوم کے سینوں میں راستہ بنا سکتے ہیں۔ یہ تاریخ ساز شخصیتیں جو اسلام کی گود میں آنکھ کھولتی اور ترقی کرتی ہیں خود شناسی کو اپنی پہلی منزل قرار دیتے ہیں۔

اقبال ایک مصلح اور انقلابی تھا اونچے پائے کا۔ مغرب کے مذہبی مصلحوں کی تاثیر سے واقف تھا۔ مارٹن لوتھر اور کالون جیسے ریفارمرز کی اہمیت سے کون آگاہ نہیں۔ انہوں نے مسیحی مذہب کو انجماد اور انحطاط سے نکالا۔ اگر ہم ان عیسائی مصلحین کے کارناموں پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ جدید یورپ کہاں تک اپنے تمدن اور بیداری کے لئے ان لوگوں کا مرہون منت ہے۔ ہم ان احوال سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہماری حالت بھی ایسے ہی مصلحین کی مرہون منت ہے۔ ایسے مصلحین جو ایک طرف اسلام سے پوری طرح واقف ہوں۔ تو دوسری طرف عصری درد اور شعور رکھتے ہیں۔ اور اس حقیت سے بھی آگاہ کہ کیا لینا ہے اور کیا چھوڑنا ہے۔

اس مقام پر اقبال کی عظمت اور حرمت اور واضح ہو جاتی ہے اس نے اسلام کے حوالے سے اجتماع اور زمان کو پہچانا۔ مادی ترقی اور مغربی استعمار کے مقابل ایک زبردست تحریک کی بنیاد اٹھائی۔ اسلامی معاشرے کے روشن فکر جان لیں کہ ہمارا معاشرہ اجتماعی فکر میں اقبال کا کس قدر دست نگر ہے۔

اقبال استعمار کے دشمن تھے۔ ایک پسماندہ اور مغرب زدہ معاشرے میں ایسا عمل کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے اخلاقی صداقت انسانی امکانات سے آگاہی اور اسلامی فکر کی حقیقت سے گہری شناسائی ضروری ہے۔

آج یورپی انسان ممکن ہے یہ کہہ دے کہ میں فلسفی ادیب مصنف آرٹسٹ انجینئر ماہر معاشیات ہوں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ان امور پر غور نہیں

کرتا۔امور مملکت سیاست دانوں کا کام ہے۔ لیکن افریقہ کا باشندہ یا ایشیائی نو آبادیات سے تعلق رکھنے والا یا لاطینی ریاستوں کا کوئی فرد یہ بات نہیں کہے گا۔ یہ بات ترقی یافتہ معاشروں کے افراد کے لئے تو صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ وہاں سیاست بذریعہ آئین و انتخابات ہوتی ہے لیکن استعمار زدہ اور پسماندہ معاشروں میں رہنے والے فرد کو ہر سطح پر اس عمل سیاست میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ یہاں سیاست صرف ارباب حکومت اعضائے ریاست اور کارکنان سیاست کا کام اور فن نہیں۔ بلکہ ہر فرد اور بشر کا فرض عین ہے۔ جس پر زندگی اور حیات کی حرکت کا دارومدار ہے۔ ترقی یافتہ معاشرے میں آگ سے بچاؤ کے لئے فائر بریگیڈ کا محکمہ اور عملہ تخصیص موجود ہے۔ مگر پسماندہ اور جھلسے ہوئے معاشرے کی نجات کے لئے ہر آدمی کو خود (بالٹیاں لے کر) میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ یہاں یہ کام ماہرین پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ بحث یہاں بے کار ہے کہ میں فلسفی ڈاکٹر ادیب یا شاعر ہوں (گھر کو آگ لگتی ہے تو سب کو بجھانی پڑتی ہے) پسماندگی افلاس اجتماعی بے چارگی غیر ملکی تسلط ایسے مسائل نہیں جن کا تعلق صرف مخصوص لوگوں اور پیشہ ور لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے تیسری دنیا کے مستضعفین کا فریضہ ہے کہ مجموعی جدوجہد کا آغاز کریں۔

تمام ادیان حق کا مقصد اولیٰ عدل و انصاف کا نفاذ اور نظام حکومت کو عاجز اور کمزور لوگوں کے سپرد کرنا ہے۔ مگر اسلام تنہا ایسا مذہب ہے۔ جو صرف پند و نصائح پر تکیہ نہیں کرتا۔ بلکہ نظام کے نفاذ کے سلسلے میں تلوار سے کام لیتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی تصویر کشی اگر کرنا چاہیں تو یوں ہو گا کہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار دکھائی ہوگی۔ مسلمان کبھی مفت میں تختہ دار پر نہیں چڑھا۔ برصغیر میں غلام احمد قادیانی نے سعی کی کہ اسلام میں سے ایک نیا اسلام نکالے۔یہ انگریزی حکومت سے چھٹکارے کے لئے نہ تھا۔ (بلکہ یہ سب انگریزوں کی سازش تھی) اس نے جہاد کو منسوخ کیا۔ وہ مصلح اور رہبر تو کیا ایک بدعتی خیانت کار اور منحرف کے طور پر معروف رہا۔ اقبال مصلح اور ریفارمر کے علاوہ استعمار شکن بھی تھا۔ آزادی کی تڑپ اور سعی اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے کوششیں اور انگریز کی

غلامی کا جواء اتار پھینکنے کے لئے جدوجہد اس کی زندگی کا محور تھا۔اس نے استعمار کے ہر روپ اور ہر انداز کو مورد تنقید بنایا۔ اقبال ایک شاعر بھی تھا۔ اس کی فکری حیثیت کے لئے شاید شاعری کا درجہ زیادہ بلند نہ ہو۔ لیکن ہر ہنر اور اس کی قدر و قیمت دوسرے ہنر سے مربوط ہوتا ہے۔

جلال الدین محمد بلخی بھی تو شاعر تھے۔ جس نے ہماری تاریخ کے درو بام کو لرزہ براندم کیا ہوا تھا۔ شاعربات کے ایک انداز کو بیان کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔ شاعر کی عظمت یہ ہے کہ جو وہ بیان کرتا ہے وہ نثر کے مقابلے میں زیادہ تاثیر کا حامل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کا کلام شاعرانہ تاثیر سے مالا مال ہے۔ ادبیات متعہد (Commitment) والی باتیں عوامی خدمت کا دم بھرنے کے مترادف ہے یورپ میں ایسا ادب سرمایہ داری اور طبقاتی عناصر کے خلاف ہے اور محنت کش طبقے کا حامی ہے۔ مگر تیسری دنیا میں ہر چیز سے پہلے استعمار دشمنی آتی ہے۔ ایسی سامراج دشمنی جو کٹر قسم کے مارکسٹوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ استعمار زدہ معاشرے کی باگ استعمار کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ یہاں اقتصادیات ملکیت ذرائع پیداوار سب پر تسلط استعمار کا ہوتا ہے۔ یہاں مارکسی نکتہ نگاہ کام نہیں آتا۔ تمام اجتماعی مسائل جزوی و کلی گو اقتصادی ہوتے ہیں۔ مگر استعمار زدہ سماج کی بنیاد استعمار ہی رہتی ہے۔ اقتصاد نہیں ہوتی۔ اور علم و حکمت سیاست و مذہب تصور خودی سب کی اساس بدل جاتی ہے۔

اقبال ایک بڑا فنکار تھا۔ وہ عہد حاضر کا پختہ کار نظریاتی شاعر اور سماج کا زبردست مصلح تھا۔ مگر اس کے کلام میں یہ احساسات و جذبات اس طرح نہیں جھلکتے کہ جیسے وہ اس کے ساتھ مربوط نہ ہوں۔ بلکہ اس کے ہاں ایک پورا فکری نظام ہے۔ جس کی اساس استعمار دشمنی Anti Imperialism ہے۔ اقبال افرو ایشیائی انتہا پسندیوں اور افراط تفریط کے درمیان اور مغرب کے مقابلے میں "تھرڈ تھیوری" پیش کرتا ہے (جو در حقیقت فورتھ تھیوری ہے) ۔ مسلم دنیا میں دو فکری و سماجی دھارے متوازی چل رہے تھے۔ ایک کا

عقیدہ بقول تقی زادہ مرزا ملکم خان افراط سے عبارت تھا۔ یعنی سر تا پا فرنگی روپ دھار لو۔ خذما صفا کا کوئی سوال نہیں۔ نومن ببعض و نکفر ببعض یورپی طرز فکر تمدن و اخلاق فلسفہ و فکر طرز زندگی۔ غرض سب کچھ زندگی کا جزو لا ینفک ہے۔ اسے قبول کرو۔ اس کے متقابل دوسرا گروہ یورپ کی ہر چیز اور اس کے اخذ و اقتباس کو کدورت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ موٹر کار پر سواری اور انگریزی تعلیم یافتہ ڈاکٹر سے علاج کو بھی غیر شرعی سمجھتا ہے۔ یہ فکر مغرب کو مکمل طور پر مسترد و مردود سمجھنے والی ہے۔

اقبال شروع میں مشرق و مغرب کے دونوں نظاموں کا بہ طرز عمیق مطالعہ کرتا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

مشرق حق رادید عالم ندید
غرب عالم رابدید از حق رسید

اس کے بعد اعلان کرتا ہے کہ مغربی تمدن کی کورانہ تقلید مشرق کے لئے باعث ننگ ہے انسانیت جس چیز کی محتاج ہے۔ وہ مشرق کے پاس موجود ہے مگر خود مشرق کا اس سے دستبردار ہو جانا کس قدر شرم کی بات ہے۔ مشرق کا طرہ امتیاز حق پرستی شوق و عشق ماورائی غیب جوئی، فضیلت خواہی و حقیقت کلی و جسمانی کا ادراک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مغرب سے بالکل کٹ جانا اور ان کے طرز تمدن سے لا تعلق رہنا زوال کی علامت کہلا سکتا ہے۔

اقبال ان تشکیکی مفکروں کے خلاف ہے جو مغرب کے علم و حکمت کو ترک کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سائنس و ٹیکنالوجی اور طرز تمدن کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جو معاشرہ علم و عرفان کی چوٹیوں پر پہنچنے کا دعویدار بنتا ہے۔ اسے مشرق و مغرب دونوں کے رازوں کا امین بننا ہو گا۔ اگر ہل اور بیل کی جگہ کھیت میں ٹریکٹر چلنے لگے۔ اور کجاوہ کی جگہ اونٹ کی سواری اور چربی کو جلا کر روشنی حاصل کرنے کی جگہ الیکٹرک بلب روشن ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ (کون سا اسلام خطرے میں آتا ہے) ان دو انتہائی

سوچوں کو ایک نکتے پر مرتکز کرنا ہی دراصل کمال انسانیت ہے۔ اس وقت آدمیت اپنے عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ جب دل پرواز سے اور روح معراج سے آشنا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ انسان سپرسانگ طیارے میں بھی سوار ہو۔ آسمان اور سیاروں کو مسخر کرے۔ یہی اوج ہے۔ یہی بہبود انسانیت ہے۔

اقبال کا پیغام ہے کہ اندر کی آگ سے اپنے قلوب کو منور کرو۔ انسان عشق و عرفان اور روح ایمانی کی مشعلوں کو اپنی حیات میں روشن کریں۔ تاکہ زندگی کی توانائی بھی حاصل ہو۔ اور نیچر اور روح بھی سیراب ہو جائے۔ زندگی کے مقاصد کا ادراک حاصل کریں اور اہل مغرب کی طرح مہو ماہ کو تسخیر کریں۔ جہالت' تاریکی اور پریشانی سے جڑ پیدا ہو جائے۔ مذہب کو ایسی طاقت دیں کہ وہ غیر انسانی تاویلات کی قید سے آزاد ہو جائے۔ غلیظ ہوسناکی' کمزوری' خوف اور خود ترسی کے شکنجوں سے چھٹکارا پالیں ہمیں حقیقی آزادی کا چہرہ دیکھنا نصیب ہو۔ اس کے علاوہ سائنس و ٹیکنالوجی اور جہاں غرب کی منطق کو پہچان لیں۔ جہان اور فطرت کی قابو میں کریں۔ مذہب و سائنس کی دو قوتوں سے فطرت کر لرزہ خیز قوتوں کو تسخیر کریں اور انسانی ترقی کی راہوں کو وا کر دیں۔

اقبال کے نظریے کا توثیق کے لئے جاپان کی مثال کافی نہیں۔ مگر کچھ تشکیک پسند لوگوں کے استدلال کو مسترد کرنے کے لئے یہ مثال ضروری ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مغربی سائنس و حکمت کے مقابلے میں اپنے قومی و ملی نظریات اور اخلاق و کردار کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اور کلچر اور سائنس میں سے صرف ایک چیز اپنائی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگ جاپان کی زندہ مثال کو سامنے رکھیں۔ (بقول شخصے جاپان نے جاپانی زبان میں ترقی کی ہے) جاپانی قوم نے ربع صدی کے اندر یورپ کو صنعتی ترقی میں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ فیشن پرستی کی جدیدیت میں بھی کم نہیں۔ جاپانی عورت کو دیکھیں۔ اپنی بنائی ہوئی خوبصورت موٹر کے ساتھ کھڑی ہے۔ جدید ترین وسائل اپنے لئے مہیا کر لئے ہیں۔ لیکن اپنے قومی روایتی تشخص کے لئے روایتی لباس اور آرائش و زیبائش قدیمی کو بھی لئے ہوئے

ہے۔ اب ایرانی دوشیزہ اور افریقی خاتون کو نظر میں لائیں۔ کہ جدید تمدن کی سوغات میں سے صرف ایک رسالہ "بوردا" کا شمارہ رکھتی ہے وہ اپنے آپ کو ماڈرن اور آزاد خیال سمجھتی ہے۔ اور اس کا دل سوئیس عورت کی بے چارگی پر کڑھتا ہے۔ کہ اس بے چاری کو انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی حاصل نہیں۔ اسی طرح ہمارا جدید مرد امریکی باشندے کے مقابلے میں اترتا ہے۔ (اپالو کو فضاؤں میں چھوڑتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ مرد غیور کسی غبغب پر اتر رہا ہے)۔

اقبال کی خواہش تھی کہ اسلام کا ایک نیا تجربہ مملکت خداداد پاکستان میں ہو۔ جو بیسویں صدی سے ہم آہنگ ہو۔ اس نے ہندوستانی نژاد ہونے کے باوجود مغربی تمدن کو رد نہیں کیا۔ اس کے خیال میں اسلامی جامعہ اس قسم کا ہو کہ دل تو مشرق کا ہو اور دماغ مغرب کا یعنی مسلمان جدید وسائل سے بہرہ مند ہو۔ یہ نہ صرف مشرق یا مسلمانوں کی آرزو ہے۔ بلکہ آدمیت کا مقصود ہے۔

اس دور میں مشرق و مغرب کے دو دھاروں کو متوازن رکھنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ ترقی اور کمال کے لئے ان دو دھاروں کو ہم آہنگ کرنا بہت ضروری ہے۔ اسلام خود اس مسئلہ سے دو چار ہو گیا تھا۔ اس لئے اقبال کو اس کی تجدید کی سعی کرنی پڑی۔ اقبال اور دوسرے مفکرین اسلام مذہب کو ایک خاص چوکھٹے میں رکھنے کے قائل نہیں اور ان انسانوں کے مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جن کو فرانز فانان نے مبغوضین زمین Wretced of the Earth کہا ہے۔

سید جمال الدین افغانی کے بعد اقبال "نہفت گشت باز خویش" "ہمہ گیر تحریک کے ذریعے عظیم اسلامی امت کو ایک ایسے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے جس کی حدود خلیج فارس سے لے کر شمالی افریقہ اور چین کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن اسلام کی طرف یہ رجعت جہالت تاریکی' جاہلانہ رسومات' فرسودہ خرافات کی طرف لوٹنا نہیں۔ پسماندہ افکار' توہمات اور منجمد افکار کی دوستی نہیں۔ شبیہ خوانی' شلیتہ پوشی' مہو خر کو لٹکانا اور مچھر کے تو

بوہ کو کمرہ کی دیوار کے ساتھ آویزاں کرنا جیسے توہمات کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔ماضی سے رابطہ جوڑنے کا مفہوم علم و دانش کے اصلی سرچشموں تک پہنچنا ہے۔ ارتقاء ذات و کائنات کا ادراک حاصل کرنا ہے۔ اپنے ماضی سے محبت کا مطلب ہرگز نہیں کہ مغربی کلچر کی مخالفت برائے خدا کی جائے جس کو آج کل فیشن بنا لیا گیا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ فرنگی کو کوسنے' اپنی روایات سے چمٹنے اور فرسودہ توہمات کا طوق گلے میں ڈالنے کو ہم اپنی ذات کی طرف پلٹنے کا نام نہیں دے سکتے۔ درحقیقت یہ ایک کٹھن اور صبر آزما تحریک ہے۔ جس کی بنیاد اپنے آپ کو پہچاننے اور بنانے میں ہے۔ چنانچہ خود آگہی کے اس مقصد کے لئے یورپی تمدن اور فرہنگ سے آشنائی بھی لازمی ہے۔ عصر جدید' اقدار انسانی' تاریخ اقوام' ادب و مذہب کو اس کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ شناخت کرنا بھی اس زمرے میں آتا ہے معاشرے کے عروج و زوال کے اصولوں کو سمجھنا اور حقیقت سماج کا عوام اور عوام کا سماج کے ساتھ جو رشتہ اس کا ادراک کرنا ہے۔ ہمیں یہ جاننا بھی ضروری ہے زوال کے بیج کس طرح بوئے گئے۔ استعمار نے کس طرح دونوں ہاتھوں سے ہم سب کو لوٹا۔ اور ہماری ہیئت پر کیسے کیسے نقوش مرتسم کئے۔ یہ کام ایسا نہیں ہے۔ کہ فقط دو ایک انٹرویو یا کچھ مقالات زیر بحث لائے جائیں۔ اور ہم کچھ ادھر ادھر کی بات کریں۔

ذات کی طرف پلٹنے کا عمل کیسے ہوتا ہے۔ اقبال ایک جست لگا کر یورپ پہنچے۔ یورپ جہاں سے عصر جدید کے فلسفی اور مفکر ابھرے۔ ان کے تمدن' سماج اور فکر پر تحقیق کی۔ اس کے بعد اسلام کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے محنت' سعی' تفکر' تعلیم' جہد مسلسل' مطالعہ اسلام' قرآن فہمی' عرفان و فرہنگ کو زندگی کا شعار بنایا۔ عوامی تقدیر سنوارنے کا بیڑہ اٹھایا۔ برصغیر اور اسلامی ممالک کی سیاسی و فکری جدوجہد نظریاتی شرکت کی۔ انہوں نے ادبی' فنی' فلسفیانہ اور عملی طور پر جدوجہد آزادی میں شرکت کی۔ انصاف و عدل کا پرچم بلند کیا اور استعمار دشمن رویہ اپنایا وہ خودی اور خود شناسی کے تصور تک پہنچے۔ اپنی ذات کو کائنات کی سیر و سیاحت اور ماضی و مستقبل کی تفہیم سے ہمکنار کیا اور اپنے آپ

کو ایک اندیش مند مشرقی مسلمان' آزادی کی تڑپ رکھنے والے مجاہد' ایک بلند پایہ ادیب و فنکار کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ دراصل اس چیز کا نام ہے ذات کی طرف رجوع۔ اس کو کہتے ہیں بیسویں صدی میں رہائش پذیری۔ اس کو کہتے ہیں پسماندہ اسلامی اور مشرقی نو آبادیات میں ایک روشن خیال وجود کا ظہور۔ یہ ہے ہمارے دور اور عصر حاضر کے روشن خیال' فلسفیانہ تفکرات کے "سکول آف تھاٹ" کا قیام اور ایمان محکم اور اصیل اقدار کا ظہور۔ یہ ہے علی گو نہ ہونا۔

اقبال ہمارے عہد میں اسلامی تجدید کا معیار اور معمار ہے میں کسی قومیت کے نظریے کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایرانی فکر اور اسلامی تاریخ کے سخت ترین سیاسی مراحل میں حقیقت اسلام کی جس طرح توضیح کی گئی۔ جس طرح اسے چھپایا گیا۔ اس کا انکشاف ایرانیوں کے آغاز اسلام کے اموی اور عباسی دور کے علی الرغم جس طرح اسلام کی صحیح شناخت کرائی وہ اقبال ہی کا حصہ ہیں۔ اس نے دوسری تیسری اور چوتھی صدی کی ایرانی دانش کو جو عبد الرحمان بدوی مصری کے قول کے مطابق اسلامی تمدن کا سنہرا دور تھا روشناس کرایا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آج اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریک میں اسلامی فکر و روح اور حرکت اور بیداری کے سلسلے میں سب سے پہلے جس کام کی ابتداء جمال الدین افغانی نے کی اسے اقبال نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اقبال نے ایرانی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم جان من و جان شما
حلقہ برگردم زینداری پیکران آب و گل
آتش درسینہ دارم ازنیا گان شما

یہ کلام کوئی تفاخر کے جذبے کے اظہار کے لئے نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کا مقصد ہے کہ ہمارے دور کے روشن فکر حضرات درد اور آگہی کا سرمایہ وافر لے کر اپنے سماجی فرائض سے عہدہ برآ ہوں اور اس کا گہرا احساس کریں۔

ماوَ اقبال (دفتردوم)

دنیا کی عظیم شخصیات' فلسفیانہ نظام یا بڑی بڑی کتابیں خود زیادہ دیر تک باتیں نہیں کرتیں بلکہ لوگ ان کے متعلق باتیں کرتے ہیں ان کو جاننے والے ان کی یادیں دہراتے ہیں۔ ان کے کمالات سے انکار ممکن ہے نہ ان سے صرف نظر ممکن ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم ان چیزوں کے متعلق اظہار خیال کریں۔

لیکن ایک مسئلہ یہ ہے کہ معقول اور بے ڈھب لوگوں سے کیسے بحث کی جائے۔ ادبی موضوعات متنوع اور منتشر ہیں۔ ان میں مناقب' فضائل' محاسن' مقامات' کرامات' پیغمبر' امام' قرآن' اسلام' اجتہاد' ولایت' امامت' عدل' حقانیت' اوامر ونواہی' شہادت' علیؑ حسینؑ ذکر وفکر میں انشاء پردازوں نے پرواز تخیل اور فکری ترفع کا پورا سامان کیا ہے اور ہر ایک موضوع پر ایسی باکمال تحریریں سپرد قلم کی ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ اتنی وسیع ہے قلم وعلم کی دنیا کہ سمندر کا پانی اگر سیاہی بن جائے تو بھی موضوع سے انصاف نہ ہوسکے۔ لیکن اگر کوئی کلمہ یا جملہ ایسا آجائے جو حقیقت شناسی کا مظہر ہو تو زبان اور قلم گنگ سے ہونے لگتے ہیں۔

یہ تو معلوم ہے کہ ملت ایرانیہ دن رات' ہر ہفتہ اور ماہ وسال علیؑ یا فاطمہؑ حسنؑ وزینبؑ ولایت' شہادت کا ذکر کرتی ہے۔ ان کی دین ودنیا کا یہی وظیفہ ہے۔ ہمارا یہ سارا سرمایہ علمی' حرارت ایمانی' مایہ فرہنگی انہی باتوں کی نذر ہوا ہے۔ لیکن ہنرمندی اور ہوشیاری ملاحظہ ہو کہ یہ تمام مقدس باتیں مجہول ہیں۔ ان سے حقیقتی پردے نہیں اٹھتے۔ یہ کسقدر مقام افسوس ہے کہ آج کا نوجوان چارلی چپلن کے کام سے تو واقف ہے۔ مگر علیؑ کے مقام سے آگاہ نہیں۔ فارسی زبان میں جتنا کام گوتم بدھ اور زرتشت کے احوال پر ہوا ہے۔ اتنا عمیق عملی کام نبی پاک ﷺ اور حضرت زینبؑ پر نہیں ہوا۔ مشرق ومغرب میں ہم سے بڑا لفظ باز کوئی نہیں۔ لفاظی کے پرچم لہرا رہے ہیں مگر بنیادی مقصد سے کوئی خبر دار نہیں۔ ہمیں تھوڑا سا علم ہیگل' ڈیکارٹ' سارتر کا بھی ہونا چاہئے' وہ کون تھے۔ کیا چاہتے تھے کیا کارنامے سرانجام دے کر گئے ہیں کیا وزن رکھتے تھے۔

ہم تمام عمر یہی سنتے آئے ہیں کہ ہم جعفری مذہب کے پیروکار ہیں۔ امام جعفر صادقؑ شیعہ مذہب کے بانی ہیں۔ اسلام کا حقیقی اور اصلی فقہ ہمارا ہی ہے۔ امام جعفر صادق کا علمی مقام دنیا میں بے مثل ہے۔ انہوں نے چار ہزار شاگردوں کی تربیت کی۔ علم کی ہر شاخ میں متبحر اور صاحب نظر تھے۔ انہوں نے دوسرے علمی شعبوں میں بھی تعلیم دی۔ حتیٰ کہ کیمسٹری کے جابر بن حیان بھی ان کے شاگرد تھے۔ لیکن کوئی ہے جو ایک تازہ نظریہ پیش کرے اور امام جعفر صادق کی صحیح پہچان کرائے۔ ہمیں اور نہیں تو استرا سبورگ کی ان علمی کاوشوں سے جو اس نے اس ضمن میں کیں واقف ہوجانا چاہئے اور اس کے لئے غیر ملکی زبان بھی سیکھنی چاہئے۔

دوسری طرف ایک اور مسئلہ بھی ہماری فکر و دانش کو درپیش ہے۔ یعنی صرف ایک ہی رخ دیکھنا اور دکھانا۔ صرف وہ کتابیں اور افکار سامنے لانا جو ہمیں پسند ہوں۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے جیسے ہم ان کتابوں کا تذکرہ کریں۔ جن کے اول' آخر اور وسطی اوراق پھٹے ہوئے ہوں۔ ہمیں اکثر شخصیتوں کے متعلق سنسر شدہ نقش ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی صورت حال علامہ محمد اقبال کے باب میں بھی ہے کہ ان کی شخصیت کا صرف ایک پہلو یعنی ادبی چہرہ اور وہ بھی محض ہندوستان کے ایک فارسی گو شاعر کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ ان کا سیاسی چہرہ' پاکستان کی سفارت سے متعلق ناقابل فراموش اور باشکوہ چہرہ کہاں ہے۔ محافل گرم میں ان کا ذکر شب اقبال کے تحت روایتی انداز کے مطابق تو ہوتا ہے۔ ان کے علمی اور فکری کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسی چیزوں کا ذکر ہوتا ہے جس سے حسن کاری اور خیال آرائی پر ان کو قدرت کا پتہ چل سکے۔(مگر اصل اقبال گم ہے)

اقبال کو بحیثیت شاعراور فارسی گو کے خراج پیش کرنا ایسے ہی ہے کہ جیسے لوتھر جیسے روشن فکر اور انقلابی کو متناسب اندام والے حسین وجمیل انسان کے طور پر دنیائے مسیحیت میں متعارف کروادیں۔ ایسا کرنا اقبال کے ساتھ زیادتی ہوگا۔ اقبال کو متعارف کروانے کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس کو پہچانیں اور یہی سب سے مشکل کام ہے۔ شیخ

نے ایک مجلس میں چودہ دلائل پیش کرکے خدا کا اثبات کیا۔ شمس نے کہا کہ میں خدا کی طرف سے آپ کا مشکور ہوں مگر تم جاؤ پہلے اپنے وجود کا اثبات کراؤ۔ خدا تمہارے اثبات کا محتاج نہیں۔ شمس کا یہ قول ایک ہمہ گیر اصول اور قانون کا درجہ رکھتا ہے۔

خدا' مذہب' تمدن' فرہنگ' آئیڈیالوجی' پہچان' عقائد' حق' بحث مباحثے' انسٹی ٹیوشن' تاریخ کے باب میں اس وقت تحقیقات بے معنی' معارف عبث' ذہنیت فضول' علوم سطحی' محنت بے ثمر' بھاگ دوڑ بے مقصد اور روح بے ذوق کا دور دورہ ہے۔ ساری فکری سرگرمیاں اور علمی کاوشیں انہی محوروں کے گرد گھومتی پھرتی ہیں۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت و واقعیت کا چہرہ پوشیدہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سچائی تک نہ صرف پہنچیں بلکہ اسے پھیلائیں۔ سب سے پہلے اپنے حوالے سے اپنی شناخت کریں۔ اپنے اہداف کا تعین کریں اور پھر اس منزل پر گامزن ہوں۔

ہمارا عربی دان عالم شخص بہت متجر ہو تو کیا کرتا ہے۔ بس ایک سرکاری ادارہ قائم کرلیتا ہے۔ وہ عربی اور ادبی زبان کے علاوہ اگر شعری ذوق بھی رکھتا ہو تو پھر اپنی باقی علمی صلاحیتوں کو بے اصل جان کر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کے پاس مدینہ العلم جیسی فصاحت اور ذوالفقار علی جیسی کاٹ موجود ہے۔ چنانچہ وہ شعر کہنے شروع کردیتا ہے۔ پھر اسے کوئی خاص موضوع ہاتھ نہیں آتا۔ تو وہ تمام ملک کی رپورتاژ عربی زبان میں قلم بند کرڈالتا ہے۔

ہم ادبیات کے محقق نہیں ہیں۔کوئی تحقیقی رسالہ' فاضلانہ مقالہ اور عالمانہ تفحص بھی نہیں رکھتے۔ ہم کوئی زیادہ محبت اور دلبستگی بھی اپنی مادری زبان سے نہیں رکھتے۔ ایسے میں ہم اقبال سے کیوں کر روشناس ہوسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ احساس دینی بھی ہمیں اقبال تک نہیں پہنچاتا۔بنیادی طور پر یہ مقصد بھی نہیں ہے کہ ہم اقبال تک علم برائے علم کے ذریعے پہنچیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ دیکھیں کہ اس نے روح عصر کی ترجمانی کس حد تک کی۔ اور

ضرورتوں اور تہیجات کے متعلق وہ کیا کہتا ہے۔ یعنی اسکا مبلغ علم' فکری رفعت اور انسانی بہبود کے متعلق اس کی سوچ کیا ہے۔

سارتر کے نظریے کے مطابق انسان Situation Humaine (وضع) ہے۔ جو اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ ایک ایسا علاقہ جو انسان وضع کو اجاگر اور مشخص کرتا ہے۔ اس انسان سے متعلق ہے جو امت' تاریخ و فکر ایمان درد نیاز مشترک رکھتا ہے۔ نتیجتہ" اپنی تقدیر' ویژن اور نیچر کی تلاش میں ہے۔ اقبال نے اسی خود آگہی کے نظام (Packlage) کو ہمارے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔

ما (ہم) یعنی ہم مسلمان

اور یہ (ہم) ہے جو وجود کے اثبات کے بارے میں ہے۔ سارتر کا استدلال مبہم اور مردود ہونے کے ساتھ دقیق بھی ہے۔چنانچہ سب سے پہلا قدم اپنی شناخت اور خود آگاہی تک رسائی کے سلسلہ میں اس سوال کا حتمی جواب ہے کہ ہم آج کونسی تاریخ میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ اور اس سرزمین زور' مقابلے' زاویے اور علاقے میں کہاں فٹ بیٹھے ہیں۔ اگر ہم تاریخی محل وقوع اور موضع جہانی کا تعین کرلیں تو سمجھ لیں کہ آپ اپنا تعارف حاصل کرچکے ہیں اور ہمارااحساس خود آگاہی کا حامل جذبہ صادق ہے۔ کیونکہ اصطلاحا" جو خود آگاہی ہے وہ تو مختلف عناصر سے گڈ مڈ ہے اور اس نے ہماری فطرت پر تقلید کا رنگ چڑھا رکھا ہے۔ سیلف کی جگہ بیگانگی (Alienation) کا رنگ پید اہوچکا ہے۔ اس لحاظ سے جو بھی احساس درد محبت ہے وہ سچا نہیں۔ (کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں پھر سچا شعر سنائیں کیا) بنیادی طور پر وہ تمام تمنائیں اور آرزوئیں فی نفسہ اعلیٰ کیوں نہ ہوں۔ مجرد حیثیت میں بطور وضع بے مایہ اور بطور حقیقت بے جا ہوں گی۔

اگر ہم واقعی اعتراف کرتے ہیں کہ سب سے پہلے شمس کے انداز میں خدا کے وجود سے قبل اور آج کی اصطلاح میں ہر مذہب ونظریے کے حق وباطل کے اثبات سے پہلے

اور ہر آئیڈیالوجی کے کشف سے پہلے اور ہر راہ عمل کے انتخاب سے پیشتر ہمیں اپنے وجود کے اثبات کی کوشش کرنی چاہیے۔ "ہم وضع انسان خویش" کو پہچانیں اور حقیقت میں اپنی حیثیت کا تعین کریں اور اس طرح اپنی وجودی حیثیت تک رسائی حاصل کریں۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔

مشرق :۔ ہم اہل مشرق ہیں اور مشرق محض جغرافیے کا نام نہیں۔ یہ ہماری روح اور بصیرت کا حامل کلمہ ہے جو تمدن' فرہنگ' جہاں بینی اور زندگی اور ہماری شخصیت میں جلوگر ہے۔ اس طرح یہ تعین مغرب کے مقابلے میں ہمیں "موضع" کے مقام پر جلوہ گر نظر آتا ہے یعنی مشرق کا اپنا ایک منفرد نظام فکر اور کلچر ہے۔

اسلام :۔ ہم اہل اسلام ہیں۔ ہر چیز سے پہلے اسلام ہمارے لئے مکتب اعتقادی (سکول آف تھاٹ) ہے۔ اس کا ایمان اور اس کی آئیڈیالوجی مقرر شدہ ہے۔ خود ساختہ نئی آئیڈیالوجی اور قوم کی طرف سے منتخب شدہ آئیڈیالوجی میں بڑا فرق ہے۔ اس لحاظ سے اسلام ہمارے لئے تاریخ' زبان' فرہنگ' بصیرت' اخلاق' روابط اجتماعی' زندگی' انسان' معاملات جہاں کے باب میں راہنمائی کا نظام رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام حقیقت کے علاوہ واقعیت کی صورت سے (فرہنگ اور فطرت) وجدان اجتماعی اور انسانی تعلقات میں بھی جلوہ گر ہے۔ اور جو دانشور اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ بے بصیرت ہیں۔ وہ اسلام کی واقعیت' روح' جوہر' سماج' فکر اور تاریخ میں اس کی روانی سے انکار کرتے ہیں۔ وہ نہیں مانتے کہ اسلام ایک مابعد الطبیعاتی عقیدہ اور نظریہ ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک انسانی سوچ ہے۔ جو ہمارے اپنے دماغ کی اختراع ہے۔ یہ ایک ایسا لباس ہے کہ جی چاہا اتار دیا اور جب چاہا فیشن کے مطابق کتر بیونت کرلی۔ لیکن یہ بات ہرگز درست نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل نظریہ حیات (بلکہ حیات بخش) ہے۔ یہ ہماری فکر' ہستی' اقدار انسانی' روح وخصلت شیوہ زندگانی' تعلق انفرادی واجتماعی کے روابط کا امین ہے۔ یہ انسان کو ملنے والا آخری وژن ہے۔ یہ حیات کو متشکل کرنے والا نسخہ

ہے۔ اور اقدار انسان کا خالق نصب العین ہے۔ دورجدید کا دانشور بے شک اپنی فکر کو دنیائے ظاہر میں زمین کی تقسیم اور پیداوار تک محدود رکھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی ووسعت' بلندی' صلاحیت' پاک نگہی کے جواہر پر بھی نظر کرے۔ اور اسلام کے جو ہر شفاف اور مقلب القلوب رول اور رسالت' امامت اور نبوت کے امور پر بھی نگاہ کرے۔

ہمارے مسلمان سماج کے انسان بس حادثاتی مسلمان ہیں ۔ انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جو ہر اعتبار سے خالی خولی تھا۔ چنانچہ دوسروں کی نقالی ان کا مقدر بن گئی۔ اپنی شاندار تاریخ اور اعلیٰ فکری روایات رکھنے والا معاشرہ غریب ہوگیا اور اس معاشرے کے ثروت مند انسان کی روح کو برومندی سے عاری کرکے بیگانگی Alieation کا شکار کردیا گیا۔ پھر وہ مستعار سوچوں کے سہارے اپنے فکری سرمائے کی اشاعت سے محروم ہوکر رہ گیا۔ ماؤزن ترکی کی مثال سامنے رکھیں۔ انہوں نے جدت پسندی کے زعم میں مغربی کلچر اور مغربی فکر کو اپنانے کوشش تو کی۔ مگر اس سعی میں اسلامی سماج اور فکر وایمان کے سوتے خشک ہوگئے۔کیا وہ ایسے روشن فکر انسانوں کو سامنے لاسکتے ہیں۔ جو اس تغیر کے طفیل زیادہ باخبر اور روشن دماغ ہو گئے ہوں۔ غیر مذہبی افکار نے ان کو ہراسانیوں میں مبتلا کردیا ہے۔ اس روش میں پلنے والے غیر مستقل مزاج مفکرین ہوسکتا ہے اسلام سے دور بھی ہوجائیں۔ مگر اسلام کی فکر سے وابستہ روشن خیال مفکر اسلام سے رشتہ وپیوند ضرور رکھے گا۔وہ تاریخ' فکر' زبان اور قوم کا وفادار رہے گا۔ سماجی روح'عوامی فطرت' معاشرتی اقدار سے رابطہ استوار رکھے گا۔ وہ خلوص دیانت اور عزم سے پر زندگی گزارے گا۔ ان کے ساتھ سانس لے گا۔ وہ کبھی اپنی آنکھیں تاریخ' عوام اور وجدان کے طرف بند نہیں کرے گا۔

مسلمان ہونے کے ناطے ان دو اعتبارات سے ہمیں دوسروں کے مقابلے میں اپنی خاص فکری جہت طے کرنی ہے۔ اور اسی حوالے سے تاریخ وفرہنگ کو اجاگر کرنا ہے۔ تاریخ

جو کہ ہماری سرگزشت ہے اور ہماری سرنوشت کو یقین اساسی عطا کرتی ہے۔ اور فرہنگ جو کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی سرشت کو تخلیق کرتی ہے۔

تیسری دنیا

ہم تیسری دنیا کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کو ہم نے اپنے لئے منتخب نہیں کیا۔ تیسری دنیا اس دور میں کوئی محض لفظی شعبدہ گری نہیں ہے۔ جسے سیاسیات کی زبان میں آسانی کی خاطر گھڑ لیا گیا۔ نہ یہ کوئی جغرافیائی سرحد ہے جسے مارکسی مشرق یا سرمایہ دار مغرب نے متعارف کرایا ہو۔ فرانز فانان اس کی تلاش میں تھا۔ اس کی تحریروں میں اس کا عکس مل جاتا ہے۔ تیسری دنیا اپنے اندر ایک جہاں معنی رکھتی ہے۔ ہر چند کہ یہ دنیا پسماندہ اور مجبور اقوام کا مجموعہ ہے۔ اس کے پاس باقی دو دنیاؤں کی طرح طاقت' قوت اقتصادیات' آہن واسلحہ' صنعت وحرفت نہیں ۔ مگر اس کے پاس دو ایسی چیزیں ہیں۔ جن سے پہلی اور دوسری دنیا خالی ہے۔ اس کے پاس گہری اور طویل تاریخ کا سرمایہ ہے۔ جو عظیم انسانی فکر سے مالا مال ہے۔ دوسری چیز اس کے پاس دو حریفوں کی شکست کا ناقابل فراموش تجربہ ہے۔ ایک سپرپاور نے آزادی اور جمہوریت کا نعرہ لگا کر اپنی تجوریوں کو بھر لیا۔ دوسری عالمی قوت نے مساوات کا بہانہ بنا کر فرعونی قصر تعمیر کرلیا۔ مگر دونوں نظاموں نے انسانیت کو غلام بنایا۔ اور انسان کے سر کو مادی بت کے سامنے جھکا دیا۔ اسے اسیر شکم کردیا۔

بیسویں صدی :۔ ہم سب اس صدی میں عمر بسر کررہے ہیں۔ اور اسی سے وابستہ ہیں۔ بیسویں صدی سے ہماری مراد مختلف سسٹم' آئیڈیالوجی' روابط وشرائط' خصائص فکر واخلاقی ان کی تمام مشکلات' جکڑبندیاں' اچھائیاں اور برائیاں ہیں جو ہمارے عہد کے انسان کی تعمیر و تخریب میں حصہ لیتی ہیں۔ بیسویں صدی عبارت ہے۔

۱ کلیسا کی شکست سے

۲ سیاست سے دین کی جدائی سے
۳ بورژوا طبقے کے ظہور سے
۴ طبقہ متوسط کے ابھار سے
۵ ملوکیت کے زوال سے
۶ اشرافیہ کی حکومت اور ان کی اقدار کی حکمرانی سے۔ اس صدی میں
عوامی قوت کا ابھار سامنے آیا۔ فرانس کا انقلاب عظیم
صنعتی انقلاب اور اس کے آثار ومظاہر
حریت پسندوں کے افکار کی اشاعت۔ عوامی حکومت کا میلان
روحانی پیشواؤں' ظالم بادشاہوں اور جاگیرداروں (فیوڈل لارڈز) کی چیرہ دستیاں
مشینی سماج' نو آبادیاتی نظام' استعمار کا عروج وزوال
دو متضاد گروہوں میں دنیا کی تقسیم

اس قرن میں مادی اخلاقیات اور فلسفیانہ مادیت نے معاشرے کو اقتصادی بنیاد فراہم کی۔ انسانی اقدار کو رو بہ زوال کیا۔ معنویت' حقیقت طلبی اور جذبات عشق کو سرد کیا۔ اقتصادی اور معاشی قدر کے ظہور نے مادیت پرستی' نفع طلبی' عقل حساب گیر اور علم سوداگری نے انسان کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لیا۔ محروم طبقے طاقتور استحصالی تشدد کا شکار ہوئے۔ مظلوم اقوام کو عسکری' سیاسی اور تعلیمی ہتھکنڈوں کے ذریعے اپنا غلام بنایا گیااور طبقاتی کشمکش کا بیج بویا گیا۔ سامراجی اور سرمایہ داری نظام پھلا پھولا اور پھر اس کی کوکھ سے قوم پرستی اور اشتراکیت کی آکاس بیل پھوٹی۔

ایک جانب جمہوریت لبرلزم' انسانی آزادی' بنیادی حقوق کا نعرہ بلند ہوا تو دوسری جانب حکومتوں نے سرمائے اور طاقت کے زور پر علم وعشق کو خریدنے کا ڈول ڈالا۔ اور انسان اس نظام میں صرف پیداوار اور مصرف کے درمیان ایک واسطہ بن کر رہ گیا۔ اور انسان کا وجود قدر کی جگہ مقدار بن کر سامنے آیا۔ دوسری جانب عصر جدید کے انسان کی

فطری آرزوئیں' ضرورتیں تھیں' اجتماعی وسائل اور زندگی کی نعمتوں میں سب کے مشترکہ حصے کا تصور تھا۔ انسان عدل' مساوات اور غیر طبقاتی نظام چاہتا تھا۔ وہ صنعتی نظام' سرکاری تسلط سیاسی' اقتصادی اور فکری غلامی سے آزادی چاہتا تھا۔ مگر اس نظام میں افسر شاہی' نسل پرستی' طبقہ تخصیص کی بالادستی' ذخیرہ اندوزی لوٹ کھسوٹ' بدعنوانی' تجارتی اقدار اور مکر فریب کا بول بالا ہوا۔

انقلاب اکتوبر کے بعد سٹالن ازم اور ماؤ ازم کا ظہور ہوا جس نے ایک ایسے نظام کو جنم دیا جس نے سماج کو منجمد سرد اور ملول کردیا۔ مادہ پرستی اور شخصیت پرستی کی قدروں کو فروغ ملا۔ اور سیاست' اقتصاد' عقیدہ' فلسفہ' علم' ادب' ہنر' ذوق اور لباس وزیبائی کے متعلق پالیسیاں بنانا بھی حکومت کا فرض بن گیا۔ پیٹ کی ادھوری ضرورتوں کے عوض قلب روح ذہن اور حقوق انسانی رہین ریاست ہوگئے۔ حکم جاری ہوا کہ جو ضمیر کے مطابق سچ لکھے گا غدار ہوگا یا دیوانہ۔ فکر نو حرام اور اجتہاد بدعت قرار پاگئے اور روز قیامت تک فکر و نظر کے سوتے خشک قرار دے دیئے گئے۔ قرآن' حدیث' فقہ' شرعی رسالہ سے انحراف برتا گیا۔ خلاف ورزی کرنے والا ملعون اور نجس قرار پایا۔ بالکل اسی طرح جس طرح پچھلوں نے شیعیت کا زور توڑنے کے لئے اسے صفوی سلطنت میں تبدیل کردیا تھا۔ اور اسلام کے کس بل نکالنے کے لئے خلیفہ عربی کو استعمال کیا گیا۔ اسی طرح عیسائیت اور رومی قیصریت اور فراعنہ مصر نے جادوگری کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ مقصد سب کا ایک تھا۔ یعنی انسانوں کی تقسیم اور تحقیر۔ انسان کو عاجز بنا کر اپنے اقتدار کے لئے جواز فراہم کرنا۔

گزشتہ چار پانچ صدیوں نے انسان کے لئے یہی وراثت چھوڑی ہے۔ رضائے ربانی اور تائید ایزدی کے تصورات مٹ گئے اور فکری آزادی کے خاتمے کے بعد خدا کا مقام دولت اور سونے کو دے دیا گیا اور خون سے سینچی گئی آزادی کے پھل کو سرمایہ دارانہ نظام نے اچک لیا۔ عصمت حجاب اور حرمت کو جسے انسان نے بدقت تمام حاصل کیا تھا دور پھینک دیا۔ مکمل آزادی حاصل کرنے کے جنون نے انسان کی غیرت کو جنس بنا کر بازار میں

نیلام کردیا۔ اقدار ڈوب گئیں لذت پرستی جیت گئی۔ انسانی اعضاء کالوچ اور آہنگ فروخت ہونے لگا۔ علم حاصل کرنے کی آرزو میں ایمان سے ہاتھ دھولئے۔ علم حاصل کرتے کے بعد اسے دین کی خدمت سے مبرا کردیا۔ علم انسان کو لہو لعب' تشکیک اور ظلمات کی طرف لے گیا اور امیدیں' اقدار اور دولت ایمانی لٹ گئی' انسان راستے کے بیچ میں گمراہ اور بے سہارا ہوکر سرگرداں گھومنے لگا۔ سماج خود ناوابستہ ہوکر طاقت ثروت کے حصول میں مگن ہوگیا۔ انسان کی پسماندگی اور لاچارگی سے معاشرہ لاتعلق ہوگیا۔

سرمایہ داری نظام کی لوٹ کھسوٹ' بوژوائی نحوست' مادہ پرستی' بزدلی' درندگی نمودونمائش طبقاتی کشمکش' ریاست کی عسکریت پرستی نئے لات ومنات بن گئے۔ تمام انسانی قدریں اقتدار کی کنیزیں بنا دی گئیں۔ انسان مشین کا غلام ہوا۔ حقیقت پر ظلم غالب آیا۔ خوبصورتیوں کو مادہ پرستی نے کھا لیا اور عشق پر جنس زدگی سوار ہوگئی۔ اور جیب وجبیں کی ساری پونجی' فکر بیدار' آزاد ارادے' پاک روح' دل کی تڑپ' اندر کا سوزگداز سب گناہوں میں لوٹ پوٹ ہوگئے۔ انسانی سوچ کی جنت جو احترام واخلاق کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی بوژوائی حربوں کے ہاتھوں جہنم میں تبدیل ہوگئی۔ اس صورت حال سے متاثر ہوکر عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاکہ ایک نیا انقلاب ترتیب دیں کہ جس میں مادہ پرستی کے بھوت انسانی حرمتوں کو تاراج کرنے سے منع ہوجائیں اور محنت کش انسان بے رحم سرمایے کی غلامی سے آزاد ہوجائیں اور ایک ایسی امت بن کر ابھریں جو طبعی وسائل سے بھی بہرہ مند ہو اور سماجی انصاف ومساوات پر کاربند بھی ہو۔ عوام کو روزگار' تعلیم' آزادی اور ترقی کے بہترین مواقع یکساں طور پر نصیب ہوں اور مزدور کو اس کی محنت کا تسلی بخش معاوضہ ملے۔

انسان نے آزادی ومساوات کے حصول کے لئے خون بہایا مگر نتیجہ ناکامی ونامرادی کے سو اور کچھ نہ نکلا۔ راہ حق و آزادی کا ہر مجاہد فرعون کے اہرام کی بنیاد کا پتھر بن کر دفن ہوگیا۔ اس سرمایہ داری کے اہرام میں مدفون ہیں تین شہید۔ روح' آزادی اور اشتراکی معیشت اور ان تینوں مزاروں کا متولی ہے ابولھول۔ اس عہد کا مجروح اور ناامید انسان دو

نظاموں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اور اس عہد کے لکھنے والے کی روح دو ارضی بہشتوں یعنی آزادی اور سوشلزم کی قدروں کے درمیان بھٹک رہی ہے۔ ان کی تحریروں میں اس المیے کی دلخراش آوازوں کو سنا جاسکتا ہے۔ یہ تحریریں خاک وخون پر لتھڑی ہوئی ہیں۔ ان کے لکھنے والے وسیع قبرستان سے آئے معلوم ہوتے ہیں۔ جن کے ناقابل شناخت چہروں پر بھی طرح طرح کے نقاب پڑے ہوتے ہیں۔ اس کا سکھ چین سب چھن چکا ہے۔ وہ تیرہ وتار دنیا میں اس امید پر زندگی گزارتے ہیں کہ صبح امید کبھی تو طلوع ہوگی۔

امر ربی اٹل اور لازوال ہے۔ انسان جو اس کی قدرت وزیبائی کا مظہر ہے ضرور اس زمین پر اللہ کا جانشین ہوگا۔ مرد آگاہ منشائے الٰہی کے مطابق ضرور فتح حاصل کرے گا۔ وہ بڑھے گا پھلے پھولے گا اور کائنات کے ذرے ذرے میں خورشید کا لہو دوڑائے گا۔ وہ زمین آسماں چاند ستاروں پر عشق کی داستان رقم کرے گا۔ وہ انسان کوئی بے شعور اور بے معنی پتلا نہیں بلکہ زندہ و جاوداں حقیقت ہے۔ اس کا وجود حرکت عمل اور آگہی سے عبارت ہے اس کو ہر وہ چیز میسر ہوگی جو دنیا کو روح' انسان کو قدر' زندگی کو مسئولیت اور حرکت کو سمت عطا کرتی ہے۔ وہ خدا گو نہ انسان آزاد ہوگا' مسجود ملائک ہوگا۔ وہ حسن' خوبی' خیر اور ہنر سے تسخیر افلاک کرے گا۔ وہ عظمت کا پرستار' اقدار کا گرویدہ' آزادی کا متلاشی' جہاں آگہی سے خود آگہی اور نتیجتہ" خدا آگہی تک پہنچنے والا ہے۔ اس کے لئے موت بھی پھر امر بن جائے گی۔ اور وہ ابدلا آباد تک پائندہ رہے گا۔

ایسا انسان کثرت سے وحدت کی جانب' دنیاوی تاویلات سے آخرت کی بلند نگری تک' معاش سے معاد' شرک سے توحید' ترقی' "اسرا" تا مسجد اقصیٰ" اور تکمیل کا درجہ از معراج تاسدرۃ المنتہی حاصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہی جست میں قصہ تمام کردیتا ہے۔ وہ قرب خداوندی حاصل کرکے خدا کا ہم نفس بن جاتا ہے۔ اس میں ربانی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ اوامر ونواہی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ عشق وآگہی سے لبریز ہوجاتا ہے اور دنیا کو صرف مسافرت ہی سمجھتا ہے۔ وہ اصل سے وصل اور موجود سے لاموجود کی طرف لپکتا ہے

جس کا کچھ پتہ نہیں مگر وہ حرکت و عمل کو شعار حیات بناتا ہے۔ وہ فنا سے بقاء اور اپنی موت سے شہادت کے ذریعے حیات تک پہنچتا ہے اس کے دل کی صدا آزادی' اطاعت' اطمینان اور سچائی بن کر گونجتی ہے۔ "حق را برہام عرش میزنند" یہ نعرہ بلند کرکے وہ دوسری اشیا کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور جھوٹی شان وشوکت کو جھٹک دیتا ہے۔ وہ حکومت کا کاسہ لیس ہوتا ہے نہ شاہوں پیشواؤں کا چاپلوس۔ وہ تو ہمات کی دنیا سے چھٹکارا پاچکا ہوتا ہے۔ وہ خدا وند واحد کی پرستش کرتا ہے۔ وہ بقول اقبال ایک ہی در پر سر نیاز کو جھکا دیتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے آدمی کو دلاتا ہے نجات

یہ بندہ آزاد زن' زر اور زور وحیلہ کے جھمیلوں سے رستگاری پاچکا ہوتا ہے۔ وہ بے مروت ارباب دنیا کی چاپلوسی کرتا ہے نہ ضمیر فروشی اور کردار کشی۔ وہ اہل حرص کی نیاز مندیوں سے پنڈا آزاد کروالیتا ہے۔ عمر گزرتی جاتی ہے۔ سال مہینے' اور مہینے دنوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں وہ ہر روز پیدا ہوتا ہے۔ دن کے گھنٹے کام اور خدمت میں گزارتا ہے۔ شام کو گھر لوٹتا ہے۔ اسے پرقرار نیند آتی ہے۔ وہ دن رات کے سب گھنٹوں میں طاغوتی طاقتوں کی نفی کرتا ہے اور اپنی ذات کا اثبات اور اس کا اقرار اپنے رب العزت سے مانگتا ہے۔ کہ عبودیت کے لائق وہی ہے۔ وہ دعا میں ہدایت مانگتا ہے اس کے دل میں حرص و آز کے کیڑے نہیں بلبلاتے۔ بقول رباعیت عمر خیام

گردست بدی بر فلکم چوں یزداں
برداشتی من این فلک راز میاں

وزنو فلکی دگر چناں چناں ساختمی
کا زادہ بہ کام دل رسیدی آساں

خدا' انسان اور عشق ایک منصوبے کے تحت مل کر ایک جہاں نو تخلیق کرتے ہیں اور یہ تینوں کبھی زوال آمادہ نہیں ہوسکتے۔ یہ تینوں زور زر اور تزویر کے ہر حربے پر غالب آئیں گے۔ قوت ربانی انسان کے اندر حلول ہوگی اور حرکت و حرارت کا سامان پیدا کرے گی۔ فلاح فضیلت اور کمال سے لبریز ہوکر جب انسان ظلمتوں سے نبرد آزما ہوگا تو ظلم کا کلیجہ شق ہوجائے گا اور مشیت ایزدی کے بموجب عدل اور حق کی حکمران کا پھریرا لہرا اٹھے گا۔ اور معصومین زمین تاریخ کے وارث اور بشریت کے راہبر ہوں گے۔

ہم مشرق کے بیٹے ہیں۔ ہمارے تمدن حیات اور اس کی جزئیات پر مغرب کی یلغار اس مقصد کے تحت ہورہی ہے کہ وہ ہمارے ذہنوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے اور اس کے بدلے ہمیں ایک ایسی دنیا دے دے جو ہمارے افکار اور اقدار کو یکسر مٹ کردے اور ہمیں جامد اور منجمد کرکے اپنا پیروکار بنا ڈالے۔ ہمیں اس کالے سورج کے سایوں سے نکل کر اس روشن چمکتے سورج کے پاس پہنچنا ہے جو ہمیشہ چمکتا رہے گا مگر ابھی دبیز بادلوں میں پوشیدہ ہے۔ اس سورج نے ابھی جہاں سے پردہ کیا ہوا ہے۔ جو رعد کی طرح کڑک تو رہا ہے مگر ابھی برسنے پہ نہیں آیا۔

ہم تیسری دنیا سے وابستہ ہیں۔ اسے دوسری دنیا میں کہنا چاہئے۔ انسانی دنیا ہمیشہ دو حصوں میں تقسیم رہی ہے۔ وہ جو درد مشترک رکھتے ہیں۔ وہ ہم ہیں۔ ساری دنیا کے ہدایت یافتہ انسان جو سچائی کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اور اپنی اور دوسروں کی بھلائی چاہتے ہیں اس دنیا کے باشندے ہیں۔ یہ بقول فانان مستضعفین

(WRETCHED OF THE EARTH) کی دنیا ہے جن کی تاریخ' کہانی' سرگزشت ایک ہے۔ ان کا راستہ منزل اور نصب العین ایک ہے ہم سب مل کر دن میں پانچ بار ایک دوسرے پر درود بھیجیں کہ ہمارا اتحاد اور ہماری یکجہتی برقرار رہے۔

ہم اس صدی میں سانسیں تو لے رہے ہیں مگر یہ صدی ہماری نہیں ہے۔ ہماری زندگی کوئی اور گزار رہا ہے۔ مگر اس حقیقت کو جان لینے کے باوجود ہمیں اپنی سوچ کو بدلنا

نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارے ارد گرد جو کچھ ہورہا ہے۔ جو کچھ حالات و واقعات رونما ہورہے ہیں۔ ان روایات' تضادات اور ان کے محرکات پر غور کریں۔ قومی' انفرادی اور روحانی دنیا کے زیروبم کو جانیں۔ ہماری نگاہ بلند ہو اور اوپر کو اٹھے۔ خیروشر کی آویزش جاری ہے۔ سازشیں اور جوڑ توڑ ہو رہے ہیں۔ مفلسی' جہالت' بیماری اور تفکرات کے عفریت ہمارے ارد گرد پھر رہے ہیں۔ ہم ان کو دیکھ کر خوفزدہ نہ ہوجائیں بلکہ ہمارے جذبوں کو مہمیز ملے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تن آسان اور بے فکرے بن کر رجعت پسند قوتوں کا تر نوالہ بن جائیں اور جمود سکوت کی قوتوں کا شکار بن کر ان کے پیٹ میں چلے جائیں۔ حقیقت حال سے روشناس ہوکر ہم شعلے کی طرح لپکیں۔ جہان انسان کا نیا جہاں تخلیق ہورہا ہو ہم وہاں شہادت کے لئے موجود ہوں۔ یہ دنیا بھی ایک حقیقت ہے۔اس کے کاروبار میں ہم کو شریک ہونا ہے۔ کنارہ کشی ہمارے لئے غیر موزوں ہوگی۔ ہمیں ہی امت وسط کی نگران کار بنایا گیا ہے۔

بحیثیت مسلمان اسلام ہی ہمارے لئے ارفع ترین نظریاتی اساس ہے۔ اسلام عیسائیت یہودیت اور بدھ مت سے مختلف ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ عقائد کا مجموعہ مابعد الطبیعاتی تعلقات کانظام' عادات رسومات' مظاہر اور شعائر حیات کا امین' روایتی علوم ومعارف کا گنجینہ' تسکین روحانی کا ذریعہ اور اخلاقیات وضوابط کا خزینہ ہے۔ یہ آئیڈیا ہے' آئیڈیالوجی ہے' اور ایک عملی طریق کار بھی ہے اس نظام سے وابستہ ہوکر انسان ہیئت اجتماعی سے منسلک ہوجاتا ہے اور زندگانی کی حقیقت اور مقصدیت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ پھروہ اپنی فکر سے مزین اور مسلح ہوکر اغیار کی قوتوں کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ اس طرح تاریخ اپنی تجدید کا ایک نیا باب تحریر کرتی ہے ہم مغرب کے مقابلے میں عصر جدید میں اپنی اصلی حالت کا ادراک کرنے کے بعد پھر اپنے مشرق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور اس اسلامی آئیڈیالوجی کی طرف آتے ہیں۔ جس کا لازمی عنصر توحید ہے اور جس کے اجزاء ترکیبی کتاب اللہ سے ماخوذ حکمت' دانش' عدل' میثاق' عمل صالح اور فلاح انسانی اور روحانی ہیں۔ تقویٰ' ادراک امرونہی' اور احساس ذمہ داری یہ ہمارے ہتھیار بن جاتے ہیں اس کے بعد

مستضعفین جہاں زمین کے وارث اور امام قرار پاجاتے ہیں۔ اقبال نے کہا ہے۔

سنت ابر است ایں کہ گیرد از بحر آب
باز ہمی سوی بحر قطرہ باراں برد

اس قسم کے افکار اقبال کے مکتب فکر میں موجود ہیں۔ اس نے جمال الدین افغانی کے "قیام انقلابی" کو ایک آئیڈیالوجی کا روپ بخشا۔ اور اس کے بردمند نہال کو فکری گہرائی عطا کی۔ اقبال اپنے ماضی سے کسب فیض کرنے کے بعد جدید فکر کے بانیوں ہیگل' نطشے' کانٹ' گوئٹے کے مکاتیب فکر سے استفادہ کرتا ہے۔ اور پھر اس آمیزے کو وہ مولانا (روم) رستم داستاں کے قدموں میں ڈالتا ہے۔ تاکہ عشق کی گرمی اور تاثیر سے اسے برق تپاں بنا دے اور خود اسی فرزانگی سے ہدایت پاکر فرانس وبرطانیہ کے نقشوں اور ان آوازوں کو بھلا دے جو ان مناروں سے آتی ہیں۔ وہ صبح وشام صرف ان آوازوں پر کان دھرے جو رب کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہی دعوت اسلامی اور بازیابی رب جلیل انسانیت کی معراج ہے اس راستے پر چلنے والا سپیدئ سحر کی مانند روشن ہوتا ہے اور ہمیشہ بلندیوں کی طرف پرواں رہتا ہے اقبال نے پھر دریچہ فلک سے اتر کر اپنی کشتی کو بحر عرفان ومعرفت کی متلاطم موجوں میں ڈال دیا۔ اور ہوتا ہوا تا اپنی مشرق کی وادی کو لوٹا اور ساحل اسلام پر نمودار ہوا۔ تو اس طرح کہ کتاب اللہ اس کے ہاتھ میں تھی اور یہ کلمات لب پر " افسوس کہ یورپ میں بے حاصل اور بے ثمر زندگی گزار دی"

یورپی فلسفہ سائنس انسانی اقدار' طرز احساس سب مشینی دور کی پیداوار ہیں۔ وہ خشک' بے روح اور بے حرمت ہیں۔ عقل کہ حساس ترین آلہ ہے اور فطرت 'مزاج' حیات اور حرکات انسان کی تصویر اتارتی ہے۔ یہاں بے جان' بے روح اور بے سوز دروں ہے۔ ہمارا مقصد نہ زاہدانہ جوہر عشق وجان ہے اور نہ صوفیانہ جذب ومستی اور نہ ہی تخیلاتی بلند پروازی۔ ہمارا مقصد اس صلاحیت کا حصول ہے جو اشیاء کے جوہر اور مزاج کو دیکھے۔ ذہن رسا سے اس کی تصویر اتارے۔ جو ظاہر وباطن دونوں کو دیکھے۔ اور سب سے

اکتساب علم کرے۔ اور زندہ پیکر کے اندر تحلیل علمی کا تجزیہ کرے ۔ ایک عمیق' خوبصورت اور معنی خیز حقیقت کی پرتیں کھولے۔ عالم ملکوت کی پیچیدگیوں کو سلجھائے۔ وجود کے پرتو کی روشنی سے آفاق کو روشن کرے۔ کائنات کے تخلیقی اجزاء اور وجود کی نزاکتوں کو سمجھے اور اشیا پر مادی قدرت حاصل کرنے کے بعد ان کو کیمیائی فارمولوں کی طرح بڑے مقاصد کے لئے استعمال میں لائے۔

مغربی آئیڈیالوجی جو بظاہر انسان کی تشکیل کردہ ہے اور عدل وانصاف کی دعویدار ہے آخر کار ٹیکنالوجی کے ذریعے دستیاب ہوجاتی ہے۔ یہ بنیادی طور پر سائنس وحکمت کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس نے بورژوائی سماج کا زہر پی رکھا ہے۔ اس کی گود میں بیمار' نزار' فاسد اور تباہ کار اولاد پرورش پاتی ہے۔ اس سماج نے بیہودگی' عیاشی' حق کشی' جنسی بے راہ روی' سیہ کاری' دنیا طلبی' عربدہ جوئی' اور دوسری یزیدی اقدار کو فروغ دیا ہے۔ بے لگام اور مادر پدر آزادی کی چھوٹ دے کرکے یہ تمام حدود کو ختم کردیتا ہے۔ یہ نظام صرف آج میں یقین رکھتا ہے۔ کسی کتاب کو مانتا ہے نہ احتساب کو اور نہ آنے والے کل کی حقیقت کو۔ جب جو ابدھی ختم ہوجائے تو پھر نفس پر لذت کی حکمرانی شروع ہوجاتی ہے لینن کے قول کے مطابق اخلاق' اور اقدار کا تصور ختم ہوجائے اور احساس شعور اور مقصد کو موہوم قرار دے دیا جائے۔ اور سارا علم فریب ہی فریب نظر آئے تو پھر حقیقت اصلی نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔

مادہ پرست مغربی بصیرت مادی دنیا کو صرف ذہنی اور عقلی اشکال میں دیکھتی ہے۔ حقیقت اور اصلیت ان کی نگاہ میں اقوال عقلی منطقی ہیں جو صرف اپنا ایک خارجی وجود اور جواز رکھتے ہیں۔ ابھی تک یہاں کی دانش تاریخی جبر' سماجی ڈھانچے' اجتماعی تغیرپسندی اور ارتقا پذیری کو مادی جدلیات کے تناظر میں دیکھتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تمام سوشلسٹ انقلاب غیر صنعتی سماجوں میں برپا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ابھی سرمایہ دارانہ نظام' مشینی اقدار اور پرولتاری حقیقتوں کو صرف دور سے ہی دیکھا ہوتا ہے اور اس انقلاب کا ایک

نمونہ بطور استثنا کے بھی سرمایہ دارانہ سماج کے اندر رونما نہ ہوا۔ جو ہونا چاہئے تھا نہ ہوا۔ صنعتی اور سرمایہ داری سماجی طبقاتی دھماکے سے دور ہو تا گیا۔ امریکہ اور یورپ کے پرولتاری نظریہ باز سو سال ہوئے انقلابی شوق سے دستبردار ہو چکے ہیں اور مغربی اشتراکی پارٹیاں حیرت انگیز چابکدستی کے ساتھ بائیں سے دائیں جانب مڑ چکی ہیں۔ جہاں یہ انقلاب ہونے چاہئیں تھے وہاں یہ تصور ہزیمت اٹھا چکے ہیں اور حبشہ اور یمن جیسے ممالک جہاں ابھی تک ایک معاشرہ بھی نہیں بن سکا وہاں اشتراکی انقلاب کے آثار ملتے ہیں۔

شمالی امریکہ' شمالی یورپ اور فیڈرل جرمنی جو صحیح معنوں میں ترقی یافتہ ہیں جہاں پرولتاری سوچ پروان چڑھ سکتی ہے یہاں عوامی قوت اور اشتراکی عمل نے ایک اور طرح اپنا اظہار کیا ہے اور قیادت کا سہرا سجانے کی سعی کی ہے اور کسی حد تک بنیادوں کو بھی بدلا ہے۔ اقتصادی اور تاریخی جبر کے ساتھ پیداوار کے ذرائع بدلتے ہیں۔ دراصل یہی حقیقت پسندی کی تعبیر ہے کہ اس کو لفظوں کے گورکھ دھندوں سے نکال کر صرف اور صرف حقیقت جہاں کی صنعت میں دیکھیں۔ کائنات صورت قرآن ہمارے سامنے کھلی ہے کائنات کا اٹل قانون اور خداوند تعالیٰ کا سچا اعلان ہے۔ اعلان سلختمان اجتماعی کو پیدا کرتا ہے نہ کہ سلختمان اجتماعی انقلاب کو پیدا کرتا ہے۔

جو آئیڈیالوجی انسان اور جماعت کی شناخت ہے اور واقعیت پر مبنی ہے اس کو نظریاتی بحثوں میں نہیں الجھانا چاہئے۔ یہ حقائق سے چشم پوشی ہے۔ یہی نظریاتی شناخت اور واقعیت رسالت انسان کا دائرہ متعین کرتی ہے اور راہ ہدایت کی طرف سے لے جاتی ہے۔ اگر کوئی آئیڈیلوجی ایسا کرنے سے قاصر ہے تو اس کی مثال ایسی موٹر کی ہے جس کا نظام روشنی غیر متوازن ہے اور گیئر بھی خراب ہے۔ اسکی مشین چاہے کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ موٹر کی سواری خطرناک ہوگی۔ مشرقی نقطہ نگاہ سے انسانی اقدار اور باطنی کمالات کا درجہ بلند ہے۔ مغربی اصطلاح میں مادیت کو حرف آخر سمجھ لیا گیا ہے دوسری طرف اسلام اور مسیحیت دونوں کے نظریات کے مطابق طبیعات اور مابعد الطبیعات کے خانوں میں تقسیم کردیا

گیا ہے ایک کو اعلیٰ وارفع اور دوسرے کو سفلہ اور گھٹیا قرار دے دیا گیا ہے۔ مشرقیوں کے لئے دنیائے سرائے خاکی اور دنگا فساد کی جگہ ہے۔ حجاب معرفت ہے اور خدا کے وجود کو فرشتوں کے جہاں میں تلاش کیا جاتا ہے۔ خدا کو آسمانوں اور عالم بالا کا فرش نشین سمجھ کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔

دراصل قرآن اثبات خداوندی کے لئے سب سے بڑا ثبوت ہے۔ قرآن زبان وحی اور دینی مشن کا سب سے مقدس صحیفہ ہے۔ فلسفیانہ کج بحثیوں سے قطع نظر' ارسطو اور افلاطون کی منطق سے انحراف کرکے قران صرف اپنی زبان میں فطرت' تاریخ' زندگی اور قوانین علمی پر تکیہ کرتا ہے۔یہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا اس خاکی دنیا میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ طبعی قوانین کے مطابق اس کی نشاندہی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ مادی جبر جو درحقیقت نفی ذات خدا ہے۔ اسی سے اثبات خدا تک رسائی بھی ہوتی ہے۔ اثبات خدا کے لئے ارادہ خود آگاہی' پیروی اخلاق' سرچشمہ حیات اور عشق حقیقی کی ضرورت ہوتی ہے انسانی وجود میں جب نظم وعلم' معنی ومقصود' حساب وکتاب اور مغز وروح کا امتزاج ہوتا ہے تو انسان کبیر بنتا ہے۔

عظیم انسان فطرت کی تسخیر کرتا ہے۔ وضع قوانین علمی یعنی فزکس' بیالوجی کو سمجھتا ہے اور وہ صورتیں جو ہدایت انسانی کے لئے پیغمروں کی معرفت آئیں ان میں مٹھاس بھرتا ہے۔ وہ ان آیات کو فلسفیانہ اور مابعد اطبیعاتی موشگافیوں سے آزاد کراکے واقعیت علمی اور فنی کے ساتھ مزین کرکے اہل دنیاکے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ غور کرتا ہے سورج چاندستاروں' رعد' نور' دھوئیں' شب وروز' زلزلوں' حیوانات' جمادات' نباتات کی حقیقتوں پر۔ انسانی سماج کے مختلف طبقوں پر غور کرتا ہے۔ وہ دنیاوی اشیاء کی ماہیت واہمیت پر غور کرتاہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار کا مطالعہ کرتا ہے۔ انبیائے کرام ابراھیم' یوسف' مریم' نوح علیہم السلام کے بارے میں سوچتا ہے۔ مسائل انفرادی اور اجتماعی کا تجزیہ کرتا ہے۔ کیا یہ سب باتیں پست اور فضول ہیں۔ ہرگز نہیں۔

یہ پاکیزہ اور قیمتی امور ہیں۔ کیونکہ رب خود ان کی قسم کھاتا ہے۔ قسم ہے مجھے زمانے کی۔ زمانہ انسان کا سرمایہ ہے۔ جو عمل کرتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں وہ سرمایہ کو استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح رات کی بھی قسم کھائی گئی ہے۔ سورج کی قسم کھائی گئی ہے چاند جو سورج کے بعد آتا ہے۔ دن جو کہ رات میں بدلتا ہے اور آسمان جس میں رنگا رنگی ہے۔ زمین اور اس کے اندر موجود چیزوں کی قسم کھائی جاتی ہے۔ انسانی ذات کی قسم' انجیروں زیتون کی قسم' شہرا مین کی قسم' جفت وطاق کی قسم وغیرہ۔ ان کی جو اپنی جگہ اور مقام سے ہجرت کرجاتے ہیں۔ ان کی قسم جو جمدحیات میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کی قسم بھی کھاتا ہے۔ جو خطرات سے آنکھیں ملاتے ہیں ان کی قسم جو غور وتدبر کرتے ہیں۔ ان سرگرمیوں میں شرکت سے جھوٹ اور فریب کے اندھیرے گم ہوتے ہیں بقول خویہ باخ اللہ غنی ہے اور اپنی قدرت سے بندوں کو فقر سے آشنا کردیتا ہے۔ انسان اس کی بندگی سے ارادے کا مضبوط اور اشیاء سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

مارکس نے کہا ہے کہ فلاکت دینی تریاک مردم ہے۔ وہ انسان جو براہ راست قرآن سے استناد کرتا ہے اور تاویلات کے گورکھ دھندوں میں نہیں الجھتا تو اس پر سب کچھ عیاں ہوجاتا ہے اور جب وہ مذہب سے بحث کرتا ہے۔ تو قران جو علم ودانش کا خزانہ ہے اس سے تعلق نہیں جوڑتا بلکہ مسیح فرنگی' رومی تاجدار کے لئے خدا تعمیر کرتا ہے۔ تاکہ وہ قیصر کا جواب دے۔ تسلیم وتذلیل کی روایت دو ہزار سال سے اقتدار واختیار سے منسلک ہے۔(سامراج کے جھنڈے پر لہرا رہا ہے) خدائے زندہ جس کا حوالہ قرآنی آیات سے دیا گیا ہے۔ جو مجاہد کے گھوڑے کے سم سے اٹھنے والی گرد کی قسم کھاتا ہے اور جسے جدوجہد پیاری ہے وہ کوئی فرق نہیں کرتا۔ اور پھر نہیں پہچانتا کہ یونانی دیوتا جو نفی انسان اور اس کی جہالت اور تذلیل کے پرچارک تھے اور مغرب کی بورژوا سوچ کے تصور نفی خدا کی دلیل۔ کیا ان دلائل اور افکار کو قابل قدر سمجھا جاسکتا ہے۔

تیسری دنیا کے ہم جیسے روشن خیال افراد کو چاہئے کہ اس حقیقت کا ادراک کریں

کہ وہ لوگ ہماری فکر ودانش کو درخوراعتنا نہیں سمجھتے۔ یہ کسی المیے سے کم نہیں کہ ہمارے روشن فکر ان کی عینک اور زاویے سے اپنے فکر' فرہنگ' تاریخ اور ایمانی کیفیات کو دیکھتے ہیں اور ہرباب میں انہی کی تقلید کرتے ہیں۔

اقبال مشرق کا دلدادہ اس عنوان سے نہ تھا کہ اپنے افکار کو ان کے اسلوب میں پیش کرتا۔ اقبال بازگشت خویش' کے سلسلے میں رجعت قہقری کا شکار نہ تھا۔ وہ کسی فرسودگی اور علمی جکڑ بندیوں کا اسیر بھی نہ تھا۔ ذات کی طرف رجوع کرنے کا تصور اقبال کسی رومانوی ماضی پرستی کا شاخسانہ نہ تھا اور نہ ایسی کوئی چیز دکھاتا ہے۔ وہ قومیت کے بخار میں مبتلا نہیں۔ وہ کمال شدت کے ساتھ روح ہند' قوت عوام' ملی اقدار' تاریخی افتخار اور اصابت روایات کا پرچار کرتا ہے اور مغرب پر ان کی فوقیت کو ظاہر کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل کا جرمنی قومیت پرستی کے ایک جنوں میں گرفتار تھا جو اسے فاشزم کی راہ پر لے گیا۔ اس نے اس فلسفے کو قبول نہ کیا۔ اقبال مذہبی جوش وعقیدت کے ساتھ قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ ہیگل اور نطشے کا مطالعہ اور استفادہ بھی کرتا ہے۔ مگر نور صرف اپنے قرآن سے حاصل کرتا ہے۔ وہ رب جلیل کی دہلیز پر سر بسجود رہتا ہے۔ اسلام اور پنج تن پاک ں غلامی کا جوا گلے میں ڈالے رہتا ہے مگر ان باتوں کے باوصف وہ کوئی بے رنگ ونمک اور روکھا پھیکا عینیت پرست یا کٹھ ملا نہیں بن جاتا۔ اسلامی بصیرت اس کی سوچ کو رجعت پسندانہ نہیں بناتی۔ وہ عصر حاضر کا ہی انسان رہتا ہے۔ جو وقت کے فلسفے قومیت اور وطن کے تصورات سے آگاہ ہے۔

اقبال اسلامی قومیت اور دنیائے اسلام پر انحصار کرتے ہوئے امت مسلمہ کی بیداری اور تمام ملتوں کے اتحاد واشتراک کا خواہشمند ہے اور ملت اسلامیہ کو ایک واحد سیاسی مرکز پہ جمع کرنے کا متمنی ہے۔ تاکہ خلافت اسلامی کا خواب شرمندہ تکمیل ہوسکے۔ خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد اسلامی سیاسی قوت کمزور پڑگئی تھی۔ وہ تجدید وتشکیل وحدت اسلامی کا پرچارک تھا۔ اور یہ تحریک دوسری تمام جگہوں کے مقابلے میں سرزمین ہند پر جڑ

پکڑ گئی۔ اور آخر کار پاکستان کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

کیا اقبال کی آرزو صرف ایک مذہبی ریاست کی تشکیل تھی۔ جس میں سیاست' معاشرت معیشت' تعلیم' قانون کا سارا نظام ایک مذہب خاص سے متعلق ہو اور فکری طور پر انسان قرون وسطیٰ کے طرف لوٹے' اور رجعت' جمود' مرگ آزادی' نفی جمہور اور حقوق انسانی کی پامالی کے مناظر سامنے آئیں۔ دینی ظلم واستبداد کی بازگشت سنائی دے اور وہ روشنیاں بجھ جائیں جو تاریخ کے طویل سفر نے انسان کی راہوں میں سجائی تھیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہ تھا۔

ان کا مطمع نظر مذہب پر کامل ایقان تھا۔ ان کی نگاہ میں اسلام کی اصلی اور خاص شکل تھی۔ جو ایک ذاتی عقیدہ ہونے کے ساتھ ایک اخلاقی نظام' روحانی تڑپ اور باطنی تعلق کے حوالے سے رب کے ساتھ مربوط ہے۔ اسلام اقبال کی نگاہ میں ایک ایسا نظریہ اور ایسی آئیڈیالوجی ہے۔ جو انسانی زندگی کی تمام جہتوں اور اس کے باوجود تمام رخوں (مادی' اجتماعی اور معنوی) کا احاطہ کرتا ہے اور سماج کو حرکیت سے آشنا کرتا ہے۔ اور حرکت دینے کے ساتھ رستے کا تعین بھی کرتا ہے۔

اسلام سرشت اور سرنوشت میں تبدیلی کا نام ہے۔ یہ طبقاتی روابط اور پیداواری رشتوں' اس کی تقسیم واستعمال کے امور میں تغیر کا نام ہے۔ نظام اخلاق' تعلیم اور فکر میں تبدیلی کا نام ہے۔ اور انجام کار یہ اساس حیات' فلسفہ ذات وجماعت ضوابط وقواعد اور سیادت وقیادت کی تبدیلی کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کو تسبیح وزنار درود وظائف ذکر اذکار' کرامات کی تکرار' احساسات کی تلقین' تبلیغ ومناجات' تعظیم شعائر' ترتیب مراسم ایسی روایتی اور رسمیاتی چیزوں کے لئے کام میں نہیں لانا چاہئے۔ اس کے نتیجے میں محراب ومنبر کی زبوں حالی میسر نہیں آنی چاہئے۔

ایسی صورت میں کیا اسلام کی تجدید بطور آئیڈیالوجی ممکن ہے اور اس کے ذریعے دعوت' رسالت تحریک نہضت وبعثت' زندگی سے معمور فلسفے آسمان سے زمین' ماضی سے حال

اور موت سے پہلے (بعد نہیں) توحید' عدل اور امامت کی طرف پیش رفت ممکن ہے۔ کیونکہ استعماری راج کے لئے جہالت' مکر' خواب غفلت اور راویتی اسلام ہی کار آمد ثابت ہوسکتے ہیں اور انہی چیزوں کی نشوونما کی کوشش بھی ان کی خدمات سے کی گئی۔ اسلام کے نام پر مکرو ریا آئے مگر اسلام ظہور پذیر نہ ہونے پر پائے۔

انقلاب کی نشوونما کے لئے ان غفلت وجہالت کی گھاٹیوں سے نکل کر مقابلہ ومقاومت کے میدان میں قدم رکھنا ضروری ہے۔ اسلام دین بھی ہے اور امت بھی۔ اور رسالت ونبوت سے بھی سرفراز ہے اور امامت کی مسئولیت سے بھی بہرہ مند ہے۔ چنانچہ یہ فطری نظام جب بھی اپنے اصلی وجود میں آئے گا تو استعمار کی ہر صورت کو خواہ مادی ہو یا فکری مسترد کردے گا۔ یہ نظام مارکسزم سے بڑھ کر انقلابی ہوگا اور اس کی آئیڈیالوجی اس سے وسیع تر ہوگی۔ یہ ایک قطعہ ارض کا پابند نہ ہوگا بلکہ عالمگیر ہوکر پھیل جائے گا۔

ہمارے عہد کا انسان اپنی بصیرت و روح کے ساتھ اصالت انسان کی طرف گامزن ہوگا اور حکومت عوام' آزادی افکار' اجتماعی بنیادوں پر سیاسی حکومت کے غیر مذہبی ہونے جیسے مسائل سے عہدہ برآ ہوگا۔ کیا اس سے تیسری دنیا کی وحدت اور سامراج کے مقابلے میں پسماندہ اقوام کا اتحاد روبہ عمل ہوگا۔ طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ممکن ہوسکے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کو جڑوں سے کاٹ پھینکنے کے لئے بورژوا طبقے کی استحصالی زنجیروں کو اتارنے کا کوئی سامان ہوگا۔ کیا انسان اور اسلام اس ضمن میں اقدام اٹھانے کی راہ متعین کریں گے۔

کیا تجدید کا مرحلہ ہم طے کرسکیں گے۔ اخلاقی اقدار کی ترقی' انسانی روحانیت کا ارتقاء عرفانی ذوق کی ترفیع کا سامان ہوسکے گا اور روح وفکر کی بالیدگی وبلندی کا احیاء ممکن ہوگا۔ خودی کے نور سے منور پاک معاشرہ' عشق کی آگ سے پگھلا ہوا اور تاریخی جبر کی گزرگاہوں سے نکلا ہوا کامل انسان' مذہبی تربیت اور متصوفانہ افکار کی تاثیر سے مالا مال پاک معاشرہ اور انسان کیسے اور کب ظہور پذیر ہوگا۔ فلسفے کی آئیڈیالزم' آرزومندی' انقلابی رومانیت انسان شناسی مابعد الطبیعاتی دلبستگی اور ماضی سے جذباتی وابستگی' مذہبی تعصب مشرقی

تصوف کی الجھنوں کا کوئی علاج ہے۔

اگر ہم مغربی ذہن سے سوچیں اور ان کی زبان میں اظہار مدعا کریں تو اس کا جواب ہمیں ایک طرح سے مل جاتا ہے۔ اقبال کی فکری بصیرت بھی ان سوالوں کا جواب ہمیں فراہم کرتی ہے مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے روشن خیال لوگ اپنی روایات منطقی وطبیعی تسلسل اور تاریخی انقلاب کے تصور سے آشنا نہیں ہوئے ہیں۔

ہمارے عوام کا بحرالعلوم علیؓ اور امام صادقؒ ہے اور اس کے برخلاف خواص کے فکری راہنما کوئی اور ہیں۔ ہماری دوڑ مرزا مکلم خان اور لاتاری تک ہے۔ ہمارے دارالعلوم کے مقابلے میں قائم کی گئی یونیورسٹیوں کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر بلکہ صفر ہے۔ ان میں اوریجنیلٹی نہیں ہے۔ ترجمے ہیں یا فرنگی کے چبائے ہوئے نوالے ہیں۔ ہمارے روشن خیال لوگ اپنی مادری اور قومی زبان نہیں بولتے جو فارسی بولتے ہیں وہ فرانسیسی اور انگریزی سے گڈ مڈ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ انگریزی صحیح طور پر جانتے ہیں نہ فرانسیسی۔ خواص کا جو طبقہ ہے۔ وہ بھی مغرب کا گماشتہ گائیڈ' ٹوسٹ اور مقلد ہے۔ فکر' مذہب' اخلاق' فرہنگ' حسن' رعنائی' فن' تاریخ' سوسائٹی اور انسان کے ظاہروباطن کی تفہیم وادراک نہیں رکھتا۔ وہ بنیادی طور پر مغربی قدروں کا غلام بن چکا ہے کہ اس کے لئے ان سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ یہ روگ سرطان کی طرح اس کے رگ وپے میں سرایت کرچکا ہے۔ جب تک اس کے جسم میں سارے کا سارا خون تبدیل نہ ہوگا۔ تو یہ طبقہ تبدیل نہیں ہوگا۔ کیونکہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جو خود اندر سے تبدیل ہونا نہ چاہتی ہو۔

اقبال کے افکار ومطالب کو سمجھنے کے لئے ہمیں مغربی انداز وفکر کا از سرنو جائزہ لینا ہوگا۔ سورہ رعد (سورہ ۱۱) میں واقعہ نقل ہوا ہے۔ کہ کیسے حاجی صاحبان اور سنت ابراہیم ادا کرنے والے زمانے کے نمرودوں سے ہم کلام ہوجاتے ہیں۔ ان کو اصحاب کہف کے غاروں میں دقیانوسی سکوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہ حاجی صاحبان جب اس فریضے سے لوٹتے ہیں تو سنگدلی ریاکاری اور مکاری میں طاق ہوجاتے ہیں۔ اور وہ مومنین جو

اس قافلے میں شامل ہوکر گئے تھے۔ ان سادہ لوحوں کو بھی سوائے ذکر اذکار' وظائف ودرود' الفاظ و آداب اور شعائر' رسمیات کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ متاع حیات جو ان غریبوں کی زندگی کا حاصل تھی۔ ان کے پیشواؤں نے ان سے چھین کر ان کو قعر ذلت میں پھینک دیا اور وہ ایک بے آب وگیاہ اور بے نداہ صدا وادی میں پہنچ گئے۔ میں کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں کررہا۔ تیسری دنیا کے ممالک میں آباد نئی نسل ان حقائق کو دل وجان کے اندر محسوس کررہی ہے۔ یہ اور اس قسم کے عوامی تجربات ہیں جن کے اندر کوئی تبدیلی کی چنگاری نہیں سلگ رہی۔ اور پھر لوگ حج پر جانے کی جگہ ترکستان کی طرف پھر گئے۔

ہمارے روشن فکر افراد جانتے ہیں کہ آج کے انسانوں کی مشکلات کیا ہیں۔ وہ روز اس قسم کے المیے دیکھتے ہیں جو واضح طور پر رونما ہورہے ہیں لیکن یہ لوگ ٹھیک طرح نشاندہی نہیں کرسکتے کہ درد کہاں پر ہے۔ وہ اسی درد کے مداوا کے لئے بے اثر نیم حکیموں کے پاس جاتے ہیں۔ کبھی ظاہر پرست مفکر کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ ہر ایک راہ رد کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہر گریباں کو پکڑتے ہیں۔ طرح طرح کے قیاس وگمان کرتے ہیں۔ کبھی ان حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور دشنام وتہام پر اتر آتے ہیں۔ تحقیق وریسرچ کے انداز میں اپنے گریبانوں کو چاک کرتے ہیں۔ جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں۔ اور ساتھ فریب بھی اور طرح طرح کے جنجال اور جھگڑے کرتے ہیں۔

جماعتیں ایک دوسرے پر کفر وفسق کے فتوے لگاتی ہیں اور عہد وسطیٰ کو یاد دلانے والے مذہبی' گروہی' لسانی اور کلامی فسادات برپا کرتے ہیں۔ فروعی اور بے حقیقت باتوں میں معصوم اور قیمتی جانوں کا خون بہاتے ہیں۔ عوام الناس کو اس طرف لگا کر گمراہ کیا جاتا ہے اور نئی نسلوں کی ہلاکت کا سامان کیا جاتا ہے۔ قیل وقال کے جھگڑے' مختلف النواع جدال وقتال کے قضیوں میں مخالف اور برسرپیکار فرقے اور گروہ نمودار ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلانا مرتد اور بدعتی ہوگیا ہے۔ فلاں بوژوا خصلت رکھتا ہے۔ شخصیت پرستی' سٹالن ازم' ماؤازم' مذہبی احیاء' انقلاب پسندی کا الزام' حتیٰ کہ ایک انسان زندگی میں کئی بار مرتد قرار

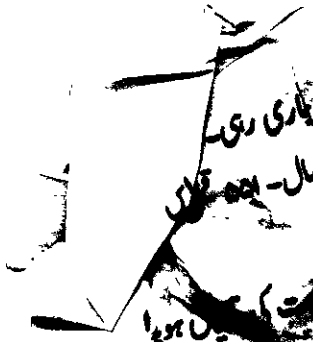

پایا تو کبھی باز مومن بنتا کبھی وہ کافر ہوا تو کبھی امام ہے۔ [illegible] جاری رہی۔

طرف درمیان ہوا کہ نہیں یہ ساری مصیبتیں [illegible] فلوطینس (متوفی سال ۔ ۲۷۰ قبل

پیدا کرتے ہیں۔

اس قسم کی روش [illegible] مندی کا ماحاصل

ہوتی ہیں۔ استعمار [illegible] رفتہ رفتہ اس کا [illegible] میں ہوا

قدیم فرہنگ میں چرخ کج مدار۔ اور فلک [illegible] فرہنگ میں روزگار کا نام د[illegible]

استعمال ہوتا تھا ان لوگوں نے [illegible] کو علت بنادیا [illegible] مذہبی پیشوا [illegible] کے لئے

معمولات عقل کی علت فاعلی سے تعبیر کیا ہوا ہے [illegible] خود اپنے فلسفہ کے مطابق

علت العلل سے غفلت برتی گئی ہے۔ [illegible] قریب اور بعید کو موقوف کراکے

روشن فکر انسان جو علمی [illegible] کے قطعے کا قائل ہے اس کے ساتھ تقلید کو رجوع

کرنے اور احیاء کے تصور پر سختی سے اعتقاد رکھنے والا بھی ہے یہ سوچتا ہے کہ یہ خود آگاہی

انفرادی [illegible] یہ معاشرتی آگاہی کی تاثیر ہے جو انفرادی خود آگاہی کو متشکل کرتی ہے

حیات سماجی میں [illegible] افراد انسانی حق کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں تو کچھ برعکس فکر

[illegible] علم و عمل، سائنس و ٹیکنالوجی اور طریقہ ہائے پیداوار کو فوقیت دیتے ہیں اور ان کے

نتیجے میں انسان کو بھی محض خریدار بنا دیتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے نظریات،

[illegible] انقلاب، حرکت، جہت، ایمان، مسئولیت عمل، جہاد سب کچھ منفی عمل کا شاخسانہ ہے

اور اس لحاظ سے قوم و ملت کا مقدر اقتصادی پیداوار کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ اور فرد اور

معاشرے کی تقدیر وہی چیز ہے۔ جو محیط خارجی (جو قاہر و قادر ہے) اپنے ہاتھوں سے تشکیل

کرتا ہے۔ مارکس کے بیان کے مطابق وجدان انسانی، مخلوق جبری و طبعی اور وضع اجتماعی ہی

انسان ہے۔ اس حقیقت کو یعنی اصالت انسان کو سمجھنے کے لئے کوئی زیادہ ہوش مندی کی

ضرورت نہیں۔ صرف عقل آزاد و سالم کی احتیاج ہے۔

اسلام قوانین علمی و عوامل اجتماعی کی نفی کرنے کی جگہ ان پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور

ما شناخت اور پیروی کی طرف راغب کرتا ہے۔ اجتماعی نظام کے تعین میں خود آگاہ قوت عمل اور استعداد انتخاب کو تقدیر کے معاملات پر خودی و عمل کے ساتھ بطور ایک کیتی کار جگہ دیتا ہے۔ اسلام میں سب سے زیادہ زور ایمان کے ساتھ عمل اور مسلسل عمل پر ہے۔ یہ عمل بھی ایسا ویسا نہیں صالح اور روشن ہے۔ اسلام اجتماعی تبدیلی یعنی انقلاب کو وضع انسانی کے تغیر کا معلول جانتا ہے اور انفرادی انقلاب میں آگہی اعتقاد اور عمل پر تکیہ کرتا ہے۔ اسلام واضح کرتا ہے کہ معاشری انقلاب ظاہر میں نہیں باطن میں برپا ہوتا ہے۔ یہ نفس کا انقلاب ہوگا' اندر سے آئے گا اور باہر کو بہالے جائے گا۔ اس مقام پر اصالت، عظمت اور مسئولیت انسان کا احساس ہوتا ہے۔ اور اسی سے زندگی کی بنیاد اور وضع اجتماعی کے تغیر کا تاریخی نکتہ نمایاں ہوتا ہے۔ جن انسانوں کی تقدیر اجتماعی معین کرتی ہے مسئول نہیں بلکہ معلول ہیں۔ اس طرح اسلام تقدیر سے متعلق ایک قوم کے وجود کو انسانی ارادے کے سپرد کر دیتا ہے۔

روشن فکر انسان معلول بن کر نہیں تاریخ میں خالق کے طور پر ابھرتا ہے۔ اس دلیل کی بنیاد پر حامل عزم بھی ہوتا ہے اور ذمہ دار بھی۔ ایسی صورت میں ابراہیم اور مو کے کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ رب کریم نے فرعون اور نمرود کو اس بات کی تنبیہ کردی تھی۔ پیغمبروں کا شکوہ اور ان کی عظمت ان کی ذمہ دارانہ حیثیت کے حوالے سے متعین ہوتی ہے۔ روشن فکر انسان کی اپنے نظریے وعقیدے سے وابستگی سماج میں اجتماعی مسائل کا تجزیہ اور تحلیل سکھاتی ہے۔ اس کی وفا شعاری تاریخ اور اس کے سیاسی انقلابات کے زیر وبم سے آگہی بھی سکھاتی ہے کیونکہ یہی وفا شعاری اس کے عمل کی بنیاد پر (تاریخ کے) نتائج اور جدوجہد کا رخ بھی متعین کرتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال نمودار ہوتا ہے اور ایک زیرک مفکر اور اسلام شناس کے طور پر استعمار کے خلاف برسرپیکار ہوجاتا ہے۔

روشن فکر اقبال اپنے عہد کا متجمد مجاہد اور پرجوش اور صاحب عمل انسان ہے۔ وہ

اپنی قوم کے لوگوں کی ذہنی اور فکری کائنات کو بدلنا چاہتا ہے۔ اقبال پہلے مرحلے میں جہاں بینی پہ عمل کرتا ہے۔ مگر یہ جہاں بینی وہ نہیں جسے آج کا مغرب زدہ دانشور جہاں بینی خیال کرتا ہے۔ مغربی عینک سے معاشرے کو دیکھنے والا روشن فکر اس فلسفے اور نظریے کا کلی ادراک نہیں کرسکتا۔ اقبال کی جہاں بینی منفرد اچھوتی ہے اور اس کی جڑیں فکر ودانش کی گہرائیوں میں ہیں۔ اور ہمارے ایمان کی اصلیت کی مظہر ہے۔ اس کی آبیاری ہمارے سرچشمہ حیات سے کی گئی ہے۔ اس جہاں بینی میں جو ہر اشراق شرقی' عمق ولطافت' وحدت ویگانگت' علم وعرفان اور مثبت اور روشن سوچوں کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔

یہ اسلامی سوچ کا وہ رخ ہے جس کی فکری بالیدگی اور فلسفیانہ پرواز مغربی علوم کے مطالعے نے فراہم کی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے اندر ایک منطقی ہم آہنگی اور فطری اسلوب بھی پیدا ہوگیا ہے۔ اس کی جڑیں انسان کے فلسفیانہ' نظریاتی تسلسل سے بھی وابستہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تاریخی لحاظ سے قوموں اور انسانوں کے درد مشترک کا ادراک بھی رکھتی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اسلامی جہاں بینی کی سوچ اور اپروچ کو دوسرے تمام فلسفیانہ طرز ہائے فکر سے جدا کرتی ہے۔ اسی فرق کو اپنے انبیاء اور حکماء اور دوسرے فلاسفہ مغرب مثلاً" سقراط' افلاطون اور ارسطو کے ہاں دیکھ سکتے ہیں۔ اول الذکر عین الیقین کے درجے پر فائز ہیں تو موخرالذکر حق الیقین پر۔

علامہ اقبال کی عالمگیر جہاں بینی بھی تمام فلاسفہ کے نظریات کی چھان پھٹک اور تجزیہ وتحلیل کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ اس تجزیے کی بنیاد پر ہی وہ اپنی فکری عمارت کو بلند کرتے ہیں۔ دانش اسلامی کی تاریخ میں اس نکتہ نظر کا ظہور تیسری صدی ہجری میں یونانی اثرونفوذ کے تحت شروع ہوا۔ اس کے اثر کے تحت ابن سینا' رازی اور ابن رشد منظر عام پر ابھرے اور ہمارے فکر وفلسفہ کو متاثر کیا۔ ارسطو کے افکار کو موسیقی کی منطقی اور تخلیقی قوت نے خرد افروزی اور اجتہاد میں بڑی مدد دی تھی بعینہ اسی طرح قرآنی جہاں بینی کے اسلامی تصور حرکت وایمان کو بھی اس فکر نے تبدیل کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی

حرکت اور اجتماعی قوت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

علمی رویوں کی اس تبدیلی کی وجہ سے مدینہ------ تبدیل ہوگیا۔ مسجد نبوی اکادمی افلاطون اور اصحاب صفہ آخر کار علمائے خطاب کی درس گاہوں کی شکل اختیار کرگئے۔ یہ ساری خرابی یونانی اثرات سے ہی وارد ہوئی۔

اقبال نے انہی عناصر کے خلاف پیکار کا آغاز کیا جو جاری ہے اور جاری رہے گا۔

تڑپ رہا ہے فلاطون میاں غیب وحضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اقبال ایک روحانی سفر کے دوران دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کے انداز پر مولانا روم کے مقابلے میں ہیگل کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور کہتا ہے کہ فکر مغرب کا اسفندیار ہمارے پہلوان کے تیر سے گھائل ہوجاتا ہے۔ اب ہماری فہم امام رازی سے ہم آہنگ ہوگئی ہے اور جہاں بینی حقیقت سے معانقہ کرتی نظر آتی ہے۔ یہ کیفیت بڑی پر جوش اور پر حرکت ہوجاتی ہے۔ حقیقت افروزی آگ اور دھوئیں کا کوئی فارمولا نہیں۔ بلکہ آگ کو مٹھی میں پکڑنے کا نام ہے۔ حرکت وحرارت میں براہ راست ملوث ہونے کا نام ہے۔ اس طرح کائنات کی حرارت اور حرکت انسان کے ذاتی وجود میں سماجاتی ہے۔ یہی کائنات اصغر کہلاتی ہے۔ جو کچھ دو عالم میں نہ سماسکتا ہو وہ ایک انسان کی ذات میں مجتمع ہوجاتا ہے۔ "ہر کہ دو عالم بگنجد آدم امت" والا معاملہ ہوجاتا ہے۔ اس منزل کو وکٹر ہیوگو "نماز" کا نام دیتا ہے۔ اس سے اگلا قدم حیرت سے عبارت ہے۔ یہ قدم ہستی وکائنات کی زیبائی اور شکوہ فراواں سے پیداہوتا ہے۔ جو آخر آخر بے قراری' خود شکنی' خود شناسی اور خود گدازی پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور یہ عالم پرواز میں ہی زندگی کے اصل سروں سے ہم آہنگ ہوکر وصال

حاصل کرلیتا ہے۔ چنانچہ اس کا قلب متحرک ہوجاتا ہے۔ اور وہ روح جو اسکی طبیعت مالیہ : نقش اعظم ہے اس کا اظہار (جسمانی) بن جاتی ہے اس کا جسم لہوولعب کا شوقین نہیں رہتا اور نہ وہ انفعال وندامت کا شاخسانہ بنتا ہے۔ وہ صرف روحانیت کا مظہر بھی نہیں رہتا بلکہ وہ ایک طرح نو کا موجد بن جاتا ہے جو اپنی مسلسل کوششوں سے ایک نئی دنیا او ر کائنات کا خلق بن جاتا ہے۔

میرے لئے فقط زور حیدری کافی
تیرے نصیب فلاطون کی تیزی ادراک

میری نظر میں بھی ہے جمال وزیبائی
کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن وجمال بے تاثیر
تیرا نفس میں اگر نغمہ نہ ہو آتش ناک ا

فلسفی کی جہاں بینی کیا ہے۔ واقعات وواقعیت کا علم' ہیولی اور صورت کا علم' مادہ ومرکب' مجرد اورخاکی' افلاکی اور لاہوتی' محسوس ومعقول' علت ومعلول' مادہ وطاقت' مثبت ومنفی' الیکٹرون پروٹان' فوٹوں اور ایتھر اور حرکات وروابط کا علم۔ یہ سب فلسفہ وعقلیت کے جواہر ریزے ہیں۔ عام انسان انہی عناصر کو دیکھ کر علم حاصل کرتا ہے اور انہی رنگا رنگ اور بوقلموں اشیاء سے آگاہ ہوکر اپنی معلومات کو فروغ دیتا ہے۔ انہی چیزوں اور تاثرات کے توسط کے ذریعے آنکھ اور ذہن کا رابطہ استوار ہوتا ہے۔ انسان کا عمل پھر اپنی ذہانت کے بل بوتے پر انہی معلومات علمی وحقیقی اور شواہد عینی سے تربیت پاتا ہے۔ وہ حقائق سے براہ راست صاف اور شفاف رابطہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنی علمی پندار پہ نازاں ہوکر خود لذتی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کھیل کا نام اس نے فلسفہ رکھ دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں عرفان نگاہ

اسباب و ظواہر میں نہیں الجھتی، قصوں کہانیوں اور شخصیتوں میں گم نہیں ہوتی۔ فلسفیانہ غرور کی اسیر نہیں۔ انسان صاحب خبر کی جگہ صاحب نظر بن جاتا ہے اور صاحب نظر جان نور میں آنکھ کھولتا ہے تو وہ حقیقت سے براہ رست آنکھ ملاتا ہے۔ ایک عاشق مضطرب کی طرح اس سے ملاقات کرتا ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں خود ہے صاحب ادراک

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

یہی مقام ہے جہاں اقبال مولانا روم سے پوچھتا ہے

خاک تیری نور سے روشن بصیر
غایت آدم خبر ہے یا نظر

اسکو پھر جواب ملتا ہے

آدمی دید است باقی پوست است
دید آن باشد کہ دید دوست است

خبری آگہی بمقابلہ نظری آگہی کیا چیز ہے۔ اس کا کیا مقام ہے۔ دیدہ بینا کا کیا نظریہ ہے۔ اقبال بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خون
علم حاضر سے ہے دین زار و زبوں

علم حاضر یا ہے۔ یہ خون کی ندی ہے جو دیدہ بینا سے جاری ہے یہ آنکھ کوئی راز اگل رہی ہے۔ بینائی اور خون آپس میں کیا تعلق رکھتے ہیں اس مقام پر شناخت اور آگہی فلسفیانہ علمی عرفانی اور دینی سطح پر جہاں بینی میں دو چہرے نمایاں کرتی ہے۔ کبھی فلسفی اس

مقام پر خبری بن جاتا ہے یعنی انسان اور واقعہ کے درمیان رابطہ۔ اس کے بعد وہ عالم و معلوم کے درمیان بھی رابطے کا سامان بن جاتا ہے۔ لیکن عرفانی جہاں بینی میں اشیاء کا تصور نہیں حقیقت کا دیدار ہوتا ہے۔ حق وجدان میں جگہ پاتا ہے اور قلب کی گہرائیوں میں سمٹ جاتا ہے۔ حقانیت کا چہرہ عیاں ہوتا ہے۔ حق حقانیت سے ہم کنار ہوکر نعرہ ان الحق بلند کرتا ہے۔ وہ بات جو منبر پر نہیں کہی جاسکتی دار پر آکر کہہ دی جاتی ہے۔ یہ حق کو ظلمت' جہالت' ہنگامہ آرائی' وسوسوں کمزوریوں کو حقانیت کی قوت مسیحائی سے بدل ڈالتا ہے اور پھر موت نوبیاہتا دلہن کے ہار کی طرح اس کے گلے کا سنگھار بن کر سامنے آتی ہے۔ پھر وہ معصوم اور بھوکے شیرخوار کی طرح شہادت کے تھنوں سے ہمک کر دودھ پینے لگتا ہے۔

خودی کیا ہے۔ خودی تین عناصر سے اپنی ہیئت کو تشکیل دیتی ہے۔ یہ تین عناصر ہیں درد' عشق اور عمل۔ یہ وہ عناصر ہیں جو ہیگل کے بے غم فلسفہ اور بیکن کے خشک علمی استدلال سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس بے روح فلسفے نے انسان کو بے اثر' بے نمک' خشک' کمزور اور آسیب کا شکار بنادیا ہے۔ بقول سیمون کے آج کے انسان کسی چیز کے منتظر نہیں سوائے ٹیکسی کے۔ اس کے مقابلے میں درد' عشق اور عمل سے آگہی حاصل کرکے اس کا ہم زاد اور ہم نژاد بن جاتا ہے اور اس طرح اسمیں اکملیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ عقل' تمدن' فرہنگ' ہنر' زندگی کی دوئی ختم ہوجاتی ہے۔ حقیقت کی تلاش کو چھوڑ کر طاقت وتوانائی کے حصول کا تصور دم توڑ جاتا ہے وہ دوسرے علم نظر کا متلاشی ہوجاتا ہے۔ جو عبارت ہے نور' واقعیت' وسعت پذیری' خوش بختی اور تسکین جسم وجان اور روح وایمان سے۔ یہ علم جو حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ انسان کو آزادی' اقدار ارفع تزکیہ نفس' بے نیازی' تقویٰ' کاملیت سے ہم کنار کرکے عرش خداوندی کی حقیقت سے مزین کردیتا ہے۔ وہ پھر ایسے کتب میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے سورہ رحمان کی تفسیر سامنے نظر آنے لگتی ہے۔

اقبال کی نظروں کے سامنے بوعلی سینا کی آگہی ہے۔ اسے ایسے لگتا ہے کہ جیسے وہ ایک جنازہ کے قریب کھڑے ہوکر وسیع وعریض قبرستان کا نظارہ کررہا ہے' وہ تعزیت کرتا

ہے' اطلاعات جمع کرتا ہے' مگر اس کی تشنگی' بے قراری' مجبوری دور نہیں ہوتی۔ وہ چہرہ کائنات کو تکتا ہے اور حریم آشنائی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر دیدار میقات میں اور حضور میعاد میں ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں "حیدری نگاہ" جمال اور زیبائی سے معمور ہے۔ وہ ایک ایسے دروازے پر پہنچ چکا ہے۔ جہاں اسے کائنات کا اصلی روپ اور رب کا چہرہ حسین دکھائی دینے لگتا ہے وہ یہاں ٹھہر کر نظارہ جمال کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ نظارہ صرف خبر تک محدود نہیں ان میں دل گرم کے قرار کا اہتمام بھی ہے۔ یہی مقام ہے جہاں سے لبیک کی دعوت بلند ہوتی ہے اس دعوت کو سن کر وجود پگھل جاتا ہے اور درد اندر کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ اس مرحلے پر ان دیکھی لذتوں کا لطف' شوق وصال کی فراوانی' درحبیب کھلنے کی آرزو' آنسوؤں کی بوچھاڑ کے جلومیں کر آتی ہے اور درد دل پر دستک دیتی ہے۔ انسان آرزومند کے اندر جنون و مستی کا چراغاں ہوجاتا ہے اور وہ لذتوں کے دروا کرنے کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھتا ہے۔ پھر سرمستی کے دبستان کا در کھلتا ہے۔ جس میں علم' درد اور عشق کے چشمے نظر آجاتے ہیں۔ یہی انسان کا عمل اور سعی پیہم کی انتہا ہے اور آخر اس کا سر رب جلیل کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔

گفت پیغمبر رکوع است وسجود
بر در حق کوفتن حلقہ وجود

اس کے بعد فہمیدن کی تشریح ہوتی ہے جو ہمارے مشرقی ادب کی جان ہے اور گہرائی کی حامل ہے۔

عقل خشک کے مقابلے میں عقل سرخ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ عقل سرخ آتش ناک' متحرک اور فعال ہے جو کائنات کی پرتوں کو چیرتی' سیدھی تہہ تک پہنچ جاتی ہے اور روح عالم سے ہم کنار ہوجاتی ہے۔ یہ اضطراب' انقلاب' تغیرات کی مظہر ہے۔ یہ عقل طبعی' اجتماعی' طبقاتی اور انسانی تاریخ کا روشن چہرہ بن جاتی ہے۔ یہ اقدار کے حسن اور رعنائی کی بلندی وعظمت' آزادی وخودی کی زیست کو سنوار دیتی ہے۔ یہ حیوانی اشیا کی

ماہیت کو تبدیل کردیتی ہے۔ یہ بندر نما ہو' یتیم انسان کو انسان خدا نما میں ڈھال دیتی ہے۔
وہ انسان جسے کھنکتی مٹی سے تخلیق کرکے اس میں روح یزدانی پھونک دی گئی تھی مگر یہ روح پرداز اشیا کی سرگردنی میں گم گشتہ ہوجاتی ہے۔ پھر اسی امانت خداوندی کو ہاتھوں میں لے کر اس پر میثاق فطرت لکھ کر آویزاں کردیا جاتا ہے۔ خود آگاہ ہوکر انسان لذائذ دنیوی کو حرزجاں بنانے کی جگہ بانسری کی روپ دھار لیتا ہے جو اندر سے خالی ہوکر دکھ کے نغمے ابھارتی ہے۔ اسکے ساتھ فرقت کا غم' عشق کی کیفیت' اور جزو کے کل سے ہم کنار ہونے کا شوق فراواں اس کا جز وحیات بن جاتا ہے۔ فلسفہ آخر کار تنہائی بن جاتا ہے۔ پس اس مقام پر پہنچ کر انسان یاس کا اسیر بننے لگتا ہے۔ اس کا عشق مکمل بے قراری اور اضطراب سے مملو ہوجاتا ہے۔ اس مقام پر علم وعشق میں ربط پیدا ہونے لگتا ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات
علم مقام صفات' عشق تماشائے ذات

جس چیز پر یورپ کا ایمان ہے یعنی آئیڈیلزم' میٹریلزم' وجودیت اور نیچریت وہ سب حقائق ومعنویت سے عاری فلسفے ہیں۔ان میں جہاں بینی ہے نہ بیان کی صداقت۔ ان کے ہاں جہاں بینی کی ہیئت اور اور سانچے ہی موجود نہیں۔ اگر ہم ان کو ذہنی سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کریں تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے پڑیں گے اور چہرہ تو بالکل مسخ ہوجائے گا۔ جہاں بینی کے اصل عناصر درد' عشق اور عمل ہیں۔ جب درد اور عشق یکجا ہوجائیں تو عمل میں عظمت معنویت اور گھمبیرتا پیدا ہوتی ہے اور چشم بینائی خونین کی تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ چیز ہرگز ہرگز مغربی دانش وحکمت میں موجود نہیں ہے ان کے ہاں عمل کی صورت میکانکی اور مصلحتی ہے۔ خرد وخبر کا پیدا کردہ ہیومینسٹی سسٹم اور منافع کی شرح دکھانے والا طریقہ حیات اور بس۔ یہ طریقہ مادی تمدن اور حیات کو تو بظاہر تقویت دیتا ہے لیکن انسان کی وجودی اقدار کی تشفی نہیں کرتا۔ انسان کے کام کی چیز نہیں۔ اقبال نے سچے عمل کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا ہے۔

انجام خودی بے حضوری
ہے فلسفہ و زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائی بے صورت
ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

دین سر محمد وابراہیم
دین مسلک زندگی کے تقویم

دل در سخن محمد بہ بند
ای پور علی' زبو علی چند

ہم اس عمل سے متصف ہوکر ایک خوبیں اور آتشاک دانش کے حامل ہوجاتے ہیں۔ یہ ذوق عمل ایک انقلابی عمل کا روشن رخ ہے۔ وہ عمل جو عشق کی اٹھان اور درد کی ہوک نے پیدا کیا ہے۔ اقبال اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ عمل جو ٹیکنالوجی کی سان پر کس کر دیکھا جاتا ہے اور دوسرے فلسفوں کے معیار پر پرکھا جاتا ہے کافی حیران کن ہوتا ہے۔ اس مئے خانے میں کردار عمل کی مستانہ شراب جو کوئی نوش کرتا ہے وہ مجاہد بن جاتا ہے۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ' افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست' نہ خوبیداہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا ہے نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ وپے میں فقط مستی کردار

جہاں بینی کے لئے روشن فکر دانشور کے ہاں چار اسالیب پائے جاتے ہیں۔

۱ صوفیانہ ۲ روحانی ۳ ہنرمندانہ ۴ مجاہدانہ

فلسفی اور خبروان کے پاس مستی ہے نہ مستی کردار۔ جب کہ ہماری جہاں بینی کے اندر درد' عشق اور عمل کے عناصر کا امتزاج سرمستی پیدا کردیتا ہے۔ اس جہاں بینی کو اقبال "آتش ناک بینائی" "معانی خونین" "شکوہ مند زیبائی وشناسائی" اور "حیدری توانائی" جیسی اصطلاحات سے پکارتا ہے اور جہاں بینی دینی کا عنوان قائم کرتا ہے مگر جو معانی ہمارے بعض روشن فکر حضرات اس دینی جہاں بینی سے اخذ کرتے ہیں وہ نہات انحطاط پذیر اور مبتذل ہیں۔ اس میں ان کی فہم کا قصور ہے یا ذاتی اغراض کا پر تو۔ مذہبی اور روشن فکر دونوں طبقے علمی' فنی اور ذہنی تفاوات کا شکار ہیں۔ اعتقادی مراحل پر ایک طرح کی سوچ وفکر رکھنے کے باوجود یہ طبقے اختلافات کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

اس طرح مفکر اور معتقد دو ان مل خانوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک طبقہ بہشت کو گلشن مانتا ہے تو دوسرا دوزخ کو گلخن گردانتا ہے۔ ہر دو طبقے تخلیق آدم کو ابوالبشر جانتے ہوئے روایتی تصور کے پابند ہیں۔ یعنی انسان مٹی سے تخلیق کیا گیا اس کے بعد اس مٹی کے پتلے میں روح خداوندی پھونک دی گئی۔ پھر اس کی بائیں پسلی سے بی بی حواء پیدا کی گئی۔ دونوں کے ہاں رکاوٹیں ہیں۔دونوں ہبوط جنت کے بعد دعاؤں اور مناجات' گریہ وزاری سے رب کریم کو التجائیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اس بات پر متفق ہیں کہ توبہ کی قبولیت کے بعد بہشت یں داخلہ ہوگا۔ یہ دنوں انتظار موعود کے قائل ہیں۔

دوسری طرف دیکھیں تو ظلم وفساد کا جبری کھیل ازل سے جاری ہے۔ ظالموں کے خلاف جنگ بھی ہورہی ہے۔ انسان کی سعی کالاحاصل ہونا' اجتماعی سعی کا بے ثمراور بے بنیاد ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سرنوشت آدم' سماجی تاریخ' تاریکی مستقبل' فساد کے آگے انسان کی خود سپردگی' جورو صبر کی حکمرانی' قاہر حکمرانوں کے اسلے تلے' جبار ان قوم کی چیرہ دستیاں' جلادوں کی ستم رانیاں' تباہ کاروں کی ایذا رسانیاں' دشمنان' حقیقت کے جوروستم زر

انسانیت پر ہونے والے خونین غلبے سب مل کر آزادی' عدل اور صداقت کے سورج کو غروب کردیتے ہیں۔ اس کا علاج تجویز ہوتا ہے کہ امام آخرالزماں (مہدی) کا ظہور ہوگا اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اصلاح اور احتساب کی بنیاد انسانی عمل اور محنت سے اٹھا کر صرف اتفاقات کے کاندھے پر رکھ دی گئی ہے۔ اعتقادی مسلمان اور کچھ برخود غلط روشن فکر انہی نکات پر متفق ہیں۔ ان کے ہاں مسخ شدہ پیغام اور لفظوں کے مفاہیم پر جھگڑے ہورہے ہیں۔ بلبلے میں دریا کو دیکھ دیکھ کر جھوم رہے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ایک مناظرہ اور مجادلہ مندرجہ ذیل شعروں پر ہورہا ہے۔ اس میں مومن اور روشن فکر دونوں شریک ہیں۔

آفتاب روح دل می پرورد
بزر جاں درآب وگل می پرورد
تیرہ خام سرد' گرم ازتاب او
واژہ بے تاب معنی یاب او

آفتاب کی جگہ آفتابہ خراسانی عوامی لہجے میں پٹھ ڈالا اور کسی نے رومی کی جگہ روم تلفظ کر ڈالا۔ بس پھر کیا تھا۔ ان تشریحات میں زمین آسمان کے قلابے ملادیئے اور کہا گیا کہ دونوں گروہ اپنے اپنے مضبوط دلائل کی بنیاد پر سجا سجا کر بات کررہے ہیں۔ ایک نے کہا کہ اس شعر میں لفظ ہے وہ آفتابہ رومی یعنی چلمچی اور لوٹا دل کا نگہبان ہے۔ اور پھر اس کے اثبات میں عقلی اور نقلی دلائل پیش کرنے لگے کہ آفتابہ رومی جسم کی طہارت اور پاکیزگی کا حامل ہے اور پاک جسم پاک دل کا ٹھکانہ ہے۔ جو روشنی قلب کو زیادہ کرتا ہے۔ ہمارے نبی پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ **النظافتہ عن الایمان** اور ہمارا ایمان ہے کہ ایمان ہی دل اور روح کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اس لئے قیاس کی شکل میں منطقی نتیجہ یوں بنتا ہے۔

۱ ایمان (کبریٰ) یہ دل کو روشن کرتا ہے۔
۲ پاکیزگی (صغریٰ) یہ ایمان ہے۔

۳ نتیجہ لطافت جو دل کو روشن کرتی ہے۔

۴ چنانچہ کبریٰ لطافت ہے۔ اور صغریٰ آفتابہ روحی یعنی پاکیزگی ہے اس لئے ثابت ہوا کہ آفتابہ روحی دل کو روشن کردیتا ہے۔ عقلی نزاکتیں اور اس کے ساتھ نبی پاک ﷺ کی حدیث کو ملاجلا کر معقولات و معقولات کا ایک پورا دفتر کھول دیا گیا ہے اور لفظوں کی بمباری ہورہی ہے۔ سب ایک دوسرے کو تاڑ رہے ہیں۔ حقیقت پسند کہتا ہے یہ کیا مذاق ہے۔ یہ سب فضول ہے۔ آفتابہ روحی کا دل ودماغ سے کیا علاقہ۔ آفتابہ کیوں کر روح کی پاکیزگی کا ضامن بن سکتا ہے۔ دونوں اطراف میں آئیڈیالوجی کی جنگ نقطہ عروج کو چھو رہی ہے۔ ایک مومن متعصب شاعر کے نظریے کا حامی ہے۔ دوسری جانب ایک روشن فکر کافر اس شاعر کی سوچ کا مخالف بنا ہوا ہے۔ جب بہت غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مصرعہ تو ایک ادیب نام کے شاعر کا ہے جس کا مفہوم ہی کچھ اور تھا۔ نہ یہ نہ وہ۔ اور یہ حضرات دریا میں حباب اور حباب میں دریا کو بند کرکے ایک دوسرے سے مشت وگریباں ہورہے ہیں۔

ہمارے ہاں اس طرح کی لفظی شعبدہ بازیاں ہورہی ہیں۔ ان جنگوں میں "ادیب" گم ہوتا جارہا ہے۔ دونوں طبقے تدین اور تمدن کے بکھیڑوں سے بچنے کے خاطر کتاب حکیم وحکمت قرآن میں پائے جانے والے شعر خدا کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دونوں طبقے ایک ہی قسم کی سوچ اور قرات رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگ قرآن کے مفاہیم کو پالیتے ہیں۔ یہ حضرات ان مفاہیم کی گہرائی گیرائی' عظمت رعنائی اور ثروت مندی اور سخاوت کو اوراق سے باہر نکالتے ہیں۔ ان کو اجالتے ہیں اور فیض رساں شاعری سے منور کرتے ہیں۔ سورہ شمس ان کے لئے روشنی کی کرنیں لے کر آتی ہے۔ یہ نور ان کے لئے مردہ اور بے جان زندگی کو حرکت اور حرارت سے روشناس کردیتا ہے۔ کیونکہ اس جہاں کا ہر ذرہ اس نور کے انتظار میں بے قرار اور آسودہ ہے۔ ہم کو چاہئے کہ غلام آفتاب نہ بین بلکہ اس سرچشمہ نور کے اشتیاق میں گاتے بجاتے اور ناچتے دوڑتے آگے بڑھ جائیں اور نور کو حاصل کریں۔

اقبال اس راز قرآنی سے آگاہ تھا۔ اس کا وژن وسیع اور زیبائی تمام کا حامل تھا۔

وہ درد عشق اور عمل کے مفہوم سے آشنا تھا وہ قرآنی حکمت کو فلسفیانہ' صوفیانہ اور شاعرانہ گورکھ دھندوں سے الگ کرکے اور عقل سے عشق کو بڑھا کر آتشیں اور خون بار بنادیتا ہے۔ اس کی جہاں بینی محکمات میں سے ہے۔ دو ٹوک 'واضح اور روشن۔ وہ غیر مبہم متشابہات نہیں رکھتی۔ ہر اصطلاح ابلاغ کا وسیع پیمانہ رکھتی ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ انسان سالہاسال سے تمدن' فرہنگ' قلم 'علم' خرد احساس' طاقت کے حصول کے لئے مصروف پیکار ہیں۔ ان میں گروہ' جماعتیں' سیاسی سازشیں' خیانت' قومی' ملی' نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات تعصبات اور تفرقے پیدا کردئے گئے ہیں۔ علمی 'قرآنی' عرفانی 'مذہبی' تحریفات اور تاویلات کے انبار لگا دئے ہیں۔ گفتگو ہورہی ہے استحصال' اجتماعی نظاموں' انقلابی تحریکات تاریخی' تمدنی روایات کی اور دو تین ہزار سال کا علم میدان میں لا ڈالا گیا ہے۔ پھر بھی قدم ایک نہیں اٹھتا۔ مرض ایک ہی ہے۔ عمل سے فرار اور گریز پالفظوں کو حقیقت سمجھنا اور دانش وحکمت کو فی نفسہ اصل صداقت جاننا۔ یہ سب شاخسانہ ہے الٹی کھوپڑی اور غلط جہاں بینی کا۔

سب مال اللہ کے لئے ہے

اس تصور اسلام پر توحید کی عمارت کھڑی ہے۔ اسلام کی تاریخ کے ابتدائی ایام میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک امیرالمومنین نے اس بنیادی تصور سے انحراف کیا اور کہا کہ مال تو خدا کا ہے مگر میں خدا کا نمائندہ ہوں۔ اس لئے جسے چاہوں بخش دوں اور جس سے چاہوں چھین لوں اس پر حضرت ابوذر غفاریؓ میدان عمل میں کودے اور اس رویے کے خلاف فریاد اور سراپا احتجاج بن گئے۔ ملاحظہ کیجئے کہ اسلام کا دعویدار ہونا کتنا مشکل کام ہے ہم ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے لا زوال عشق کا دم بھرتے ہیں مگر اپنے اعمال کی وجہ سے صوفی خراب حال تو کبھی منبر ومحراب کی منجمد مخلوق اور رجعت پسند ملا بن جاتے ہیں پھر کبھی اصفہان کے شکست خوردہ اخوندوں کی صف میں آکھڑے ہوتے ہیں۔ یہ

آفتاب سے آفتابہ اور غضب سے امامت حق تک کا سفر ہے۔ فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست علیؓ و حسینؓ کی شناخت سے لے کر معاویہ یزید کے چہروں کی پہچان تک کا ایک تاریخی سفر ہے جس میں بڑے مشکل مقام آتے ہیں۔ جہاں حضرت ابوذرؓ سے حضرت عثمانؓ تک معروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔

خدا کو ہر کوئی اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ متکلمین نے بھی ایسا ہی کیا۔ مگر اقبال کا تصور خدا سب سے مختلف ہے۔ فلاسفہ اس طرح خدا کا اثبات کراتے ہیں جیسے نیوٹن کشش ثقل کو منواتا ہے اور اس کی ہستی سے یوں گفتگو کرتے ہیں۔ جس طرح ایک بادشاہ اپنی مملکت یا معمار عمارت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کے ہاں خدا وجود مطلق اور حقیقت کبریٰ ہے۔ یہ زیبائی عشق کا منبع' تمام نیرونور' حرکت وحیات کا سرچشمہ ازلی' تمام آثار و مظاہر کا مرکز اور تمام گواہیوں کا مشہور ہے۔

خودی اقبال کے نزدیک عالم وجود خدا ہے۔ یہ خدا کی وہ معرفت ہے جو فلسفی کی پہچان سے مختلف ہے۔ متکلم کے قال اور صوفی کے حال سے بھی مختلف ہے۔ کہ وہ احساس تو کرتا ہے۔ اس سے موجوں کو چھونے' طوفانوں سے الجھنے اور گہرائیوں میں اترنے کی توفیق ملتی ہے۔ جیب وگریباں صدف ہایہ گرنا یہ سے پر ہوجاتے ہیں۔ معرفت کے اندر درمراد اور مروارید راز چھپا ہوا ہے۔ یہ الفاظ لوح محفوظ پر رقم ہیں اہل معرفت کا قلم قضا وقدر کی منشا کو کتاب میں اتارتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ علم کتاب سے آشنائی اور خدا سے شناسائی رکھتے ہیں وہ سچے لوگ ہیں۔ یہی لوگ اللہ کی نشانیوں کو زمین و آسمان' صحرا ودشت اور طلوع میں دیکھتے ہیں۔ یہ صوفی نہیں جو مابعدالطبیعات کو ہی لذت آگیں جان کر بالاخر روحانیت پرستی اور مثالیت پسندی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ بودھ کی طرح داخلیت' ہندوؤں کی طرح آکاش پرستی' مسیحیت کی روحانیت پرستی کا شکار نہیں ہوتے۔ ایک صحیح عارف باللہ دل کی روشنی میں ہدایت تلاش کرتا ہے۔ اور کلام حق سے راستے کا پتہ اور شہادت کی مہر تصدیق حاصل کرتا ہے جس طرح شہد کی مکھی کو وحی سے ہدایت ملی (اندر

سے) اس طرح نبوت کو بھی اندر سے ہدایت ملتی ہے دونوں ایک ہی سرچشمہ فیض سے منور ہیں۔

یونانی طرز فکر اور مغرب پرستی کی روایت نے ایسے فلسفیوں کو جنم دیا جو انسان شناسی قرآن فہم' اور حقیقی نبوی ﷺ کی اصلیت سے منہ موڑ کر خود ساختہ نظریوں کے زندانوں میں بند ہوگئے۔ ان لوگوں نے قرآن اور صاحب قرآن کو فلسفوں اور نظریات میں ڈھونڈنا شروع کردیا آیات وروایات کو جمع کیا' ان پر توجیہ وتاویل کا غلاف چڑھایا اور پھر پیر طریقت کی ریش و سبیل (مونچھوں اور داڑھی) سے لپٹ گئے ۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ رسول پاک ﷺ کی سچی تعلیمات سے بے بہرہ ہوکر وہ قدیم علوم کی بیساکھیوں پر چلنے لگے۔ چنانچہ علم کی جگہ جہالت وہٹ دھرمی اور جامعہ کے مقابلے میں افلاس نے جگہ پالی۔

آج کی روشن فکری کا یہ تقاضہ ہے کہ ایک قوت مند اور ترقی یافتہ حیات کا تصور پیش کیا جائے مگر ایسا کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مذہب کو سمجھا جارہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگیوں میں سے تخلیق' حرکت اور کمال کا اخراج ہوگیا ہے۔ ہم مذہبی لاچارگی کی دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ جس کے سیاسی شاخسانے کے طور پر اشرافیہ کا طبقہ پیدا ہوگیا ہے۔ روح وجسم الگ الگ خانوں میں بٹ گئے ہیں مقلد غیر مقلد 'حکام اور عوام کی تقسیم ہوئی ہے۔ سیدو عاصی' شریف وضیع کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ تمام غیر انسانی فارمولے اور نسخے خاندانی برتری اور ارسٹوکریسی کی کوکھ سے جنم پذیر ہوئے ہیں۔ موروثی ملوکیت' جاگیردارانہ اجارہ داری اور ان سے وابستہ اقدار' کردار اور فرہنگ ودانش کا چلن عام گیا ہے۔ نسل پرستی کا عفریت عظمت آدم کو نگل گیا ہے۔ طبقاتی نظام اور خاندانی برتری کا بت قدم قدم پر نصب ہوا ہے۔ خواص پسندی' زبدگان' ثروت زاد' آقازاد' شاہزاد' خواصگان کی اصطلاحات عام ہوئیں ہیں اور عوام الناس سے جدا اور برتر الگ اہمیت وشان جتانے والے لوگ پیدا ہوگئے ہیں۔ پھر عادات اطوار لباس وخوراک' آرائش وزیبائش'

آداب و رسوم، عنوانات، القابات، خطابات کے بوقلموں لوازمات کی باران زحمت اولاد آدم کے نصیبے پر نازل ہوئی۔ خدا، معاد، محمد ﷺ، علیؑ، امامت، عدالت، حق، عدل و انصاف، دنیا و آخرت، ایمان و عمل صالح، جہاد و فلاد، تقویٰ و بشارت، توحید و وحدت، اخوت مسولیت اور آیات و احکامات ربانی کو پس پشت ڈال کر دولت کی پرستش، سود کی لعنت کی پوجا شروع ہوئی۔ انصاف رونے لگا اور ظلم دھمال ڈالنے لگا۔

ہمارا قرآن عظیم حق کی لازوال کتاب ہے۔ ہمارا پیغمبر ﷺ امی لقب انسان عظیم ہے یہ نبی ﷺ مکتب، دعوت، تحریک، ایمان اور عمل کا داعی ہے۔ یہ نبی ﷺ تدبر، تفکر، تعقل، اسرار، خلقت، فہم حقیقت و عقل، حکمت و بصیرت کا ستائش گر ہے۔ یہ نبی ﷺ آگہی اور ہوش مندی پر تکیہ، خیر خواہی اور حق طلبی کی تلقین کرتا ہے۔ یہ منطقی مناظرہ اور اعتقادی مجادلہ سے بھی گریزاں نہیں ہے۔

ہمیں بھی چاہئے کہ ہم وسوسوں اور وہم کو چھوڑ کر خالص علمی بنیادوں پر علمی حقائق پر تحقیقی نگاہ ڈالیں۔ تاکہ ایمان کی معرفت اور خدا کی پہچان ہو۔ خدا سے متعلق اقدار حیات و دعوت کتاب حکمت بصیرت، حرکت و عمل، ایمان و جہاد، قدرت و تمدن، تہذیب و اقدار اور دیگر تاریخ حقائق، جامعہ شناسی، حرکت تاریخی کو معلوم کرنا اور اسکے نتیجے میں انسانی مستقبل کا راستہ ڈھونڈنا در حقیقت خدا کو جان لینا ہے مگر ایک عام رسمی روشن فکر سے جو انگریزی اور فارسی کا واجبی سا علم رکھتا ہے یہ توقع رکھنا کہ وہ ان پر پیچ راہوں سے گزر کر اسلام کے شفاف اور پاک سرچشموں کی نشاندہی کرے گا خود فریبی ہے۔ یہ کیسے توقع کی جائے کہ آج کا نوجوان قران فہمی، اقوال علیؑ سیرہ رسول ﷺ اور حقیقت اسلام کو صحیح معنوں میں پہچانے گا۔ ابھی تو ہمارے روحانی علمائے کرام ہی ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود وہ ابھی تک حقیقت سے دور ہیں۔ ان کے لئے ابھی اسلام لاکھوں پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ یہ پردے مدرسوں کے ہیں۔ منبر و محراب کے ہیں، خیرات، عبادات، تقریبات عزاداری، دار العلوم مشہد، قم، نجف کے اداروں میں ہے او

اور بس۔ ان کی نگاہیں اسلام کی حقیقی توحید' رسالت پیغمبر ولایت علی اور مکتب جعفر صادق کو اصلی روپ میں دیکھنے کی تاب ہی نہیں رکھتے۔ ان کے مقابلے میں ہمارا نام نہاد جدید طبقہ صرف کتاب خواں ہے۔ اسلام' مذہب' تاریخ کو مغربی تحریکوں کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ انقلاب فرانس' صنعتی انقلاب' امریکی انقلاب' یورپ کی نشاۃ ثانیہ' بیکن' ڈیکارٹ' کانٹ' ہیگل اسپنگلر' نطشے' اسٹورٹ' سمتھ' والیٹر' روسو' ڈارون' فرائڈ' برگسان' شیلر اس کے امام ہیں۔

اسکی آئیڈیالوجی کیا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی سیمون' مارکس' اینگلز سارتر' وان گوک' اور ان کے علوم' معلومات' نظام اور توجیہات' سے متعلق ہے۔ یہ دنیا کو جغرافیے کے ماحول' اجتماع اساس' تولید' تناسل' رواں شناسی اور شخصیات کے علوم کے حوالے سے پڑھتے اور پرکھتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی رائے نہیں۔ اور پھر مذہب' اسلام اور مسلک شیعیت کے حقائق کو جاننے کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مفاتیح' جناب الخلود' کحل البصر' منتھی آل' بحارالانوار' حق الیقین' کفایت الموحدین' منتخب الاثر روضہ الشہداء العسل المصفی فی مناقب حسن الاول الی حسن المثنی وغیرہ اس طرح کے اور سرکاری یونیورسٹیوں کے افکار کی بنیاد پر مذہب کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔

توحید کی توجیہہ' انسان شناسی کی تعبیر' قرآنی اصطلاحات کا ادراک محنت طلب ہے۔ اس باب میں روشن فکر مسلمان بھی کہنگی اور پسماندگی کا شکار ہیں۔ جگہ جگہ پر قرآنی عقائد کے مقابلے میں ٹکراؤ جنم لیتے ہیں۔ ایک مرد مومن کی دعوت یہ ہے کہ اقدار خداوندی کو اپنا کر رشد وہدایت' حق' عدل اور آزادی' صداقت سے ہمکنار ہوکر خدا کی طرف رجوع کیاجائے۔ دوسری جانب وہ شخص جو فلسفیانہ حیرت' نظریاتی نارسائی' خود شکستگی اور روحانی افلاس میں مبتلا ہے کبھی انقلابی فکر' حیات افروز قوت اور حرارت آمیز زندگی سے سرفراز نہیں ہوگا۔ ان اقدار کا بلا جہاد واجتہاد وایثار اور سعی پیہم پالینا ممکن ہی نہیں ہے۔ جو روشن فکر انسان صدیوں کے تجربات میں سے گزر کر تقویٰ کا اعلیٰ ترین معیار پالیتا ہے اور

عدل وانصاف میں ابوذر غفاریؓ بندگی میں سید سجادؒ شہادت میں امام حسینؓ اقدارحیات' میں حضرت علیؓ فاطمہ الزہراؓ اور بی بی زینب مطہرہؓ کو نصب العین مان کر ان کے اوصاف سے اپنی زندگی کو لبریز کرنے کی سعی کرتا ہے وہ عہد ساز بن جاتا ہے۔ وہ صاحب وجدان ہوجاتا ہے۔ وہ اسلام کو پیکار حیات سمجھتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو پالیتا ہے۔ پھر وہ پکار اٹھتا ہے کہ یہی سچا اسلام ہے۔ یہی زندہ اسلام ہے وہ اسلام کے چہرے پر پڑے رسومات والقابات کے پردوں کو نوچ ڈالتا ہے۔ اور اصل اسلام کے منور چہرے کو عشق کی حدت اور حیات کی حرارت سے منور کرکے جلوہ گر کرتاہے۔ یہاں ایک وسیع وعمیق تصور حیات جنم لیتا ہے۔ یہ تصور مستضعفین کا دست وبازو بن جاتا ہے اور مساوات انسانی کا پرچم لہراتا ہے۔ یہ قرآنی دعوت کی حیات نو ہے اسلام کے اندر رسومات وقیود کے پابند لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایسے شخص کے وجود کو رسومات قیود والے اسلام کے پرچارک بھی قبول نہیں کرتے اور اس کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ یہ اسلام کی اصلی شکل نہیں ہے۔

اسلام کا اصلی چہرہ عمل سے عبارت ہے۔ جس کی بنیادی خصوصیات دانش افروزی' فرہنگ' ٹیکنالوجی کا حصول ہے۔ فریضہ رسالتؐ کا اتباع اس میں ہے کہ انسان دشمن قوتوں کو کار زار حیات میں شکست سے ہم کنار کروایا جائے۔ کمزور عوام کا ساتھ دیا جائے۔ ان کو بھوک افلاس اور غلامی سے آزاد کروایا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ جب روشن فکر انسان اس راہ پر چلے گا تو طرح طرح کے الزامات' فتوے اور تحقیر کے اسلوب اس کی راہ روکیں گے۔

دنیا بھر کی اسلام دشمن قوتیں صرف اس اسلام کی گرویدہ ہیں جو مسجد وخانقاہ کا اسیر ہوکر اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اس کا واسطہ صرف مقدس قبرستان تک ہو۔ اس کا پاسپورٹ صرف عبادت' زیارت اور قبر پرستی تک محدود ہو۔ پارلیمنٹ' یونیورسٹی' میڈیا کی دنیا سے اسے دور رکھا جائے۔ مگر سچے اسلام کا پرستار غیروں کے بنائے ہوئے اس تصور اسلام کو

کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتا ہے اور نئے عالمی نظام میں اپنے حصے کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ حکومتوں اور بادشاہوں کو پلٹانے کا حوصلہ اپنے اندر پاتا ہے۔ اب اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن ہوگا۔ اب وہ غار حرا اور تزکیہ نفس کی سطح سے آگے بڑھ کر جہاد کی سٹیج پر آگیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں میزان عدل ہے۔ وہ انصاف چاہتا ہے۔ وہ لٹے پٹے انسانوں کی دستگیری کرنا چاہتا ہے۔ وہ جابر قوتوں کا دشمن ہے۔ وہ ظلم جہالت اور ضعف کو بزور شمشیر ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس شخص کا اسلام برادری اور برابری پر مبنی ہے۔ جہاں اسے اچھائی نظر آئے تو وہ لے لے۔ مارکسزم کی اقتصادی جدید میں اسے کچھ نظر آتا ہے کہ اس سے منہ نہ موڑے؟ اور طبقاتی وحدت کا تصور جو درحقیقت اسلام کا تصور ہے اگر کسی اور نظام فکر نے اپنا لیا ہے تو اس کی پیروی میں اس لئے پس وپیش نہ کرے کہ اس کا تعلق کسی دوسرے فلسفے سے ہوگیا ہے۔ ہیگل کے ہاں فلسفہ حرکت و ارتقا موجود ہے تو اسے اپنالے کہ یہ تصور اسلام سے ہی ماخوذ ہے۔ جدید فلسفہ وجودیت کو اصل اور ذمہ دار قسم کی آزادی سے ہم کنار کردے۔ رسالت وحقیقت سے پرتولے کر انسانیت کی بقاء کے لئے قانون سازی کرے۔ احترام انسانیت کا پرچم بلند کرے۔ انسانی حقوق کی سربلندی کا نعرہ بلند کرے۔ سوشلزم کی حقیقی روح کو سمجھے۔ محنت کے تصور حاکمیت کو سمجھے اور سرمایہ دارانہ منافع اندوزی کے بلا محنت تصور کو باطل کرے۔ آرائش وتجمل کے مصرفانہ تصورات سے انسانیت کو آزاد کرے۔ فطرت اور کائنات کو قریب تر لائے' لبریزم کے اندر موجود آزادی اور حرمت آدم کے افکار کی ترویج کرے۔ کمزور انسانوں کی حمایت سے مقبول عام جمہوریت کو عام کرے۔ جابر قوتوں کو قلع قمع کرے۔ انسانیت کی لاشوں پر پلنے والے توندو وکمرو گدھوں کی موت کاسامان کرے۔ عوام الناس کی فلاح کا مداوا کرے۔ مغربی مکاتیب فکر میں جو غیر پسندیدہ عناصر ہیں ان کا بھی سر کچلے۔ وہ جمہوریت جو سرمایہ دارانہ نظام اور ان کی مسلمہ اقدار کی پرورش کرے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرے۔ مادیت پرستی کے بے لگام گھوڑے کے منہ میں باگ ڈالے۔

کوئی بھی انسان فکر میں مادہ پرست اور عمل میں صنعت پرست نہیں ہو سکتا۔ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ خدا شناسی ہمیشہ اخلاقی اقدار سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ خالص مادہ پرستی ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ جنگوں کا جواز بنتی ہے۔ یہ عیاشوں کو تقویت پہنچاتی ہے۔ یہ عصمت اور شرافت کا دامن تار تار کرتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ماضی کی مادہ پرستی اگر یزید کے قول و فعل میں تو حال کی مادہ پرستی بوژروائی سوچ میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ اگر زندگی مابعد اور احتساب کا تصور موجود نہ ہو تو پھر سارا کھیل ہی ختم ہے۔ اور حیوانیت کا راج ہے۔

زندگی کا جواز اخلاق میں ہے۔ یہ جو نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر سارے کارخانہ حیات سے خدا اور آخرت کو نکال دیں تو پھر تو فری فری آل اور نراجیت ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ پھر سارے فلسفے، شعور اور تاریخ بچوں کا کھیل ہے۔ محض روحانیت اور دل بہلاوا۔ جب آسمان کے حالات خراب ہوں تو پھر زمین والوں کی بلا شرکت غیرے حکمرانی ہوگی۔ پھر تو ساقی کی ہوس اور شراب کی کثرت ہی اچھی ہوگی۔ کسی بھی فلسفہ حیات میں اگر اس قسم کی سوچ کار فرما ہو جائے تو پھر وہ بطور نظام اخلاق مردہ ہو جاتا ہے۔ چاہے یہ چودہ سو سال پہلے کا فلسفہ ہو یا دور جدید کا نام نہاد روشن خیال تصور آزادی۔ موجود پل کی جاودانی کا فلسفہ خالص مادہ پرستی کی مثال ہے۔ یہی میکانکی، جدلیاتی اور فکری رویے پھر مادہ پرست مارکسزم کی انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ جو فلسفہ، خدا پرستی، تقویٰ اور فرہنگ اصلی سے کٹ گیا ہو وہ کیا پھل لائے گا۔ اس کی مثال اس شیرخوار بچے کی ہے جس کا ناطہ مامتا کے سفید حیات بخش دودھ سے دور لے جاکر مادہ پرستی کے بھیڑیا صفت سیاہ پستانوں سے جوڑ دیا گیا ہے۔ انسان کے بچے کو بھیڑیے کا دودھ پلایا جارہا ہے۔ مغرب کا انسان مسموم فضا میں پرورش پارہا ہے۔

مزدک اور ابوذرؓ کے کردار کا موازنہ کیجئے۔ ایک بھوک سے عبارت ہے تو دوسرا عشق سے۔ کوئی بچہ جب غیر اسلامی تصورات کی چھاؤں میں پروان چڑھا تو جوان تو ہوا۔

داڑھی مونچھیں بھی اس کی آئیں۔ اس کو تخت پر بھی بٹھلایا گیا ہے۔ مگر جب اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں توحید کی جگہ تثلیث نظر آتی ہے یہ تثلیث عبارت ہے فرعون' قارون اور بلعم باعور سے۔ کمیونزم بھی اقتصادی جبر کا لباس اوڑھے دکھائی دیتا ہے۔ انسان نے اپنے ارتقائی سفر میں انقلاب کا تصور فرانس اور شکست جاگیرداری کے توسط سے حاصل کیا تھا مگر اس کو اشتراکیت نے آکر چھین لیا ہے۔ انسان کا عشق غلط تعبیر سے جا ٹکرایا ہے۔ زور' زر اور تزویر کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ اس نظریے نے ایک سپرپاور کو جنم دیا جو انسانی آرزوؤں کا قبرستان بن گئی۔ اس قبرستان سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے توحید کی دہلیز پر دوبارہ سجدہ ریزی۔ اس شیرخوار بچے کو بھیڑیے کے سیاہ پستانوں سے ہٹا کر اپنی ماں کے سفید وپاک دودھ تک پہنچایا جائے اپنی اصلیت کی طرف واپسی کے اس سفر میں زیبائی' رخشندگی' تابندگی اور حرکت وحرارت ملے گی۔ لیکن اس سفر کی راہ میں بڑی دشواریاں ہیں۔ اور دشمنان اسلام اس سچی راہ میں بڑے کانٹے بوئیں گے۔

شرک اور توحید دریا کے دو نہ ملنے والا کنارے ہیں۔ انسان ایک کلی حقیقت ہے اس کی تخلیق خداوند تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی۔ پورا قرآنی واقعہ اپنی نظروں کے سامنے لائیے۔ آدم کو جنت دی گئی۔ مگر اس نے اپنے اعمال سے اس جنت کو جہنم میں تبدیل کرڈالا۔ ہم نے اس جنت کی طرف واپسی کو اپنے اعمال حسنہ کے ذریعہ یقینی بنانا ہے۔

اسلام کے مسلک شیعیت میں بارہ اماموں کی عصمت کا تصور موجود ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بارھویں امام غائب ہیں جن کا ظہور ظلم کے خاتمے کا اعلان ہوگا۔ اس وقت اسلام کا عادلانہ نظام طلوع ہوگا جس دن امام کا ظہور ہوگا۔ ہم اس وقت تک انتظار کرتے رہیں گے۔ اسی انتظار کو افضل ترین عبادت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کو چھوڑ کر خمس' شہادت' عبادت اور دوسرے ظاہری اعمال کا سلسلہ عباسی خلفا کے دور سے صفوی دور تک جاری چلا آرہا ہے۔ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ایسی ہی کچھ اور اصطلاحات جو

اسلام کے ساتھ فالتو نتھی کردی گئی ہیں وہ بدعات کہلاسکتی ہیں۔ادخال مالیس من الاسلام فی الاسلام۔ اس کے علاوہ کچھ اصطلاحات مارکسسٹوں' سوشلسٹوں' روشن فکروں' انسان دوستوں' جمہوریت کے پرچارکوں اور دانشوروں' جدیدیت کے حاملوں اور ترقی پسندوں سے بھی مستعار لی گئی ہیں اور ان کو اسلام کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ مسلمان ان اصطلاحات ورسوم واعتقادات کے مقلد بن گئے ہیں۔

ان کا دین یہ بن گیا ہے کہ مفاتیح کی تلاوت کریں' مستجبات کا ذکر کریں' زیارت قبور کریں' ماتم حسینؑ کریں' حتی المقدور دوری معصیت کا ذکر کریں۔ اگر فقر ہو تو قناعت کو اپنائیں اور اپنے آپ کو شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھیں۔ سرمایہ داری سے بچنے کے لئے اپنے مال کو زکوٰۃ کے ذریعے پاک کریں۔ صلح رحمی کا سلوک کریں اور حج وغیرہ کریں۔ یہی ہمارا فلسفہ حیات بن گیا ہے یعنی توسل' توبہ' تولیٰ' تبریٰ' لعنت بھیجنا ظالموں اور کربلا کے قاتلوں پر اور بس۔ یہ سب کچھ تو ہے مگر اس کا تجزیہ کون کرے گا۔ ربا کی جو صورتیں رائج ہیں۔ بنک اور لاکرز موجود ہیں۔ ان کے بارے میں کون فیصلہ کرے گا۔ ہوا بازوں کے لئے قبلے کا تعین کون کرے گا۔ ماہ مریخ اور خلائی سٹیشنوں میں عبادت کی ادائیگی کیسے ہوگی۔ قطب شمالی وجنوبی میں رمضان کے روزے کیسے رکھے جائیں گے۔اس قسم کے عصری مسائل حل طلب موجود ہیں۔ رسالتؐ قرآنؑ' امامت علویؑ' عدالت ابوذریؓ اور دوسرے تمام مکاتب فکر کی روشنی میں ان کو دیکھنا سمجھنا اور پرکھنا ہے اسلام نے ان کو ایڈریس کرنا ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں ہم فلسفہ عبث میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہم ہنر وفضول' اخلاق نامعقول' زندگی بے ثمر' لذت پرستی' طاقت کی بندگی' سرمائے کی حکومت' مرگ احساس' تاریخ کے عدم احساس' خود بیزاری' آئیڈیالوجی پر ٹیکنالوجی کی حکمرانی کے تصورات میں محو ہیں۔ جو علماء وارث انبیاء اور مسلمانوں کے پیشوا ہیں ان کے دامن سے کفر کی بو آتی ہے۔

ہمارے یہ آقائے ولی نعمت مجتہدین ہیں اور زمین کی نیابت کا تاج اپنے سروں

پر رکھ کر اسلام کی اصل روح سے بیگانہ ہیں۔ ان کا اسلام صرف مفاتیح' نذر نذرانے' موت' اور بہشت زہرہ میں ہے۔ حقیقی اسلام درحقیقت جہاد' ایثار اور اجتہاد سے ہی ممکن ہوگا۔ اس کے بعد ہی رسالت اسلام اور مکتب انقلاب علیؑ کا انسان نمودار ہوگا۔ اگر ایسا نہیں ہوگا۔تو اسلام ایک کمزور ومختصر گاؤں اور یہ حکمران خدائے کبیر نظر آتے رہیں گے۔ ولسلام ختم تمام۔ ٹائیں ٹائیں فش۔ لیکن وہ قرآنی امت توحید جو ماڈل اور امت وسط کہلاتی ہے۔ اور سیرۃ پاکؐ کی پیروی میں خود سازی کرتی ہے عظیم امت ہے۔ یہ مجاہد قوم زیبائی اور عنائی کی سفیر ہوگی۔ اور اس جمود وسکوت کے خلاف جہاد کرنے والی ہوگی۔

شاہ پیشواء متحد ہوکر اس قوم کی جدوجہد کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ایک طرف بادشاہ کا ڈنڈا ہے تو دوسری طرف ملا کی چھڑی۔ اندازہ لگائیے جس امت کی بنیادوں میں حاجی اور ملا بیٹھے ہوں وہ کیسے آگے بڑھے گی۔ ان کے زیر نگرانی ایک ایسا نظام وضع کیا گیا ہے جس کے تحت عوام الناس حاجی کے لئے محنت کریں اور ملا کے ہاتھ چومیں۔ ایک خون چوستا ہے تو دوسرا آنسوؤں کو خشک کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ چند لوگ اگر ان کی غلامی کا جواء اتار پھینکنے کی سعی کریں تو اس کوشش کو بغاوت کا نام دے دیا جاتا ہے۔

صداقت وحکمت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ حکمت وعزت کی حکمرانی ہواور ایک ایسی امت تشکیل پائے جو انصاف اور خوشحالی کی نقیب ہو' علم وعلم سے سرشار ہو اور انسانی فلاح کے تصور سے آگاہ ہو۔ ایک ایسا مسلمان تیار کرے جس کا زور آتش کوہ فریب کو ناکارہ بنادے اور خسرو پرویز کے کاخ ستم کو زمین بوس اور جاگیرداری اور تجارتی فکر کو نیست ونابود کردے۔ یہ مسلمان ایسا ہو جس کے ایک ہاتھ میں تلوار تو دوسرے ہاتھ میں قرآن ہو۔ اس کا کام آگہی کا حصول اور ہردم آمادگی پیکار ہو۔ اسلام نے علیؑ کی صورت میں ایسی شخصیتیں تاریخ کے صفحات پر ابھاری ہیں جو عشق' رعنائی' قوت اور روشنی کا پرتو جمیل تھیں۔ یہ علی نما انسان کمزور اور نحیف انسانیت کے مددگار اور والی تھے۔ ایسے انسان عوام دشمن قوتوں کے دشمن اور اقتدار پر قابض سرمایہ داروں کو پائے استحقار سے ٹھکرا سکتے ہیں۔ یہ

ابوذر غفاریؓ کی طرح فساد کی ان قوتوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ اونٹ کی پسلیوں کے ہتھیار لے کر جب ان کے دارالخلافوں کی طرف بڑھیں گے تو روئے زمین پر لرزہ طاری ہوجائے گا۔ اس حوالے سے ابوذرؓ کا کردار تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔

ایک گروہ تاریخ کے رجعت پسندوں کا ہے جو اپنے آپ کو آیۃ اللہ' حجۃ اللہ' علمای اور نائب خدا کہتے پھرتے ہیں۔ مگر جمہوری عہد کے شیر ان کو دینی استبداد کا موسس اعلیٰ کہتے ہیں سال نوروز میں جب نوبہار کی گھٹائیں برسنے لگتی ہیں اور سیلاب دشت وکوہ کو تہہ وبالا کرتا ہے تو سب سے پہلے انہی کی نہروں میں پانی اتر آتا ہے۔ یہی لوگ ہر طرف دوڑ دھوپ کرتے ہیں یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے بھی پہلے اپنی رسیاں زمین پر پھینکتے ہیں اور طرح طرح کے کمالات دکھاتے ہیں۔ یہی لوگ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور سے پہلے تکفیر کا اعلان کرتے پھرتے تھے۔ پھر بعثت نبی کریم ﷺ کے بعد طرح طرح کے روڑے اٹکاتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے جھٹلایا پھر بغاوت کی۔ یہ لوگ حق کشی اور چراغ صداقت بجھانے کی ہر سعی کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ان دانشوروں نے پہلے تو بعثت نبوی کے بارے میں طرح طرح کی اوندھی پیشن گوئیاں کیں۔ جب وہ تشریف لے آئے تو ان کو جھٹلا دیا اور مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے۔ واقعی تاریخ بار بار اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ مذہب کو مذہب ہی کے نام پر بیچ میدان للکارا جاتا ہے۔ توحید توحید کے لئے ہی اپنی جگہ خالی کرتی ہے۔ انسان ذلیل وخوار ہوجاتا ہے۔ اس مرحلے پر تجدید بعثت مذہب کی ضرورت ہوگی ہے۔ علاج صرف یہی ہے کہ تخلیقی قوت رکھنے والے حقیقی اسلام کو دنیا سے روشناس کروایا جائے۔ صفوی دور کی پروردہ شیعیت کا پردہ چاک کردیا جائے تاکہ ذلت کا باب بند ہوجائے اور دو روشن شمعوں یعنی امامت اور عدالت کو سامنے لایا جائے ان چالوں کو جنہیں صفوی دور کے تاجروں اور بت پرستوں نے ریاستی استبداد کے ذریعے بن رکھا ہے ختم کریں کیونکہ شیعیت علوی ہی شیعیت صفوی کو ختم کرسکتی ہے۔ یہ مذہب انقلاب خود ہی رجعت پسند اور ارتجاعی مذہب کی موت کا سامان بن

جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح علم جہالت کو' روشنی اندھیرے کو اور حرکت سکون کو ختم کردیتی ہے۔ بیداری خواب غفلت کا کام تمام کرتی ہے۔ اسی طرح اصل شیعیت جعلی شیعیت کے خاتمے کا سامان بنے گا۔ صفوی مذہب اس لئے موجود ہے کہ مذہب علوی ناپید ہے۔ اصل کو لے آئیں تو نقل دم توڑ دے گی۔

ہمارا سماج تاریخ سے کٹ کر کمزور ہوگیا ہے ۔ ہمارے سرچشمہ وجود اور روحانی دنیا میں فاصلے بڑھ گئے ہیں ایک ابھرتا ہوا سماج بار آور درخت کی مانند ہوتا ہے۔ جس کی جڑیں اپنی تاریخ میں پیوست ہوتی ہیں۔ آفتاب' ہوا' آزادی اور افق سے اٹھتی ہوئی گھٹائیں اسے شاداب اور تندرست رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے وجود کا درخت ظالموں کے آرے اور کلہاڑوں سے ریزہ ریزہ ہوگیا ہے۔ فرسودہ رسومات نے اسے اندر سے کھوکھلا کردیا ہے۔ جس آلودہ ماحول اور فضا میں ہمارے وجود کا نخل چھپا ہے اس کا بہاروں اور ہواؤں سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسلام کا درخت زیتون مرجھانے لگا۔ نشوونما سے دور ہوا' رجعت قہقری کا شکار ہوا اور خواب غفلت کا اسیر ہوکر مردہ ہوگیا۔ اچانک کیا ہوا کہ مغربی سامراج باغبان بن کر ہمارے نخل کی باگ سنبھالنے آگیا۔ اس نے اس درخت کو ہماری خاک سے اکھاڑا' تاریخ کی جڑیں کاٹیں اور پھر ایک حقیر سے گلدان میں تھوڑی سی کھاد ڈال کر لگا دیا۔ یہ گلدان جس کا پہلا نام مشروطہ (جمہوریت) تھا مغربی رنگ وروغن سے آراستہ تھا۔ مگر جب باغبان نے دیکھا کہ اندر سے خالی ہے تو پھر کچھ اور پیوند کاری کی۔ بڑے باغبان نے چھوٹے چھوٹے مالی پیدا کئے۔ مرزا ملکم خان' سید حسن تقی زادہ' گوگالوپ اور سرسید احمد خان۔ پھر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ رنگ وروپ نکھرنے لگا کچھ پھل پھول آنے لگے' برگ بار ظاہر ہوئے۔ پھر برگ سفید ژالہ ژالہ ہوکر اشک ندامت بہانے لگے۔ جوش وخروش سرد پڑنے لگا۔ اندر جھانکا تو ناامیدی کی ہوائیں منہ کو لگیں۔ انہوں نے ایسے باغ کو سینچا تھا جس سے صرف کاغذی پھول ہی نکل سکتے تھے۔

اپنی خاک سے نکل اور مغربی کھاد پھانک کر پودے کا یہی انجام ہونا تھا۔ اس

کے بعد انداز بدلے گئے۔ روشن فکری نے نئے پھول کھلائے۔ کلیسا دوست آزادی اور پرشوکت فرہنگ لے کر سپر دانشوروں نے ہمارے صحرا میں ایک سپر ہدایت کے تحت روشن فکر کانیا بیج ڈالا۔ پہلی بار دارالفنون (یونیورسٹیاں کالج) قائم ہونے لگے۔ یہ لہر اس فرہنگ و فکر سے اٹھائی گئی جو ہمارے اندر پہلے سے موجود تھی۔ عرب دنیا اور مرکزی افریقہ کے نو آبادیاتی علاقوں میں اس استعماری اسلوب سے تعلیم دی جانے لگی کہ رنگ اور جسم تو ہمارا رہ گیا مگر اندر روح فرنگی کی حلول کرگئی یعنی کالے انگریز پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ چنانچہ نئے روشن فکروں نے اعتکاف کی راتوں کا لب ولہجہ لے کر لہوولعب کی سرگزشت بیان کرنی شروع کردی اور اپنی تاریخ اور افکار کو ان کے پیمانے سے پرکھنے لگے۔ یہ پیمانے درج ذیل تھے۔

۱ ازمنہ قدیم (روم ویونان) کے علوم

۲ عہد متوسط (مسیحیت کا غلبہ)

۳ دورہ جدید۔ یورپی نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب

تاریخ کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ تمدن موجود تھا تو عیسائیت موجود نہ تھی عیسائیت آئی تو تمدن غائب ہوگیا۔ جب عیسائیت کا بستر گول ہوا تو پھر تمدن نمودار ہونے لگا۔ یہ عیسائیت کی خصوصیت ہے کہ وہ تہذیب وتمدن کو کھا جاتی ہے۔ ہمارے روش فکر طبقے کو جو مکمل طور پر مغرب زدہ ہے اس حقیقت کا ادراک نہیں ہے۔ دراصل مغرب پسندی اور مغرب زدگی میں بڑا فرق ہے۔ مغربی ہونا حاصل تمدن ہونا ہے جبکہ مغرب زدہ ہونا ایک مرض ہے۔ مغرب زدہ بندر ہے۔ بندر جیسے انسان اور بندر سے ترقی کرکے بننے والے انسان میں فرق ہے۔ ہمارا روشن فکر طبقہ تحقیق سے بے گانہ ہے۔ یہ تحقیق ہی دراصل مغرب کا طرہ امتیاز ہے اسی سے کام لے کر مغرب نے علمی، فلسفیانہ اور تاریخی کارنامے سرانجام دئے ہیں۔

ہمارے ہاں مغربیت یہ انداز دگر آتی ہے۔ مسیحیت کو اسلام کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے اور ہمارے انقلابی دانشور اپنے آپ کو انقلاب فرانس کے وارث سمجھ کر فرانسیسی فکر

کے ہیرو ہونے کا دعویٰ کردیتے ہیں۔ یہ لوگ تاریخی تناظر کو بھول جاتے ہیں۔ جس وقت والٹیر ہیوگو اور گلیلیو اپنے افکار سے غلامی اور کمزوری کے خلاف جدوجہد کررہے تھے اس وقت زمانہ اور تھا۔ اس وقت ان کو مسیحیت کے خلاف بھی جنگ لڑنی پڑی تھی۔ اسلام کا معاملہ دوسرا ہے۔ اسلام تمدن کی ضد نہیں ہے۔ اسلام کے والٹیر ہیوگو اور گلیلیو کو مذہب سے کوئی بیر نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ سچا اسلام اور رسالت محمدؐ تو مشرق ومغرب دونوں کی سامراجیت کو ختم کرنے والے ہیں۔ علیؑ، حسینؑ اور زینبؑ جباران زمانہ کو للکارنے والے ہیں۔ ابوذر غفاریؓ سرمایہ داری نظام کا دشمن عظیم ہے۔ وہ فقر کو کفر قرار دیتا ہے۔

بدھ مت مذہب شاہ اور شاہ نشین تھا مگر ہمارا مذہب تو شاہی استکبار سے برسرپیکار ہے۔ اسلامی مذہب کی سپرٹ علم دوست اور سامراج دشمن ہے۔ اسلام کے اوج کمال کے زمانے میں فرہنگ وہنر بھی اوج کمال پر پہنچے۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم مغربی تاریخ کے پیمانے پر اپنی تاریخ کو پرکھنے لگے۔ اپنی تاریخ کو غیروں کی تاریخ کے سانچوں میں فٹ کرنے لگے۔ پھر ہم اپنے آپ سے دور ہونے لگے۔ ہم مغربی بننے کے شوق میں اپنی مشرقیت کو داؤ پر لگا بیٹھے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم سیاسی اور اقتصادی ہر لحاظ سے تنزل کا شکار ہوگئے۔ ہم خود بیگانگی اور مشین زدگی کا اسطرح شکار ہوئے کہ اپنی حالت کا احساس تک نہ رہا۔ دفاتر میں چائے نوشی ہورہی ہے۔ پن 'فائل' اور ٹائم اور انکریمنٹ کی باتیں ہورہی ہیں۔ ہماری رہی سہی کسر افسر شاہی نے نکال دی۔ علم اور حسن کی جگہ خود پرستی اور جاہ پرستی نے لے لی۔ اعلیٰ اقدار چھن گئیں۔ عورت ایک جنسی کھلونا بن گئی۔ وہ اقتصادیات کے بازار میں سیکنڈ ہینڈ اوزار قرار پائی۔ تفنن طبع اور پیداوار کے لئے اس جنس لطیف کو استعمال کیا جانے لگا۔ کبھی میک اپ سے آراستہ رقاصہ تو کبھی چست وچالاک کھلاڑی کے روپ میں۔ اس کی انسانی شخصیت مختلف اعضا کی رونقوں میں منتقل ہوگئی۔ اس کا انسانی وجود اور اسکا تاثر صرف اس کے استعمال اور اس کی نسوانی جاذبیت پر آکر ختم ہوجاتا ہے۔ جہاں چاہے آزادی سے جاسکتی ہے۔ بدن، بچے اور کمائی یہی اس کے حقیقی فائدے ہیں۔ وہ

جو ہر شے کو حقیقی لمس کے ذریعے رنگ و نور بھر دینے کا اس کا کمال تھا اس سے چھین لیا گیا۔ وہ شعر اور عشق دونوں سے محروم کر دی گئی۔

جب یہ انحطاط بڑھا اور اسلام کا تصور معدوم ہونے لگا تو اس نے بوژروائی مغرب سے اپنا ناطہ جوڑ لیا۔ یہ وہ مغرب تھا جہاں مشینوں کی حکمرانی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشین اور دوسرے میں علم تھا۔ یہ دونوں چیزیں صنعتی بوژوا کو پروان چڑھانے میں لگ گئے اور انسان اونچے درجے سے گر کر پیداوار کا ایک آلہ بن گیا۔ اقدار حیات فضول اور بے قیمت ٹھہر گئیں۔ عقل طاقت کی' علم ٹیکنالوجی کی اور ٹیکنالوجی پیداوار کی خدمت میں سر بسجود ہو کر سود اور منافع کمانے لگی۔ جدید مغربی دنیا کا رائج الوقت سکہ یہی منافع' سود اور پیداواری توسیع و ترقی ہے یہ رویے بازاری فرہنگ اور سوداگری تمدن پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔ اقتصادی منطق' بین الاقوامی وسعت' مادی معنویت اور آزادی و ترقی پسندی کے نام کی چند خوش نما اصطلاحات پیدا ہوئیں جس سے سب کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ خدا پرستی زر پرستی کی محکوم ہو جائے اور بوژروا مادہ پرستی تمام اخلاقی قدروں کی جگہ لے لے اور انسان صرف پیداوار اور اس کی تقسیم کے گورکھ دھندوں میں پھنس جائے تو سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسان کے وجود میں پیداوار برائے مصرف اور مصرف برائے پیداوار کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر اور دولت کے کعبے کا طواف لامحدود شروع ہو جاتا ہے۔ اور زندگی میں سے انتظار کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس صورت حال کا علاج یہ ہے کہ تمام ملتیں اپنی شناخت قائم کریں اور صنعتی سرمائے کی بھینٹ چڑھنے سے انکار کر دیں۔ اس تصور کو خیرباد کہہ دیں کہ فطرت مادیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ صرف جبری قواعد ہیں اور تنازعہ للبقا کے اصولوں پر قائم ہے۔ قانون جنگل ہی مطلق حیات اور فطرت کا قانون ہے۔ نئے دور کے مفکر اپنے فلسفے کی بنیاد ٹھوس مشاہدے اور احساس کے توسط سے فزکس اور بیالوجی کے علوم پر رکھتے ہیں۔ اس فکر کے تحت انسان کو جانوروں ہی کی کوئی ترقی یافتہ صورت سمجھا جاتا ہے۔ ان کا انسان جنگل اور

دریا کی طرح کا کوئی پیکر ہے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ ایک میدان جنگ ہے جس میں لڑائی زندگی کے نام پر لڑی جارہی ہے۔ جو پیکر بھی جنگل کے قانون کے مطابق زور آور اور قوت مند ہوگا جیت جائے گااور ترقی پائے گا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تاریخ کا سفر بھی اس قانون کی فتح مندی کی شہادت دیتا چلا آرہا ہے۔ مانی جیسا فلسفی بھی پکار اٹھتا ہے کہ جو طاقت ور اور فاتح ہے وہ نورانی پیکر ہے اور جو مغلوب ہے وہ تاریکی کا ٹکڑا ہے۔ نطشے جیسے نابغہ نے آگ برساتی عقل کو قدرت کا اعلیٰ کا مظہر قرار دے دیا۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ہمیشہ زور اور طاقت حق کو دباتے چلے آرہے ہیں اور اس کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔

مگر یہ سچ نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ قدرت کے دسترخوان پر تمام انسان کا مساوی حق ہے۔ یہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ زور اور چالاکی سے دوسروں کے حقوق غصب کرے۔ اور مساوات' انصاف' صداقت اور حقوق انسانیت کو ملیا میٹ کرتا پھرے۔ کھرے کھوٹے کی تمیز ختم کرنا ظالمانہ فعل ہے۔ جو مذہب خدا نے تخلیق کیا ہے وہ تمام عالم انسانیت کو ایک خدا کی برابر مخلوق سمجھتا ہے۔ مگر وہ نظام جو نیچر نے تخلیق کیا ہے وہ نا مساوات پر مشتمل ہے۔ امریکی سامراج کے ظہور سے ایشیا وافریقہ میں پرولتاری پشت پناہی سے ایسے سرمایہ دار پیدا ہوئے جو بظاہر انقلاب کی آڑ میں آگے آئے مگر وہ اشرافیہ قدیم کے قائم مقام بن بیٹھے۔ انہوں نے ایک دوسرے طبقاتی نظام کا چہرہ دکھایا۔ اس کے ہتھکنڈے ٹیکنالوجی' سود' مسابقت' زرمبادلہ ٹھہرے اور جس نے بوژروائی امریل کو شجر انسانیت کے ساتھ لپٹا دیا حتیٰ کہ منصف مزاج سوشلسٹ بھی چیخ اٹھے کہ یہ ظالمانہ نظام ہے۔ مگر یہ بھی اس طرح کی محدود ہمدردی تھی جس طرح یزید کو کہا جائے کہ اماموں کو مارنا تھا۔ تو انہیں پانی پلا کر کیوں نہیں مارا۔ سرمایہ داری نظام زیبائی ورعنائی سے یکسر محروم ہے۔ اس میں سے ہردم ہل من مزید کی صدائیں نکلتی رہتی یہ نظام لالچ کے بیج بوتا ہے اور انسان کو لالچ ہی لالچ میں ختم کروالتا ہے۔ اس کی راجدھانی میں زرد شیطان یعنی سونے وطلا کی حکمرانی قائم ہوجاتی ہے۔

یہ جنوں بوژروائی طبقوں میں ایک اور طرح سے بھی رائج ہوجاتا ہے۔ رواں شناسی کے میدان میں اس کا نام مذہب سے وابستگی بن جاتا ہے۔ یہی مذہبی جنوں کبھی تصور کا روپ دھار لیتا ہے اور بیمار عشق اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ حلاج کی طرح صدائے ان الحق بھی لگانے لگتا ہے۔ یہ حالت تصوف اصطلاح میں وحدت الوجود کہلاتی ہے۔ یعنی بس خدا ہی خدا ہے۔ اس لئے میں بھی خدا ہوں۔ مگر یہ سب بے معنی اور فضول ہے۔ طلا پرستی کے مذہب میں بندے اور شیطان سونے کے بت کے رخ پر ہی نماز ادا کرتے ہیں۔ صبح طواف عاشقانہ طلا شام طواف مئے خانہ طلا۔ آخری منزل منیٰ کی یہ ہے کہ اسی پر مرمٹتے ہیں۔ یہ لوگ پھر اپنے سر کو طلا کی ربوبیت اور سلطنت کے سامنے رکھ کر منڈا دیتے ہیں۔ ان کا یہ وظیفہ عشق کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور وہ اپنے نئے وحدت الوجود تک پہنچے کی سعی کرتے ہیں۔ سونا ہی مرشد' سونا ہی مولا' قطب' ابدال' جنت کا درباں اور طلا ہی واجب الوجود بن جاتا ہے۔ حق بھی' حقیقت بھی' نیکی وبدی کا معیار بھی' خیروشر' پستی وشرف' ننگ ونام' حق وباطل' ترقی وتعالیٰ' اور میزان الاعمال ہے۔ یہی امام' ولی' مقتدی مرجع بن جاتا ہے۔ تمام بازگشت اسی کی جانب ہے۔ مرگ و حیات کا مالک' قضا وقدر کا حاکم' خالق ورازق' صانع وحکیم' عزیز وقدیر' قوی اور غنی سب سونا ہی ہے۔ خدا سونا ہے باقی سب جھوٹ ہے۔ طلائی نظام کے وحدت الوجود میں سرمایہ دار حلاج بن جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو طلائے مجسم تصور کرتا ہے۔ ان کا خاندان نسل آقا سب سونا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں عوام الناس خاک سے اٹھے ہیں اور یہ خاص الخاص لوگ سونے سے بنے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عوام الناس سے نفرت کرتے ہیں اس بیگانگی کے کارن یہ بوژوائی جن فرزندان ابلیس کہلاتے ہیں۔ سکہ شمار افزون طلب اور سود خور۔ قرآن حکیم میں حکم ہوا ہے۔ کہ سود خور اللہ اور سول کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ رسالت محمد ﷺ انہی کلمات کے ساتھ ختم ہوئی۔ اس آیت پاک کے ۲۱ روز بعد حضور ﷺ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے گویا خدا کا آخری حکم ہے۔

خدا سرمایے کی سیاہ کاری کو ختم کرتا ہے وہ ذات کسی سیہ کار حق کش کو دوست نہیں رکھتی۔ کیسے کیسے لوگ مکے میں موجود تھے۔ عباس بن عبدالمطلب' ابوسفیان' امیہ بن خلف۔ ایک محصول خوار' دوسرے شتردار' تیسرا بردہ دار (غلام پالنے والا)۔ عبد ابالیل باغ دار تو ابولہب دکاندار جیسے آجکل کے راک فیلر' فورڈ' جنرل موٹرز کے مالکان' اوپل اور آرمکو کے حصہ دار۔ یہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکا کر اپنی تجارت کو چمکا رہے ہیں۔ انسانیت کی تاریخ خاک اور خون میں لتھڑ رہی ہے اور یہ اپنی زندگی سنوار رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اقدار کچھ نہیں۔ اگر ہے تو صرف اور ٹائم ہے۔ مگر عزیزاں من درد دل' راز ونیاز ٹریفک کے قواعد اور چمڑے کی جیکٹ میں نہیں۔ افکار وعقائد تعلقات کی فیکٹریاں نہیں ہیں۔ افسوس کہ اس کلچر میں ادب وہنر سے زیادہ ہیروئن حشیش' مارجوانا' شراب پبلسٹی کی صنعت' سیکسی فلموں' رنگین ڈراموں اور سستی شہرت کی قدر ہے۔ ادبی عیاشیاں فیشن کا لبادہ اوڑھ کر پھل پھول رہی ہیں۔

اخلاق ومعاشرت کا حال ملاحظہ کریں۔ یہ ڈاکٹر ہو رٹن کا خاندان ہے۔ امریکہ صلہ رحم کرتا ہے اور ڈاکٹر وضع حمل کی ہدایت کرتا ہے صلہ رحم جیسے منصوبے عصمت ماب خاندان میں رائج ہورہے ہیں۔ اس نئی میومنزم نے تمام انسانیت کو شفقت کا دامن اوڑھا دیا ہے۔ یعنی ایک ڈالر میں رقص باہم کا ٹکٹ مل جاتا ہے۔ رقص اور جذب ومستی کا تماشہ۔ جگہ جگہ پلے بوائے تقسیم ہورہے ہیں تاکہ فرانس اور انگلستاں کی ثقافت سے جھلسے ہوئے صحراؤں کے مکین محروم نہ رہ جائیں۔ اگر ایک زمانے میں بازار عکاظ طائف میں کلنک کا ٹیکہ تھے تو آج کل وال سٹریٹ' سوئٹزرلینڈ کے بینک ہولناک تماشے ہیں۔نیا مذہب کلیسا تمام یورپی فکر کی اساس ہے۔ اس کے ارد گرد شاہ وپیشوا متحد ہوگئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ خدا دنیا پرست ہے اس لئے اس کے بندے دولت کے پجاری بن جائیں۔ عصائے موسیٰ علیہ السلام فرعون پر حملہ کرنے کی جگہ اژدہا بن کر قارون کے خزانے کی حفاظت کرنے لگا۔ میراث ابراہیم نمرود کے حوالے ہوگئی۔ میراث عیسیٰ روم کے شاہوں اور میراث

محمد ﷺ جانشینوں کو قریش کے حوالے کر دیا گیا۔ میراث علیؓ کو دمشق و بغداد کے حکمرانوں نے اپنے گھروں میں ٹھہرا لیا۔ فرعون قارون وشادمان ہو گئے۔ ان سب کی چالاکی سے مادہ پرستی قافلہ سالار بن گئی۔ محنت کش غریب جکڑ لئے گئے۔ ان کو محنت کا غلام بنا کر حقیری رقم ان کو دی گئی کہ محنت کرنے کے لئے زندہ رہیں۔

اس صورت حال نے طبقاتی کشمکش کا رنگ وروپ دھارا۔ ایک طرف سرمایہ داروں کا اقلیتی گروہ تو دوسری طرف محنت کشوں کا جم غفیر نمودار ہوا۔ یوں ایک نئی جدوجہد کا آغاز سامنے آیا۔ سوشلزم اس حالت کے اندر سے طلوع ہوا۔ کاریگروں نے فاشزم کا سہارا لیا تو سرمایہ داروں نے مذہب کے دامن کو پکڑ لیا۔ سوشلزم کی مادیت پرستی اور آمریت سرمایہ دارانہ مذہب پرستی کے خلاف ایک رد عمل کے طور پر سامنے آئی۔ مادہ پرستی نے سوشلزم کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس سے قبل جاگیرداری نظام نے مذہب کے ساتھ کیا تھا۔ جاگیرداری نے خدا پرستی کو درجہ زوال تک پہنچا دیا تھا۔ دولت بڑھتی گئی اور عوام الناس نڈھال ہوتے گئے۔ ہم اسی قسم کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔

آج اور کل کی سرمایہ داری میں فرق ہے کہ اس دور میں اہل علم وقلم اہل فن وتحقیق اہل مذہب ودین سبھی سرمایہ داری کے دربار میں نوکری کر رہے ہیں۔

مشینی دور سے پہلے انسانی آزادیوں کو چھین کر شخصی ملکیت کو استحکام دیا گیا تھا۔ ان رویوں کے تحت اقتصادی ترقی' صنعت وپیداوار' بنجر زمینوں کو آباد کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ علم ودانش کے فروغ کی تحریکیں اٹھیں۔ اس دور میں شخصی ملکیت کی حرمت کو شرعی نقطہ نگاہ سے ثابت کیا گیا۔ ان ادوار میں مذہبی راہنماؤں نے حفاظتی پشتے تعمیر کئے اور بڑی چابکدستی سے سرمایہ داری نظام کے فوائد کا ڈھونڈرا پیٹا۔ یعنی جو بنجر زمینوں کو آباد کروائے وہی اس کا مالک ہے۔ اس میں اسے آباد کرنے والے حقیقی محنت کش کو خارج کر دیا گیا۔ حالانکہ اصل محنت تو اس کی تھی نہ کہ سرمایہ دار کا کوئی کمال تھا۔ مگر ہمارے مذہبی اجارہ داروں نے سرمایہ دار کو افسانوی خصوصیات کا شاہکار' سونے کے محلات کا بانی' شداد

باغوں کا رکھوالا' جنگجو جرنیل' اعلیٰ سیاست کار اور پتہ نہیں کیا کچھ ثابت کیا۔ مگر یہ سرمایہ دار درحقیقت جوئے خانوں کا مالک' جنسی وبا کا پھیلانے والا' عیاش وبادہ گسار اور ابلیسی سیاہ کاریون کا متوالا وشیدا تھا۔

اس صنعتی سرمایہ داری نے ماقبل کی تجارتی سرمایہ داری کو نگل لیا کیونکہ صنعتی سرمایہ داری کے لئے بے پناہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے دو طریقے اختیار کئے گئے۔ اولاً" یہ کہ جنس کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بناؤ اور دوم قیمت کو کم سے کم رکھو۔ ان دو طریقوں کی یکجائی سے پیداوار میں کثرت حاصل ہوئی۔ کارخانے زیادہ ہوئے۔ نئی نئی کمپنیاں وجود میں آئیں جنہوں نے ایک نئی شخصیت کی جگہ لے لی۔ یہ اقتصادی شخصیت مالی حصص کی صورت میں نمودار ہوئی۔ سرمایہ داری نظام میں طبقہ جدید ابھرا جس نے خلا کو پر کیا۔ سرمایہ دار کو مہندس' صنعتی مدیر' حساب داں' مشیر' محقق' پالیسی ساز' ایجنٹ سب اسی طبقہ متوسط سے دست وبازو کی صورت میں دستیاب ہوگئے۔ ان کا علم وہنر' فن و تجربہ سرمایہ دار کے لئے خیروبرکت کا باعث بن گیا۔

یہ متوسط طبقہ تاجروں' آجروں زمینداروں اور دیہی کسانوں اور صنعتی مزدوروں کے درمیان موجود تھا۔ یہ طبقہ کام نہیں کرتا مگر چالاکی سے مال بناتا ہے اور دونوں طبقوں کو لوٹتا ہے۔ اس کی مثال دیہات کا وہ دکاندار ہے جو خان ہے نہ دہقان مگر وہ ان دونوں سے بڑ حکر مال کما رہا ہے۔ یہ پنی بوژوا ترقی کرکے ڈیپارٹمنٹل سٹور کا مالک بن جاتا ہے۔ متوسط طبقہ بیورو کریٹس اور ٹیکنو کریٹس کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اور زردار ار نادار کے درمیان خالی جگہ کو پر کرتا ہے۔ شیلر کا کہنا ہے کہ تاریخ کی حرکت کا عاملہ عشق ہے۔ مارکسزم رسماً" اعتراف کرتا ہے کہ ماضی مرحوم کے تمام تمدن روحانی تھے اور مارکسزم ہی مستقبل کا نجات دھندہ ہوسکتا ہے۔ یہ ایسے تمدن کو جنم دے گا جس میں مشین اصل ہوگی اور انسان اس کی شاخ اور پھل ہوگا۔ اس عہد میں جنس کی پوجا ہوگی اور قیصروکسریٰ خلیفہ' سلطان کے وارث ہوں گے صدر' رئیس اور رہبرانقلاب کہلائیں گے۔ زندگی خشک اور